

غیر احمد

یہ سیاحوں کی سنگ

ریشی پونیاں اور بدن پہ چم چم کرتی جھالری دھجیاں
تھیں۔

باہری نشست پہ کوچ بان بیٹھا تھا اس کے ایک
ہاتھ میں چابک اور دوسرے میں مریع لگام تھی۔ وہ
لگام تھلے چابک ہارتا فکر مندی سے بار بار لوہر آسمان
کو دیکھتا تھا۔ جہاں صبح کا ستارہ اسے منزل بتا رہا تھا۔

کوچ بان کے پیچھے بکھی کے اونچے دروازے بجتی
سے بند تھے۔ جنگل کے درخت اسے دیکھ رہے تھے مگر
کچھ اندازہ نہ ہوتا تھا کہ کوچ بان کی سواری کون ہے یا
کوئی ہے بھی کہ نہیں۔

بکھی برق رفتاری سے جنگل کے پتوں پہ سڑک پہ
بھاگتی جا رہی تھی۔ کوچ بان پریشانی سے گردن اٹھا کر
وقت وقفے سے صبح کے ستارے کو دیکھتا تھا اور ذرا کی
ذرا پیچھے بند بکھی پہ نظر ڈالتا اس کے ہاتھوں میں

رات کا دوسرا سپردم توڑنے کو تھا، سیاہ آسمان پہ ہر
سوتارے بکھرے تھے۔ پورے چاند کی روشنی درختوں
کے پتوں کو چکا رہی تھی۔ وہ بکھی کے جنگل کے درخت
تھے، اونچے، مضبوط پتاور اور اتنے گھنے کہ چاندنی
گھاس کو نہیں چھو پاتی تھی۔

ان اونچے درختوں کے سائے جنگل کے بیچ بنی
شاہراہ پر لے کر رہے تھے۔ ایسے میں جب جانور بھی
خاموش ہو گئے تھے، ٹھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سنائے
کو توڑ رہی تھی۔

دونوں اطراف سے جنگل کے بیچ گھری چکی چکی
سڑک پر ایک بکھی دوپٹی آ رہی تھی۔

بکھی ساکوان کی تھی۔ اس پہ دو رویہ ایک مہتابی
روشن تھی اور اس میں دو علی گھوڑے بچتے ہوئے
تھے، چلتے چلتے سفید سے گھوڑے۔ ان کے منہ پر

مہکنا ڈول



”رام ناتھ!“ دھعتا ”بند بکھی میں سے نسوانی آواز
گوئچی، ٹھہری ہوئی مطمئن سی مگر تمکنت و بے نیازی
سے بھر پور۔“

کو بیچ بیان کی لگام پہ گرفت پل بھر کو ڈھیلی پڑ گئی، ہنسی کے پئے قدرے ست ہوئے۔

”جی ہاں لکھن“

”بہلی کتنا دور ہے ابھی؟“

”بس چند کوس رہ گئے ہیں مالک، بھگوان نے چاہا تو صبح ہونے سے قبل ہم جوئی میں ہوں گے۔“ کہہ کر اس نے چابک زور سے گھوڑے کو رسید کی۔ پہنچے پھر سے تیز ہو گئے۔

”جلدی کرو رام ناتھ۔“ تراکت اور تھکان بھری خوب صورت آواز پھر سے اس کے کانوں میں پڑی وہ جی ما لکن، کہہ کر رفتار بڑھانے لگا۔ بند بکھی میں خاموشی چھا گئی تھی۔ اب وہ نہیں بولے گی، کو جی پان کو علم تھا۔ یہ چند فقرے بھی پورے سفر میں پہلی بار اس کے لبوں سے نکلے تھے۔

کو سچ بان رام ہاتھ ابھی صبح کے ستارے کو دیکھ کر
سمت کا حساب ہی لگا رہا تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے جنگل سے
چند گھڑ سوار نکل کر سامنے سرنگ پر آگئے ایسے کہ
جنمھی کا راستہ ایک دم سے رک گیا۔ گھوڑے زور سے
ہنسنے لگے، رام ہاتھ نے تیزی سے لگام کھینچ لیا۔
اسے لگام کھینچتا ہی تھی، کیونکہ اب وہ ہو چکا تھا
جس کے باعث وہ رات کے وقت جنگل کے سفر سے
ڈرتا تھا۔ پہلی کا جنگل رات کے اس پہر ہڈیوں کی
آماجگاہ ہوتا تھا، اسے علم تھا۔ اس نے بے اختیار مانتے پہ
آپا پیسہ صاف کیا۔

بکھی رکی کھڑی تھی۔ سامنے چار گھوڑے تھے۔ ان میں سے تین کے سوار، گھوڑوں سے اتر کر بکھی کے قریب آ رہے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں ہندوق تھی، دوسرا برچھیت تھا جبکہ تیسرے کے پاس بڑا سارا چوٹی بلغم تھا۔

چوتھا گھوڑا قدرے پیچھے کھڑا تھا، اس کا سوار گھوڑے کی پشت پہ بیٹھا تھا۔ وہ نیچے نہیں

اُتر اُتھا۔ اس کے منہ پہ سیاہ دھانا بندھا ہوا تھا۔ اس
آنکھیں واضح تھیں مگر چہرہ دھانے کے پیچھے چھپ چکا تھا۔
اس کے پاس ایک بڑا سا نیزہ تھا جو اس نے خود سے کسی
کنوٹیوں کے درمیان رکھا ہوا تھا۔

میںوں سوار بھی کے قریب آئے ان کے چہرے
 بھی نقاب میں ڈھکے ہوئے تھے برہمچیت کے
 دوسرے ہاتھ میں دستی سیہ چھوٹی لکڑی کی
 بجنس کے اوپر دھات کا براسا پایالہ بڑا تھا اس کے اندر
 شعلہ جل رہا تھا۔

برچھیت نے دوستی کو بچ بان کے چہرے کے سامنے
لہرائی ایک دم روشنی سے گھبرا کر کوچ بان نے چروپی پیچ
کیا۔

بندوق پروار آگے بڑھا۔

”نیچے آؤ۔“ اس کی ہندو کو راج بان پہ تنی تھی، وہ خاموشی سے نیچے اتر آیا۔

”کہاں سے آرہے ہو؟“

”اگر ترسے، مہاراج!“ رام ناتھ نے ہاتھ عاجزانہ انداز میں جوڑے۔

”کہا احاطہ ہے؟“

وہاں ہمارے ساتھ ہمارے ساتھ

”دکھو! سرگاہا“

”سہل را حست“ ”معمولاً“

”سہل علیہ السلام اکبر“ ۴۹: ۱۱

یہی سنا ہم ہے؟ بدوں بروار عریا۔

اپنا گھر ہے ہمارا ان پر یوازم ہے۔

ہوں۔ بندوں پر وار کے بھی

ذاتی۔ ساتھ لون ہے؟ رام ناھ

”میری پتی ہے مہاراج!“

۴) امر لڑکیوں کے تھے؟ وہ سوال در سوال ہے

جاری تھا۔

”میری پتی بیمار ہے اسے بڑے ہسپتال دلھائے گیا

"-la"

برچھیت دستی اونچی کے بکھی کو بغور دیکھ رہا تھا

مکدم چونک اٹھا۔ ”نہ بگم، تو راجیوتوں کی ہے۔“

نے شعلے کا رخ رام ناتھ کی جانب کیا۔ ”مہم تھار

گوئی تھو کے ملازم ہو؟

وہ جو سمجھا تھا کہ گلو خلاصی
میں ہی ہے۔

اس کا مطلب ہے یہ گاؤں کے
نے آہستہ سے دونوں سے کہا
مطمئن نہیں تھا۔ تم

نہیں بن رہی تھی۔

یہی تھا کہ سوار اسی طرح

خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔
”مہماراج سے دراصل۔“ او
ہلڑے کو سنوارنے کی سعی کر

آواز ابھری۔
 ”رام ناتھ!“ فضا میں جلتی
 کو بیج بان نے تھک کر مرج

کام ہمیں چلنا تھا۔
 ”جی مانگن!“ مس کی آواز
 لفظ پہ تینوں نے ایک دوسرے

دیکھا پھر ہندوق بردار نے کرد
کیا اس نے اثبات میں سر
جواباً "ہندوق مزید تان لی۔"

”کون لوگ ہیں رام ناتھ
ہمارے کے سپاہی؟“ آواز اب
منظمن اور ٹھہری ہوئی اے فکر

”راہزن ہیں مانگن“ وہ
الے سے بولا پھر ان کی جات
سے مہاراج اہمید جا رہا

”پروے کی بی بی رات کے

اور کیا تھا، برچھیت نے بھی قدر
سزاوارم ہاتھ کے طرف کر لیا۔

پوٹا سوار اسی طرح حاکم

اضطراب تھا اور انداز میں غلت۔
 ”رام ناتھ!“ دفعنا بند بھی میں سے نسوانی آواز
 گونجی، ٹھہری ہوئی مطمئن سی مگر حکمت و بے نیازی
 سے بھرپور۔
 کوچ بان کی لگام پہ گرفت پل بھر کو ڈھیلی پڑ گئی، بکھی
 کے پئے قدرے ست ہوئے۔
 ”جی مالکن؟“
 ”بیلی کتنا دور ہے ابھی؟“

”بس چند کوس رہ گئے ہیں مالک، بھگوان نے چاہا تو
 صبح ہونے سے قبل ہم حویلی میں ہوں گے۔“ کہہ کر
 اس نے چابک زور سے گھوڑے کو رسی کی۔ پئے پھر
 سے تیز ہو گئے۔

”جلدی کرو رام ناتھ۔“ نزاکت اور تھکان بھری
 خوب صورت آواز پھر سے اس کے کانوں میں پڑی
 وہ ”جی مالکن“ کہہ کر رفتار بڑھانے لگا۔ بند بھی میں
 خاموشی چھائی تھی۔ اب وہ نہیں بولے گی، کوچ بان کو
 علم تھا۔ یہ چند فقرے بھی پورے سفر میں پہلی بار اس
 کے لبوں سے نکلے تھے۔

کوچ بان رام ناتھ ابھی صبح کے ستارے کو دیکھ کر
 سمت کا حساب ہی لگا رہا تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے جنگل سے
 چند گھڑ سوار نکل کر سامنے سرخ ر آگئے، ایسے کہ
 بھی کاراستہ ایک دم سے رک گیا۔ گھوڑے زور سے
 جھمنائے، رام ناتھ نے تیزی سے لگام کھینچ لیا۔
 اسے لگام کھینچتا ہی تھی، کیونکہ اب وہ ہو چکا تھا
 جس کے باعث وہ رات کے وقت جنگل کے سفر سے
 ڈرتا تھا۔ پہلی کا جنگل رات کے اس پہر ہزاروں کی
 آماجگاہ ہوتا تھا، اسے علم تھا۔ اس نے بے اختیار ماتھے پہ
 آیا پینہ صاف کیا۔

بکھی کی کھڑی تھی۔ سامنے چار گھوڑے تھے۔ ان
 میں سے تین کے سوار، گھوڑوں سے اتر کر بکھی کے
 قریب آ رہے تھے ایک کے ہاتھ میں بندوق تھی،
 دوسرا برچھیت تھا جبکہ تیسرے کے پاس بڑا سارا چوٹی
 بلم تھا۔

چوتھا گھوڑا قدرے پیچھے کھڑا تھا، اس کا سوار
 گھوڑے کی پشت پہ بیٹھا تھا۔ وہ نیچے نہیں

✽ غنائن و انجسٹ 174 اگست 2010 ✽

اتر تھا۔ اس کے منہ پہ سیاہ ڈھانچا بندھا تھا جس
 آنکھیں واضح تھیں، بانی چوڑا حائل کے پیچھے
 اس کے پاس ایک بڑا سا نیزہ تھا جو اس نے گھولنے کی
 کنوٹیوں کے درمیان رکھا ہوا تھا۔

تینوں سوار بکھی کے قریب آئے، ان کے چہرے
 بھی نقاب میں ڈھکے ہوئے تھے۔ برچھیت کے
 دوسرے ہاتھ میں دستی تھی۔ یہ چوٹی سی گولہ کی
 جس کے اوپر دھات کا براہ راست پالہ جڑا تھا اس کے اندر
 شعلہ جل رہا تھا۔

برچھیت نے دستی کوچ بان کے چہرے کے سامنے
 لہرائی ایک دم روشنی سے گھبرا کر کوچ بان نے چوٹی
 کیا۔

بندوق بردار آگے بڑھا۔
 ”نیچے آؤ۔“ اس کی بندوق کوچ بان پہ تکی تھی، وہ
 خاموشی سے نیچے اتر آیا۔
 ”کہاں سے آ رہے ہو؟“
 ”آخر ترسے، مہاراج!“ رام ناتھ نے ہاتھ عاجزانہ
 انداز میں جوڑے۔

”کہاں جانا ہے؟“
 ”گاؤں جا رہے ہیں مہاراج۔“
 ”کون سے گاؤں؟“
 ”پیلی راجپوتان، مہاراج۔“
 ”پیلی میں کیا کام ہے؟“ بندوق بردار غریبا۔
 ”پناہ گھر ہے مہاراج، یروا ام ہے۔“
 ”ہوں۔“ بندوق بردار نے بکھی سے نگاہ
 ڈالی۔ ”ساتھ کون ہے؟“ رام ناتھ نے تھوک لگایا۔
 ”میری پتی ہے مہاراج!“
 ”آخر ترس کیوں گئے تھے؟“ وہ سوال در سوال کیے
 جا رہا تھا۔

”میری پتی بیمار ہے، اسے بڑے ہسپتال دکھانے گیا
 تھا۔“

برچھیت دستی اونچی کیے بکھی کو بغور دیکھ رہا تھا،
 یکدم چونک اٹھا۔ ”یہ بھی تو راجپوتوں کی ہے، پھر
 اس نے شعلہ کا رخ رام ناتھ کی جانب کیا۔ ”نم خاگر
 رگو ناتھ کے ملازم ہو؟“

بندھا تھا، بس
کے پیچھے گم تھا
نے گھوڑے کی

ان کے چہرے
برہمچیت کے
یسی لکڑی تھی
تھا اس کے اندر

رے کے سامنے
ن نے چہرہ پیچھے

ناپہ تھی وہ

نے ہاتھ عاجزانہ

نگاہ
لوگ لگلا۔

در سوال کیے

مال دکھائے گیا

دیکھ رہا تھا
ی ہے پھر
لیا۔ دہم ٹھاکر

تھا جو سمجھا تھا کہ گلو خلاصی ہو گئی، گزرا کر رہ
تھا۔

تھا۔
کا مطلب ہے یہ گاؤں کا آدمی ہے، بیل بردار
نے آہستہ سے دونوں سے کہا، جیسے مطمئن ہو مگر
چھت مطمئن نہیں تھا۔ تم اپنی بیوی کو ٹھاکروں کی
بھی میں کیوں لے کر جا رہے ہو؟

تھا۔
مہاراج۔ دراصل۔ رام ہاتھ سے بات
نیں بن رہی تھی۔

تھا۔
تھا۔ سیدھی طرح بتاؤ، ساتھ کون ہے۔ تمہاری
بیوی یا ٹھاکروں کا کوئی فرنگی مہمان؟

تھا۔
تھا۔ گھر سوار اسی طرح نیزہ رکھے سارا ماجرا
ناموٹی سے دیکھ رہا تھا۔

تھا۔
مہاراج۔ دراصل۔ اور اس سے پہلے کہ وہ
بڑے کو سنوارنے کی سعی کرتا، کبھی کے اندر سے
آواز ابھری۔

تھا۔
رام ہاتھ! فضا میں جلتی لگ سے بچا گئے ہوں۔

تھا۔
کو بچ جانے تک کر سر جھکا دیا۔ اب جھوٹ سے
کلم نہیں چلنا تھا۔

تھا۔
تھا۔ اس کی آواز پست تھی۔ ماکن کے
لفظ یہ تینوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز انداز میں
دیکھا پھر بندوق بردار نے گردن موڑ کر گھر سوار کو اشارہ
کیا، اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ بندوق بردار نے
ذرا بابا بندوق مزید تکی۔

تھا۔
تھا۔ کون لوگ ہیں رام ہاتھ؟ راہ گیر ہیں، یا کپنی
ہلار کے سپاہی؟ آواز اب بھی بے نیازی تھی
مطمئن اور ٹھہری ہوئی بے فکر سی۔

تھا۔
تھا۔ راہزن ہیں ماکن۔ وہ کبھی کے قریب ہو کر
بولے سے بولا پھر ان کی جانب مڑا۔ پروے کی بی بی
ہے مہاراج! ہمیں جانے دیجئے ہمارا بیلی پنچنا بہت
ضروری ہے۔

تھا۔
تھا۔ پروے کی بی بی رات کے اس پہر تمہارے ساتھ
کیوں ہے گاڑی بان؟ بندوق بردار کے لہجے میں طنز
در آیا تھا، برہمچیت نے بھی قدرے چوکنہ ہو کر برہمی کا
لہجہ رام ہاتھ کے طرف کر لیا۔

تھا۔
چو تھا سوار اسی طرح خاموشی سے گھوڑے کی لگام

تھا اس کی پیٹھ پر بیٹھا تھا۔
”مہاراج، ہمارا بیلی پنچنا۔“

تھا۔
”یہ کیا پوچھ رہے ہیں رام ہاتھ؟“ بندروازے
کے پیچھے سے پھر سے آواز ابھری، جیسے دیرانے میں
کی قدم مندر کی ساری گھنٹیاں بج اٹھی ہوں۔

تھا۔
”یہ پوچھتے ہیں کہ۔۔۔“ رام ہاتھ کبھی کے قریب
آیا۔ ”کہ اندر فرنگی تو نہیں ہیں۔ آپ اطمینان رکھیں
ماکن، یہ بیلی راہزنوں کے ڈاکو ہیں۔ صرف فرنگیوں کو
لوٹتے ہیں۔ میں ان سے نمٹ لوں گا۔“ ڈھکے چھپے
الفاظ میں نہایت ادب سے اپنی سواری کو خاموش
رہنے کا کہہ کر وہ راہزنوں کی جانب متوجہ ہوا۔

تھا۔
”مالی باپ! اس نے لکھنؤ کے باسیوں کی طرح
عاجزانہ ہاتھ جوڑے۔“ بی بی صاحب کی بولی ہے۔ وہ
جانے کون سا حیلہ بمانہ کھڑنے کو تھا کہ وہ آواز پھر سے
گونجی۔

تھا۔
”رام ہاتھ! آپ کے لہجہ سخت تھا، تحکم اور
رعونت سے بھرپور۔“ نہیں بتاؤ کہ تمہاری سواری
فرنگی ہی ہے۔“

تھا۔
اس سے پہلے کہ کو بچ بان جو اپنے قدموں پر
کھٹاڑی مارنے والے الفاظ پر بھونچکا رہ گیا تھا وہ تینوں
راہزن جن کے لیے یہ بہادری غیر متوقع تھی، سنبھلتے
کبھی کا دروازہ اندر سے کھلا سب کی نگاہیں ادھر کو
اٹھیں۔

تھا۔
دروازہ کھلتا چلا گیا، اس کے پیچھے کم خواب کا بھاری
پردہ پڑا تھا، ایک سپید ہاتھ باہر نکلا اور پردہ ہٹا دیا۔
برہمچیت کی دستی کا شعلہ ہوا سے دھوانسا جا رہا تھا مگر
مدھم روشنی میں بھی اندر کا منظر قدرے واضح تھا۔

تھا۔
وہ اندر نشست پر بیٹھی تھی یوں کہ رخ سامنے کو تھا
اس نے سفید میکسی زیب تن کر رکھی تھی۔ جو پاؤں
تک آتی تھی پاؤں میں نازک سی کولہا پوری جوتی تھی
جس کے اوپر شہرے بکھراج بڑے تھے۔ میکسی کی
چوڑی دار تک آستینیں کلا یوں تک آتی تھیں اس
کے سپید ہاتھ گود میں دھرے تھے اور ان میں
ہیرے کی انگوٹھیاں تھیں۔ ہاتھوں کے نیچے ایک پردہ سا
سفید ہیٹ رکھا تھا۔

لباس کا گھاٹ کھلا تھا گردن راج ہنس کی سی لمبی تھی جس سے ہیروں کا ایک بازو بار چکا ہوا تھا۔ راہزنیوں کی نگاہیں بے اختیار اس کے پاؤں سے ہوتی ہوئی چہرے پہ اٹھتی جاتی تھیں۔

اٹھتی ہوئی ٹھوڑی مسغور سی ناک، موم کی سی گوری جلد، بھرے بھرے ہونٹ جن پہ سرخی لگی تھی، سنہری مائل بھورے پال اس نے اکٹھے کر کے بائیں کندھے پہ ڈال رکھے تھے جو ان کی نگاہ سے پوشیدہ تھا کہ ان کے سامنے اس کا وہنا رخ تھا اور بڑی بڑی سنہری آنکھیں جن کے گرد بہت گہرے کاجل کا حاشیہ تھا، آنکھوں کا رنگ بہت چمکیلا سنہری اور کاجل اتنا گہرا تھا جیسے سیاہیانی میں سورج جھللا رہا ہو۔ رعب حسن تھا یا ممکنات جمال کہ اس کے یہ ان تینوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ شاید ایک لمحے کو ان کو حقیقت پہ خواب کا گمان ہوا تھا جیسے آسمانوں سے اتر کر کوئی ایسا راجا کے سامنے آئی ہو۔

”رام ہاتھ! ان سے پوچھو کہ رات کے اس پہر مسافروں کو اذیت دینے سے کیا حاصل؟“ ہلکے سے گردن ان کی جانب موڑے وہ نگوشت سے بولی۔

”گناہی بان اپنی میم صاحب کو کہو اپنا زیور اتار کر ہمارے حوالے کر دیں۔“ بندوق بردار سنبھل چکا تھا۔

”رام ہاتھ بے چارگی و بے بسی سے بھی کھلے دروازے کو دیکھا۔

وہ اس اعتماد اور تحقیر سے ان کو دیکھ رہی تھی۔

بندوق بردار کو بات دہرائی پڑی۔

”میم صاحب اپنا زیور اتار کر ہمارے حوالے کر دیں۔“

”تم مجھے مجبور نہیں کر سکتے۔“ اس کے اعتماد میں رتی برابر فرق نہیں پڑا تھا۔ ”نہ ہی میں بھیک دینے کی قابل ہوں۔“

”تم بھکاری نہیں ہیں۔“ برہمچیت غرایا۔

”بھکاری اور ڈاکو میں زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ رہی زیور کی بات تو وہ میں تمہارے حوالے نہیں کروں گی۔“

”مداہ! آپ کا کعبہ ہمیں مجبور کر رہا ہے کہ ہم آپ

کے ساتھ زبردستی کریں۔“ اس کی سنہری آنکھوں میں ناکامی اور آگے بڑھنے کی صورت پیشانی پہ شکن ابھری۔

”مگر ملکہ عالیہ سے باغی ہوئے اہل ہند انگریزوں کی عورتوں کا احترام بھول گئے ہیں تو رام ہاتھ! انہیں بتاؤ کہ یہ یہاں محکوم ہیں اور ہم حاکم۔“

”نہ ہم محکوم ہیں اور نہ ہی آپ حاکم۔ آپ صاحب

چور اور عہد شکن ہیں، آپ نے ہمارے ہندو خیم کو لوٹا ہے، ہمارا مال، ہماری عزتیں، ہمارا تخت و تاج لوٹا ہے۔ ہم صرف آپ سے اپنی دولت واپس لے رہے ہیں، عزت اور سلطنت کا حساب پھر کبھی میں نے زیور اتار کر ہمارے حوالے کر دیں میم صاحب۔“

اس نے بندوق پھر اوچی کی۔ منہ پہ بندھے ڈھالے سے ٹھنڈی اس کی آنکھیں واضح تھیں۔ چھوٹی چھوٹی اہل فرنگ کے لیے نفرت سے لبرز آنکھیں۔

چوتھا گھڑ سوار خاموشی سے سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔

”میں تم سے کہہ چکی ہوں کہ مجھے بھیک دینے کی عادت ہے نہ لوٹے جانا پسند ہے۔“ قنادا! وہ گردن سے چپکے ہار پہ انگلی پھیرنے لگی۔ ”غراموش کرو کہ تم مجھ سے میرا زیور اتروانا تو کیا اس کبھی کے چند قدم قریب بھی پٹیک سکتے ہو۔“ اب اس کے بچے میں تعارت در آئی تھی۔

”ہم یہ دونوں کام کر سکتے ہیں گولی بھی چلا سکتے ہیں۔“

”فضول۔“ اس دیوبی جیسا حسن و تمکنت رکھنے والی لڑکی نے مسخرانہ سر جھٹکا۔ ”خوش فہمیاں انسان کو بہت ذلیل کرواتی ہیں۔“ کہتے کہتے اس نے یوں ہی ایک ہاتھ سے پال سمیٹ کر دائیں کندھے پہ ڈال دیے جو ان کے سامنے تھا۔

اس عمل کے دوران جب وہ بھورے سنہری بالوں کو ہاتھ سے سمیٹے دوسرے شانے پہ لار ہی تھی دسکی کا شعلہ اور چاند کی روشنی باہم ہو کر خاص زاویے سے اس پہ پڑی کہ ایک لمحے کو اس کے بالوں میں کچھ زور کا چمکا اٹھا کہ چمک سے دور گھوڑے پہ بیٹھے سوار کی آنکھیں چند ہیا گئیں اور بے اختیار اس نے روشنی

کے بچے کو سر جھٹکے کیا۔ اس نے دیکھا، اس کے لیے سنہری ہار کی لڑکی، موتیوں کی لڑکی جیسے ایک موتی جڑے ہرے تک سفید موتی پر دھارے ہوئے ہرے تک کرتے تھے مگر موتیوں کی لڑکی بال کر تک کے وسط میں ختم ہو جاتی تھی۔

”ہم خوش فہم نہیں ہیں میم صاحب! ہمیں مجبور کر رہی ہیں کہ آپ کے ساتھ جائیں۔“

”بندوق بردار جیسے ضبط کھو کر آجائے۔“ گھبرا کر سامنے آتا جاباگر بندوق کے قدم روک دے۔

اور اس سے پہلے کہ وہ راہزنی کبھی کے جنگل سے وہ بھاری آواز سنی۔

”ہمارا!“ سب نے یہاں تک کہ رام

میں بیٹھی لڑکی نے بھی چونک کر راہزنیوں میں دیکھا جہاں وہ گھڑ سوار اپنے ساتھ تھیں۔

”کیا؟“ بندوق بردار جس کا نام غالباً

سے پلٹا۔

”میں نہیں جانے دو۔“

نادر کو جھٹکا لگا۔ ”تم کہ۔“

”میں نے کہا! انہیں جانے دو۔“

رمی ہوئی تھی مگر جنگل کے سناٹے

کے اس میں دباؤ یا غصہ بھی تھا۔

”کیسے جانے دوں؟ زیور دیکھا ہے

تمہارا کردار دیا یا چند لمحے خاموشی چھا گئی

بندھم بولا۔

”اسے جانے دو تاؤر! یہ بلی رلی پوتا

اسے جانے دو۔“

پھر وہ رکائیں گھوڑے کی لگام

بڑھ لگائی۔ سفید گھوڑا اپنے سوار کو

دڑا ہوا جنگل کے پھور خوشی میں گم ہو

ان تینوں نے ایک لمحے کے لیے ایک

دکرن

ماہنامہ

اگست 2010 کا شمارہ کی ایک جھلک

- ﴿ ”بیاد نمود خاور“ ،
- ﴿ اداکار ”رؤف لالہ“ سے شاہین رشید کی ملاقات ،
- ﴿ آریبے ”ایاز احمد“ دو کے پھاڑے کے ساتھ ،
- ﴿ اگست کے حوالے سے مشہور شخصیات سے سروے ،
- ﴿ ”بول کے لب آزاد ہیں تیرے“ قارئین کے لیے دلچسپ سلسلہ ،
- ﴿ ”خواب ، خواہش اور زندگی“ رابعہ رزاق کا سلسلے وار ناول کی آخری قسط ،
- ﴿ ”دست کوڑہ گر“ فوزیہ یاسین کا نیا دلچسپ سلسلے وار ناول ،
- ﴿ ”حساب دل رہنے دو“ نیلہ عزیز کا دلچسپ مکمل ناول ،
- ﴿ ”قرۃ العین“ ام مریم کا مکمل ناول ،
- ﴿ ”صبح کا سورج“ نایاب جیلانی کا مکمل ناول ،
- ﴿ ”حساب دل رہنے دو“ نیلہ عزیز کا طویل مکمل ناول ،
- ﴿ ”کیسی لاگی یادی“ سائرہ عارف کا ناول ڈائری سے متاثرہ ناول ،
- ﴿ ”گوہر عافیت“ شگفتہ بھٹی کا دلچسپ ناول ،
- ﴿ ”رضیہ مہدی“ سعدیہ غزل ، لبنی طاہر ، نیر نسیم خان اور افسانے اور مستقل دلچسپ سلسلے ،

اس شمارے کے ساتھ کرن کتاب

کرن کتاب ”مکرت ہسکول“

کرن کے ہر شمارے کے ساتھ بطور تحفہ پیش خدمت ہے ، استعارہ بکچر۔

ہے بچے کو سر پہچھے کیا۔
بس ایک لمحے کا عمل تھا کہ روشنی غائب ہو گئی اور
پھر اس نے دیکھا اس کے لیے سنہری بالوں میں ایک
لڑی تھی ، موتیوں کی لڑی جیسے ایک موتی سی لٹ میں
جڑے ہوئے تھے۔ تک سفید موتی پرو دیے ہوں اس کے
دل کر تک گرتے تھے مگر موتیوں کی لڑی کا اندھے اور
لہنی کے وسط میں ختم ہو جاتی تھی۔

”ہم خوش فہم نہیں ہیں میم صاحب! مگر آپ
ہیں مجبور کر رہی ہیں کہ آپ کے ساتھ زبردستی کی
جائے“ بندوق بردار جیسے ضبط کھو کر آگے بڑھا رام
ہاتھ نے گھبرا کر سامنے آتا چاہا مگر بندوق کی نال نے اس
کے قدم روک دیے
اور اس سے پہلے کہ وہ راہزن بھی تک پہنچے پہیلی
کے جنگل نے وہ بھاری آواز سنی۔

”ناور!“ سب نے یہاں تک کہ رام ہاتھ اور ہاتھ
میں بیٹھی لڑکی نے بھی چونک کر راہزنوں کے عقب
میں دیکھا جہاں وہ گھر سوار اپنے ساتھیوں سے مخاطب
تھا۔

”کیا؟“ بندوق بردار جس کا نام غالباً ”ناور“ تھا حیرت
سے پلٹا۔

”میں نہیں جانے دو“
ناور کو جھٹکا لگا۔ ”مگر“

”میں نے کہا نام نہیں جانے دو۔“ اس کی آواز اب
رہی ہو گئی تھی مگر جنگل کے سناٹے نے محسوس کیا تھا
کہ اس میں دبا دیا غصہ بھی تھا۔

”کیسے جانے دوں؟ زیور دیکھا ہے تم نے؟“ ناور
تملکا کر رہ رہا تھا۔ چند لمحے خاموشی چھا گئی پھر گھر سوار اور
بھی مدھم بولا۔

”اسے جانے دو ناور! یہ پہیلی راجپوتوں کی ملکہ ہے
اسے جانے دو۔“

پھر وہ رکائیں گھوڑے کی لگام کھینچی اور اس کو
ایڑھ لگا دی۔ سفید گھوڑا اپنے سوار کو پیٹھ پہ لاوے
لاؤ تا ہوا جنگل کے بیچ درختوں میں گم ہو گیا۔
ان تینوں نے ایک لمحے کے لیے ایک دوسرے کو دیکھا

میں نے کہا کہ اب کڑی چٹاؤ میں مجھے
میں نے کہا کہ اب کڑی چٹاؤ میں مجھے

ی میل سی پلو سے اٹھانے بے زار سی کھڑی تھی آرز
کا اشارہ ارد گرد حویلی کے پھانک کے ساتھ کھڑے

ہجوم کی طرف تھا۔
 ”ہوائی لینڈی“ آپ کی اردو دکتی صاف ہے۔
 ”مجھے فارسی کی شہ بدھ لکھے مسٹر کارلس! مگر یہ جمع
 کیوں ادھر لگا ہے؟“

”کل راجپوتوں کی حویلی میں حادثہ ہو گیا تھا۔“
 ”حادثہ؟ کیسا حادثہ؟“ وہ چونکی
 ”آگ لگ گئی تھی مہمان خانے میں۔“
 ”کوئی نقصان تو نہیں ہوا ڈی سی صاحب۔“
 ”اور تو نہیں بس تھاکروں کالز کا موقع یہ ہی جل کے
 مر گیا۔“

”کون؟ تھاکر گونا تھاکر کا بیٹا گویا؟“
 ”نہیں وہ دوسرا لڑکا جو رگونا تھاکر کا بھتیجا تھا۔“
 ”شیکھر۔“ وہ بے اختیار ایک قدم پیچھے
 ہٹی۔ اس کی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔
 شیکھر۔ شیکھر مر گیا؟

”جی وہی تھاکر شیکھر راج۔“ وہ مزید کچھ سنے
 بغیر تیزی سے پھانک پار کر کے اندر چلی گئی۔ جان
 کارلس گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

”یہ عورت کون ہے؟“ آپ کے اس نے بالآخر
 سب اسپیکر کو زحمت دی جو مسلسل کچھ کہنے کے لیے
 لب کھول اور بند کر رہا تھا کارلس کے سوال پر گہری
 سانس خارج کر کے بولا۔ ”میں آپ کو یہ ہی بتانے والا
 تھا مایا راج۔“ یہ لینڈی شیکھر ہے، تھاکر شیکھر
 راج کی بیوی۔“

کارلس چونکا۔ ”یہ مایا فرینڈس ہے؟“
 سب اسپیکر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”جی مایا راج؟“
 کارلس پھر سے گردن موڑے اسے دیکھنے لگا جو تیزی
 سے دوڑتی حویلی کے اندر جا رہی تھی۔ اس کا ہیٹ
 راستے میں مٹی پہ گر گیا تھا۔



یہ 1939ء کی ایک تاریک رات تھی۔ ہند
 ٹیم اس وقت تاج برطانیہ کے تحت تھا۔ وہ تاج
 برطانیہ جس پہ سورج غروب نہیں ہوتا تھا، مگر

ہندوستان پہ تاریکی ہر رات اپنے پر پھیلاتی تھی۔ یہ
 ہی چاندنی میں ڈوبا اندھیرا ”بیلی راجپوتوں“ پہ بھی اترا
 آتا تھا۔

بیلی راجپوتوں، ہندوستان کا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا،
 انگریز سرکار نے کئی برس ہوئے اس کا نام بدل کر کچھ
 اور کر دیا تھا۔ مگر گاؤں والے آج بھی اس کے
 برسوں پر اسے نام سے ہی پکارتے تھے۔ جس میں یہاں
 کے سرگرمہ خاندان کی عظمت کا ذکر تھا۔ ہندو راجپوتوں
 کے خاندان کا جو کئی برس سے اس گاؤں کے بے تاج
 بادشاہ تھے۔ بعض لوگ کہتے تھے کہ بیلی راجپوتوں
 دراصل اس ریاست کا حصہ تھا جو کسی زمانے میں اس
 راجپوت خاندان کی ملکیت تھی اور وہ یہاں کے
 حقیقتاً ”بادشاہ“ تھے، پھر بعد میں ریاستیں ٹوٹ گئیں تو یہ
 محض ایک گاؤں رہ گیا، مگر راجپوت آج بھی یہاں کے
 مہاراجے تھے اور ان کی عورتیں خود کو مہارانیوں کہلاتی
 پسند کرتی تھیں۔

گاؤں کی آبادی میں ہندوؤں کا تناسب مسلمانوں
 سے چند شرح فیصد زیادہ تھا، اور سوائے ایک مسلم
 خاندان کے (جس کی مضبوط حیثیت کی وجہ دولت کی
 کثرت اور ملکی سیاست میں اثر و رسوخ کے سوا کوئی نہ
 تھی)۔ ہندو راجپوت پورے گاؤں پہ چھائے ہوئے
 تھے۔ گاؤں کے وسط میں راجپوتوں کی عظیم الشان
 حویلی تھی، جس کے میناروں کے گنگرے دور سے
 دکھائی دیتے تھے، مگر ہماری اس برسوں پرانی داستان کا
 مرکز راجپوتوں کی حویلی نہیں جو اس وقت سوگ میں
 ڈوبی تھی۔ بلکہ اس سے کہیں دور وہ کچا راستہ ہے جو
 راجپوتوں کی زمینوں سے ہو کر مسلمانوں کے پرانے
 قبرستان کی جانب جاتا تھا۔

رات دوسرے پہر میں داخل ہو رہی تھی، گاؤں
 کے مکین جانے کب سے اپنے اپنے گھروں میں دبکے
 سو رہے تھے۔ سرادم توڑ رہا تھا، بھاری آندھی۔ فضا
 میں خنکی ابھی تک موجود تھی۔ اونچے بوڑھے درخت
 خاموشی سے شاخوں کا بوجھ لے سو رہے تھے، کبھی کبھی
 ہوا کا کوئی جھونکا تیزی سے چلتے ہوئے پتوں کو جھنجھوڑ

دیتا اور ان کی سناہٹ سے اندھیرے میں ڈوبا گاؤں
بڑبڑا سا جاتا، مگر پھر چند لمحوں بعد وہی پرسکون خاموشی
چھا جاتی اور آسمان پہ بکھرے تارے اس کے گواہ بن
جاتے۔ ایسے میں جب پورا ایلی راجپوتوں سو رہا تھا
مسلمانوں کے پرانے قبرستان میں کوئی جاگ رہا تھا۔
یہ قبرستان آبادی سے ہٹ کر گاؤں کے آخری
سرے پہ واقع تھا۔ یہ ایک دفعہ مکمل طور پہ آیا ہونے
کے بعد گئی برس ہوئے اب تو کھنڈر بھی بن چکا تھا۔
اب اس قبرستان میں کوئی مردے نہیں دفناتا تھا، بلکہ
اس کی جگہ ایک نئے قبرستان نے لے لی تھی جو گاؤں
کے دوسری طرف تھا۔

پرانے قبرستان کی چار دیواری کچی اور چھوٹی تھی۔
واغٹے کے لیے نصب لکڑی کا خستہ حال، قدم بھاٹک
رات کے اس پہر کھلا رہا تھا۔

چار دیواری کے ایک کونے میں برگد کا گھنا بوڑھا
درخت جھکا جھکا سا کھڑا تھا۔ اس کی چھایا تلے کوئی سایہ
سا نظر آ رہا تھا۔

اس کی درخت کی جانب کمر تھی، اندھیرے میں وہ
کوئی ہولنا سا دکھتا تھا۔ جس نے پاؤں تک آتایا چغہ
پن رکھا تھا، سر پہ چغے کے ساتھ نیچھی ٹوپی
(hood) ایسے لے رکھی تھی کہ چہرہ واضح نہ تھا۔
وہ سایہ رکوع کے بل جھکا، مسلسل ایک ہی جگہ پہ ہاتھ
میں پکڑی کدال مار رہا تھا۔ وہاں دو قبروں کے درمیان
ایک گڑھا سا کھد گیا تھا اور چغہ پوش کی کدال اس
گڑھے کو مزید گہرا کر رہی تھی۔

دفعتا "گھوڑے کے بھاگتے ٹاپوں کی آواز نے بلی
راجپوتوں کی خاموش فضا کو لرزادیا۔ چغہ پوش نے
چونک کر سر سیدھی کی۔ آواز دور کھیتوں سے آرہی
تھی۔ اس نے جلدی سے کدال اپنے لبائے میں
چھپائی اور بھاگ کر درخت کے تنے کی بل لے لی۔ دوڑتے
قدموں کی آواز قریب آتی جا رہی تھی، چغہ پوش نے
سر اٹھا کر چھوٹی سی چار دیواری کے پار جھانکا۔ اسی لمحے
دور کھیتوں سے دو گھوڑے برق رفتاری سے بھاگتے
ہوئے آئے اور دیوار کے قریب سے گزر کر آگے بڑھ

گئے۔ شاید کوئی مسافر تھے۔

چغہ پوش نے آہستہ سے کمرے ہو کر زمین پر گرتے
کدال اٹھائی اور واپس آکر گڑھے کے کنارے پہنچے
مٹی کے ڈھیر کو اندر ڈالنا شروع کیا۔ کچھ ہی دیر میں اس
نے زمین برابر کر دی، پھر کدال کو اسی طرح لبائے میں
چھپائے ڈھیرے ڈھیرے چلتے اس نے باہر کی راہ لے لی۔
پھاٹک پار کر کے اس نے آہستہ سے اسے بند کیا
چغے کی ہڈ درست کی اور اوپر اوپر جھٹکا طریقے سے
دیکھتے اپنے قدم اس کے ڈھول مٹی میں گم ہوتے
راستے کی جانب بڑھا دیے۔

چند لمحے بعد اس کا سیاہ وجود بلی راجپوتوں کے
اندھیرے میں غائب ہو گیا۔



وہ اس قد آور آئینے کے سامنے کھڑی بے ناظر
نگاہوں سے اپنا عکس دیکھ رہی تھی۔

دراز قد، شانوں پہ گرتے سنہری پال، ان کے چغے
پھسلتی موتیوں کی لڑی اور آنکھوں میں گہرا کاجل، آج
اس نے کوئی زیور نہیں پہن رکھا تھا۔ بس سیاہ سی
سفید ساڑھی میں ملبوس تھی جس کا پلو فرش کو چھو رہا
تھا۔

وہ آئینے سے ایک طرف ہٹ گئی۔ سامنے والی
دیوار پہ ایک بڑی سی تصویر آویزاں تھی۔

وہ ساٹھ ستر کے سن کا بوڑھا، مگر بارعب چہرہ تھا۔
بڑی بڑی مونچھیں، تمکنت سے چمکتی آنکھیں، قسم و
فراست سے لبریز نگاہیں، پگڑی میں موتیوں کی لڑیاں
تھیں، ماتھے سے عین اوپر پگڑی میں چھوٹا سا مورچہ
تھا، جس کے ساتھ ایک بڑا سا ہیرا جڑا تھا، اس ہیرے
سے پھوٹی شعائیں اس چہرے کے رعب دلب میں
اضافہ کر رہی تھیں، نیچے ایک کونے میں لکھا تھا۔

"شبیبہ حقیقی مہاراجہ بلدیو سنگھ۔"

وہ اب دو سری دیوار پہ موجود بڑے سے رتھ میں
پورٹریٹ کے سامنے آگئی، جو ایک سیاہ سفید تصویر کو
سامنے رکھ کر کسی ماہر مصور نے بنایا تھا۔ یہ تصویر اس

اندھیرے میں اس
تھار کے ہاتھ
سرخ رنگ کی کچی
ہڈیاں اور ہاتھ
اس کے پہلو
bow
سرخ راجپوتوں
سرخ صورت
لی کی ہے
سرخ ساڑھی
ہڈی کے بعد
رنگ کی شام
اس نے
ہڈی پہ ایک
وہی میں
رنگ کی تقر
لی ہڈی قلعہ
نہ ممان
کے وسط میں
نہ
شیکھو
کدے کے
اور رہی تھی
بے لگے
جس کے
تھی۔
دفعتا
نظر
سے پور
دواؤں سے
نظر
کی قدر

کی اور شیکھو کی شادی پہ تین ماہ قبل لی گئی تھی۔
تصویر میں اس نے سرخ ساڑھی پہن رکھی تھی۔
تکھار کے نام پہ آنکھوں میں گہرا کاجل تھا یا لبوں پہ
سرخ رنگ کی لپ اسٹک، دائیں کلائی میں سونے کی
چوڑیاں اور بائیں میں ہیرے کے دو جڑاؤ لٹکے تھے۔
اس کے پہلو میں سیاہ تھری پیس، سفید شرٹ اور
سرخ bow میں لمبوس مینٹنس سالہ شیکھو
مسکرا رہا تھا۔ وہ سائلی رنگت اور معمولی نقوش کا حامل
قبیل صورت شخص تھا۔

اس کی بے تاثر نگاہیں شیکھو سے ہٹ کر اپنی
سرخ ساڑھی پہ پھیلتی چلی گئیں۔ یہ ساڑھی اس نے
شادی کے بعد پھر کب پہنی تھی؟ ہاں ڈھائی ماہ قبل اپنی
سالگرہ کی شام میں۔
اس نے اپنی سنہری آنکھیں موند لیں، ذہن کے
پروں پہ ایک فلم سی چلنے لگی تھی۔

دہلی میں موجود شیکھو کی اس عالی شان کو بھی پہ
سالگرہ کی تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا۔ بڑے سے لان
میں برقی قمقموں اور روشنیوں سے چراغاں کیا گیا
تھا۔ مہمان گھاس پہ بچھی کر سیوں سے اٹھ کر لان
کے وسط میں رکھی گئی گول میز کے ارد گرد جمع ہو چکے
تھے۔

شیکھو ان کے ہمراہ تھا۔ اس کی منتظر نگاہیں بار بار
برآمدے کے اس پار گھر کے داخلی دروازے کی سمت
اٹھ رہی تھیں۔ کچھ مہمان کلاسیوں پہ بندھی گھڑیاں
دیکھنے لگے تھے۔ ان سب کو شیکھو کی بیوی کا انتظار
تھا۔ جس کے اعزاز میں روساء و امراء کی یہ محفل سجائی
گئی تھی۔

دفعۃً برآمدے کا دروازہ کھلا، سرخ ساڑھی کی
تھلک نظر آئی۔ تمام مہمانوں کی نگاہیں اس طرف
اٹھیں، پورے لان میں سناٹا چھا گیا۔

دروازے کا پٹ دھکیلتی سرخ ساڑھی میں لمبوس
دراز قد سیدھے اور شہرے بالوں والی لڑکی باہر آئی۔ وہ
رائی کی قدیم مندر میں پوجا کرنے والی حسن کی دیوی
تھی۔

وہ بہت نزاکت و حکمت سے چلتی ہوئی برآمدے
کے ستون تک آئی۔ شیکھو مسکرا کر آگے بڑھا۔
برآمدے کے آگے تین چھوٹے سے زینے تھے،
اوپر وہ ان کے آغاز پہ کھڑی تھی۔ شیکھو نے مسکرا کر
اپنا ہاتھ آگے بڑھایا، اس نے جوانی مسکراہٹ کے
ساتھ بڑھا ہوا ہاتھ تھا اور اسی نزاکت سے ایک ایک
قدم نیچے رکھتی زینہ اتر کر لان کی گھاس پہ آگئی۔ سرخ
ساڑھی کا بے حد لمبا پلو اس کے پیچھے زنبور پہ پھسلتا
ہوا گھاس پہ آن گرا۔

شیکھو ایک ہاتھ سے اس کا ہاتھ تھامے بیاں بازو
اس کے شانوں کے گرد جامل کے اسے ساتھ لے کر
چلتا میز تک آیا۔

”مائی وانف، مایا فرینڈس“ ایک کٹنے کے بعد وہ
مایا کا ہاتھ تھامے اپنے کسی قریبی عزیز سے اس کا
تعارف کر رہا تھا اور مایا مسکراتے ہوئے شہت انگیزی
اور پھر مقامی زبان میں رسمی کلمات ادا کر رہی تھی۔

پوری تقریب میں ایک فرد سے دوسرے فرد تک
جاتے بہت سے لوگوں کے درمیان سے گزرتے
ہوئے بھانت بھانت کی سرگوشیاں اس کی سماعتوں سے
نکل رہی تھیں۔

”تو یہ ہے ٹھاکر شیکھو کی انگریز بیوی جس سے
اس نے انگلستان میں شادی کی تھی؟“
”ہاں، سنا ہے اس کا تعلق برطانیہ کے شاہی
خاندان سے ہے کیا واقعی؟“

”ہوگا، تب ہی تو شیکھو نے اس سے شادی کی
ہے۔“

”مگر اردو اور ہندی تو اچھی بول لیتی ہے، بہت
جلدی سیکھ لی۔“

”نہیں، میں نے سنا ہے اس کی نینی ہندوستانی
تھی۔ اسی نے سکھائی ہے اسے۔“

وہ بہت اعتماد سے مسکراتے ہوئے شیکھو کے
پہلو میں مہمانوں سے تعارف حاصل کر رہی تھی مگر
میں زیادہ توجہ دہلی کے امراء و روساء کی تھی، چند
برطانوی بھی الگ سے کھڑے تھے۔

قصے انہوں نے سنے تھے، پہلی راجپوتانہ کی وہ مہارانی
اس سے کہیں بڑھ کر تھی۔

”مگر ڈ مارنگ جھٹل میں۔“ نہایت اچھے سے
گردن اٹھائے وہ ان کے مقابل چھلیں صوفے پر بیٹھ
گئی۔ وہ دیوان خانہ گاؤں کے ماحول کے برعکس فرنگی
طرز سے آراستہ تھا۔

”بیٹھے۔“ ٹانگ پہ ٹانگ رکھے، کہنی صوفے کے
بازو پہ ٹکائے وہ اسی پر نہایت انداز میں بولی تو ویل
صاحب جیسے ہوش میں آکر بیٹھ گئے۔ نایا رکھو ناٹھ
ہلکی بیٹھ چکے تھے ویل صاحب کو ”بیٹھے“ کرنا ان کا
قرض تھا کہ یہ جو ملی ان کی تھی، مگر شیکھر کی اس
مہارانی کی موجودگی میں وہ ہمیشہ ایسے ہی کنفیوژڈ
ہو جاتے تھے۔

”آپ کاغذات لے آئے ویل صاحب؟“ وہ
سیدھا ان کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔
”جی۔ جی لیڈی شیکھر۔ میں۔“
”لیڈی فرنینڈس سنہری بال کندھے سے پیچھے
کرتے اس نے صحیح کی۔“

”جی لیڈی فرنینڈس“ ویل صاحب جلدی سے
بولے، پھر ایک نظر نایا رکھو ناٹھ پہ ڈالی اور دوبارہ مایا کو
دیکھا۔ وہ منتظر نگاہوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ اس
کی سنہری آنکھوں میں اتنی مقناطیسیت اور کشش
تھی کہ ویل صاحب نگاہیں جھکا کر تیزی سے بریف
کیس کھول کر کاغذات نکالنے لگے۔

”شروع کریں؟“ ایک فائل کا مطلوبہ صفحہ کھول کر
انہوں نے ایک سوالیہ نگاہ مایا پہ ڈالی، جس نے اپنے
مخصوص انداز میں سر کو جنبش دی۔ وہ فوراً ”سر
جھکائے دوبارہ اس کی آنکھوں میں دیکھنے کی غلطی
دہرائے بغیر پیشہ ورانہ انداز میں پڑھنے لگے۔“

”یہ وصیت تھا کر شیکھر راج نے اپنی موت سے
چند ہفتے قبل لکھوائی تھی۔ اس کے مطابق انہوں نے
اپنی تمام منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد و امانتوں کا ٹکرا
اور وارث اپنی بیوی مایا لیڈی فرنینڈس کو قرار دیا
ہے۔“

مایا نے آنکھیں کھول دیں۔
وہ ملی کی روشنیوں میں ڈوبی تقریباً غائب ہو گئی۔ وہ
پہلی راجپوتانہ میں راجپوتوں کی حویلی کی بالائی منزل کے
کمرے میں اپنے پورٹ کے سامنے کھڑی تھی۔
اس نے بے اختیار موتیوں کی لڑی پہ انگلی پھیری،
وہاں موتی تصویر کی نسبت کم تھے اور آخر میں گرہ سی
گئی تھی۔ مایا کی انگلی گرہ پہ آکر ٹھم گئی۔ ایک بہم
مسکراہٹ اس کے لبوں پہ بکھر گئی۔
”محق۔ گدھا۔“ اس نے مسکرا کر سر جھکا جیسے
کچھ یاد آگیا ہو۔ اسی پل دروازہ بجایا اس نے ہاتھ سے
لڑی چھوڑ دی۔

”کون؟“
”مایا دیوی ویل صاحب نیچے آپ کا انتظار کر رہے
ہیں، اٹھا کر صاحب نے آپ کو بلا بھیجا ہے۔“
”ہوں۔ ان کو بولوں میں کچھ دیر میں آئی ہوں۔“ بے
تاثیر لہجے میں کہہ کر وہ بالوں میں پھر سے کنکھا پھیرنے
لگی۔ نگاہیں آئینے میں موجود اپنے دلکش چہرے پہ جمی
تھیں۔ بہت سیٹ برف سا چہرہ تھا وہ۔
پھر بہت سے لمحے سرک گئے تو اس نے ساڑھی کا
پلو ہاتھ سے چھوڑا اور باہر نکل آئی۔

سیڑھیوں کے آغاز پہ کھڑے ہو کر اس نے نیچے
جھانکا۔ نیچے ہال کمرے میں لکڑی کے قیمتی صوفوں پہ
سیاہ کوٹ میں ملبوس ویل صاحب اور نایا رکھو ناٹھ بیٹھے
تھے۔

آہٹ تھی یا اس کی موجودگی کا کوئی فسوں، ان
دونوں نے چونک کر سر اٹھا کے اسے دیکھا اور پھر بے
اختیار کھڑے ہو گئے۔

وہ ہاتھ ریٹک پہ رکھے پلکیں جھکائے ایک ایک
زینے پر اترنے لگی۔ سفید ساڑھی کا پلو چند زینے اوپر
سے اس کے پیچھے پھسلتا آ رہا تھا۔ لمبی اڑی کی ٹیک
ٹیک ایک روہم سے خاموش فضا میں گونج رہی تھی
اور ویل صاحب دم ساڑھے اسے سیڑھیوں سے نیچے
اترتے دیکھ رہے تھے۔

اس کے ملکوتی حسن اور سحر انگیز شخصیت کے جتنے

تیار گھونٹتھ کے چہرے پہ ناپسندیدگی بکھر گئی۔
”جبکہ اس جوبلی میں موجود اپنا پچاس فیصد حصہ
بھی انہوں نے لیڈی مایا کے نام کر دیا ہے، باقی پچاس
فیصد حصہ پہلے سے ہی ٹھاکر شیکھو کے مایا ٹھاکر گھو
ٹاتھ کے نام ہے۔“

تیار گھونٹتھ نے اب کے بے چینی سے پہلو بدلا۔
”ہوں، اور کچھ؟“ وہ اسی طرح ٹانگ پہ ٹانگ
چڑھائے بیٹھی عام سے انداز میں پوچھ رہی تھی۔
”جی نہیں۔“ وکیل صاحب نے فائل میز پہ رکھ

دی۔
”ہال کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ مایا کے چہرے پہ بلا
کا اطمینان و سکون تھا، جیسے اس نے تمام فیصلے کر لیے
ہوں۔“

”مجھے شیکھو کی جائیداد نہیں چاہیے۔“ اسی بے
تاثیر لہجے میں چند لمحے بعد وہ بولی تو دونوں اشخاص ہری
طرح چونکے۔

”میں جوبلی میں اپنے نصف حصے کو ٹھاکر گھونٹتھ
کے نام کرنے پہ تیار ہوں، ٹھاکر صاحب آپ کانڈی
کارروائی کر لیں جبکہ باقی جائیداد۔“ وہ سانس لینے کو
رکی، ٹھاکر گھونٹتھ دم سا دھے اس کی بات کی تکمیل
کے منتظر تھے۔ ”باقی جائیداد میں کسی فلاحی ادارے
کے نام کرنا چاہتی ہوں، شیکھو کی بہت خواہش تھی
کہ ہم دونوں مل کر کوئی ٹرسٹ یا خیراتی ادارہ قائم
کریں۔ شیکھو کو تو زندگی نے مہلت نہیں دی۔“
سنہری آنکھوں میں پانی تیرنے لگا۔

”مگر میں اس کی یہ خواہش پوری کرنا چاہتی ہوں۔
ٹھاکر صاحب مجھے امدد ہے کہ آپ یہ جائیداد بولوانے
میں میری مدد کریں گے، شکریہ۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی،
ایک آنسو ٹوٹ کر چہرے پہ پھسلا گیا۔ ”آپ بیٹھے“
میں چلتی ہوں۔“

ساڑھی کاٹو دائیں ہاتھ میں سنبھاتی وہ ان کے
سامنے سے گزر کر سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئی، رینگ
پہ ہاتھ دھرے پہلی سیڑھی پہ قدم رکھتے ایک ٹانھے کو

اس نے مرکز انہیں دیکھا۔

”میں امید کرتی ہوں یہ سب کچھ جلد ہو جائے گا۔
میں اس مینے والپس انگلستان جانا چاہتی ہوں۔ اب اس
ملک میں شیکھو کی یادوں کے ساتھ رہنا میرے لیے
کٹھن ہو گیا ہے۔ امید ہے آپ میری ذہنی حالت
سمجھ سکیں گے۔“

پھر وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھتی گئی۔ ان دونوں کی
نگاہوں نے اس کا اوپر تک تعاقب کیا، یہاں تک کہ وہ
اپنے کمرے کے دروازے کے پیچھے غائب ہو گئی۔

”شیکھو اور فلاحی ادارے۔“ ٹھاکر گھونٹتھ نے
گہرا سانس بھرا۔ ”تھا تو میرا جیسا مگر اس سے یہ توقع
ناممکن سی لگتی ہے۔ وہ عیاش سا شخص تھا۔ پتا
نہیں۔“ انہوں نے دانستہ بات ادھوری چھوڑ دی۔

وکیل صاحب خاموشی سے کانڈتات سمیٹنے لگے،
جیسے ٹھاکر کی بے زاری کی وجہ سمجھ رہے ہوں۔

”بے چاری مایا۔“ فائلیں بریف کیس میں رکھتے
ہوئے انہوں نے ترحم سے سوچا۔ ”تنی خوب

صورت عورت، محبت کی شادی اور محبت بھی ایسی کہ
برطانوی شہزادی نے محل چھوڑ دیے، اس قبول
صورت ٹھاکر شیکھو کے پیچھے اور بیویوں بھری جوبلی
میں بیوی اور دل ایسا خالص کہ اتنی بڑی جائیداد سے
ایک نکال لینے کا لالچ نہیں۔ اتنی آسانی سے سب چھوڑ
دیا، مگر جانے یہ ٹھاکر اس کو اتنی ہی آسانی سے چھوڑیں
گے یا نہیں، بے چاری انگریز لڑکی کہ ہر پھنس گئی ہے
ان راجپوتوں میں۔“

ٹھاکر گھونٹتھ اور وکیل صاحب اپنی اپنی سوچوں
میں گم تھے۔

رات کی کالی چادر میں غبار کی تہ لگی تھی۔ شام
میں ہلکے ہلکے جھکڑ چلے تھے اور پھر ہوا ساکن ہو گئی
تھی۔ مگر معمولی سا گرداب بھی فضا میں مٹا تھا۔

آج مسلمانوں کا کھنڈر ہوا، رانا قبرستان بھی معمول
سے زیادہ گرو آلود تھا۔ برگند کا بوڑھا درخت دکھ سے
سارے میں چھائی ویرانی دیکھ رہا تھا۔ اس کی عمر سیدہ
کنور شاخیں زمین کی جانب بھی جھکی سی تھیں

جہاں موجود ایک سیاہ لہاوے میں ملبوس ذی نفس کی کدال بچی زمین کھود رہی تھی۔

مٹی اڑ کر اوپر آتی، چغہ پوش کالہاس مٹی سے آٹ چکا تھا۔ مگر اس کے ہاتھ تیزی سے کام کر رہے تھے۔ ایک لمحے کو رک کر اس نے کمر سیدھی کی اور چہرے پر آیا پسینہ صاف کیا۔ اس کا تنفس تیز تیز چل رہا تھا، انداز میں تھکان سی تھی۔ برگد کا بوڑھا درخت گواہ تھا کہ اس کا جسم پچھلے کئی گھنٹوں سے یہ مشقت اٹھا رہا تھا۔ اب شاید اسے تھکاوٹ ہونے لگی تھی۔

چند لمحے سستا کر اس نے پھر سے جھک کر کھودنا شروع کر دیا۔ تین چار دفعہ کدال ہی ماری تھی کہ دور کسی کے بولنے کی آواز سنائے کو چہرے نے لگی۔

چغہ پوش نے چونک کر سر اٹھایا، قبرستان کے کھلے پھانک گئے اس پار دو اشخاص باتیں کرتے چلے آ رہے تھے۔ ان کے قدموں تلے پچے راستے کی دھول اٹھ رہی تھی۔ ایک ان میں کرم دین تھا اور دوسرا اس کا چچا زاد حاجی بشیر۔

کرم دین نفی میں سر ہلاتے ہوئے کسی بات پر بحث کر رہا تھا کہ یکایک کھلا پھانک دیکھ کر ٹھنکا۔

”حاجی! اتنی رات گئے پھانک کیوں کھلا ہے۔“ بات حیرت کی تھی، قبرستان کا یہ پھانک عموماً بند ہی ہوتا تھا اور اس پر ایک مولیٰ زنجیر اور کالا جڑھا ہوتا تھا۔ ”معلوم نہیں۔“ حاجی بشیر ہچکچایا۔ ”گاؤں والے کہتے ہیں کہ عرصہ ہوا یہاں سایہ ہو گیا ہے، رات کو اوھر سے آوازیں آتی ہیں۔“ جانے کتنا سچ ہے، کتنا جھوٹ تالا تو عرصہ ہوا ٹوٹ چکا ہے۔

دونوں کھلے پھانک کے سامنے کھڑے تھے۔ ”چل او حاجی! چل کر ایک دفعہ دیکھیں تو اندر ہے کیا؟“

”رہنے دو کرم دین!“ حاجی بشیر بے اختیار ایک قدم پیچھے ہٹا۔

”ڈرتے کیوں ہو؟ گاؤں والے تو پر کا پرندہ بنا ڈالتے ہیں، ایک دفعہ دیکھیے تو سہی کہ ہے کیا۔ آواز تو ابھی مجھے بھی آرہی ہے۔“

کرم دین نے پہل کی اور پھانک پار کیا۔ حاجی بشیر ہچکچاتا ہوا چند قدم پیچھے تھا۔

سامنے چند قبروں کے ایک طرف بڑا سا گڑھا تھا اور ارد گرد مٹی کی ڈھیریاں تھیں۔

”اس گڑھے میں کیا ہو سکتا ہے بھلا؟“ کرم دین سوچتا بڑبڑاتا قریب آیا، رات کی وحشت یا قبرستان کی ہیبت اسے تھوڑا تھوڑا خوف محسوس ہوا، جسم کے رونگٹے کھڑے ہونے لگے۔

وہ دونوں آگے پیچھے چلتے گڑھے کے قریب آئے۔ کرم دین نے آہٹا لکڑی پڑھتے ہوئے اندر جھانکا۔ گڑھا تاریک اور خاموش تھا، بہت گہرا نہیں تھا، اندر ایک سیاہ سی گٹھڑی پڑی تھی، جیسے کپڑے کی گٹھڑی ہو۔

اس سے پہلے کہ کوئی جھٹکا، گٹھڑی آن کی آن میں کھڑی ہو گئی اور دھول کا ایک طوفان ان کی طرف آیا۔ گرد ان کی آنکھوں میں پڑی اور وہ بے اختیار آنکھیں ملتے پیچھے چلاتے پیچھے بٹے۔ چغہ پوش نے انہیں دھکیلا اور جست لگا کر پھانک پار کر گیا۔ کچھ دیر بعد ہر رات کی طرح چھائے اندھیرے نے اسے نگل لیا۔

”مایا دیوی!“ روپا اسے تلاش کرتی زنان خانے کے دالان تک آئی تھی۔ حویلی کے پچھواڑے اونچے ستونوں کا برآمدہ تھا، برآمدے کے آگے تین سیڑھیاں بنی تھیں، وہ سب سے اونچی سیڑھی پہ بیٹھی سامنے فضا میں جانے کیا کھوج رہی تھی، روپا کی آواز پہ آہستہ سے سر اٹھایا۔

وہ بہت اطمینان اور تحمل سے ہر کام کرتی تھی شاید ہی کبھی روپا نے اسے چونکتے دیکھا ہو۔

”مایا دیوی! بڑے ٹھا کر آپ کو ڈرانگ روم میں بلا رہے ہیں، داروغہ صاحب آئے ہیں جی۔“

وہ ایک لفظ کہے بنا اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے راج بھی ساوہ سفید ساڑھی پہن رکھی تھی، بال فرانیسی

طرز کی چوٹی میں مقید تھے، چوٹی کے بلوں میں کہیں کہیں سے موتی جھلک رہے تھے۔ پاؤں میں پکی لوہی ابروی والی نازک سی جوتی تھی، جس پہ سفید نلینے جڑے تھے۔

دیوان خانے میں اس روز جہاں وکیل صاحب بیٹھے تھے، آج اچھر ویدی میں ملبوس تھانے دار تھا، اس کے ہاتھ میں چھری تھی۔ مایا کو دیکھ کر وہ بے اختیار اٹھ کھڑا ہوا۔

تیار گھونتا تھ سائے اسی صوفے پہ بیٹھے تھے، حقے کی نے منہ سے لگا رکھی تھی اور مستقل گڑگڑا رہے تھے۔

سائے کر سیوں پہ تھانے وار کا عملہ بیٹھا تھا، ان کے پاس قلم اور کاغذ تھے غالباً "بیانات قلمبند کرانے کا انتظام کیا گیا تھا۔"

وہ سب کو جیسے نظر انداز کرتی اسی اعتماد اور بے نیازی سے چلتی تھانے وار کے مقابل صوفے پہ بیٹھے تھی۔ ٹانگ پہ ٹانگ یوں چڑھائی کہ جوتی کی نوک اوپر تھی، شاید یہ مقابل کو ہٹانے کا اشارہ تھا کہ وہ اس کی جوتی کی نوک پہ۔

کمرے کے ایک کونے میں ایک عمر رسیدہ دیہاتی بیٹھا خاموشی سے سب کو دیکھ رہا تھا، چہرے مہرے سے وہ تھانے کے عملے کا حصہ ہرگز نہ لگتا تھا، جانے کون تھا۔

"میم صاحب! آپ کو زحمت اس لیے دی کہ جیسا کہ آپ جانتی ہیں۔" تھانے وار بیٹھ گیا تھا۔ "ٹھا کر شیکھر راج کی موت آگ لگنے سے ہوئی ہے۔ پولیس کو کچھ کارروائی مکمل کرنا ہوتی ہے سو آپ لوگوں کے بیانات درکار ہوں گے، کچھ سوال پوچھتے جائیں۔"

"تمہید کو چھوڑ کر سوالات شروع کریں۔" مایا کے لیے کاسر دین محسوس کر کے اس نے سر ہلایا اور ٹھا کر گھونتا تھ کی جانب متوجہ ہوا۔

"مرحوم سے آپ کا کیا رشتہ تھا؟" ٹھا کر گھونتا تھ نے حقے کی نے منہ سے ہٹائی۔ "انتا

تو تم جانتے ہو ان پکڑ شاہ کہ وہ میرا بھتیجا تھا۔" انداز میں ہلکی سی تاکاری تھی۔

"ٹھا کر صاحب! میرے ساتھ تعاون کیجئے۔" وہاڑ لیے بغیر ٹھنڈے انداز میں بولا۔ "مرحوم شیکھر کے سرپرست کی ذمہ داری آپ نے کب سنبھالی تھی۔"

"یہ ہی کوئی پندرہ برس ہوئے جاتے ہیں کہ میرے چھوٹے بھائی کا طویل علالت کے بعد انتقال ہو گیا اس کی پتی پہلے ہی دلغ مفارقت دے چکی تھی شیکھر اس وقت غالباً "پائیس برس کا تھا۔"

"یعنی موت کے وقت ٹھا کر شیکھر راج کی عمر لگ بھگ سیمتیس برس ہوگی۔" ان پکڑ شاہ کا ایک اپنا انداز تھا۔ ٹیکھا سا پے در پے سوالات کرنے کا بات کاٹنے کا، جانے کیوں مایا کو لگا وہ پہلے اس سے مل چکی ہے۔

"درست۔ وہ اس وقت بچہ تو تھا نہیں کہ میں اس کی نگرانی کرتا، کچھ عرصے بعد تعلیم کے لیے انگلستان چلا گیا، پیچھے سے اس کی زمین، جائیداد میں سنبھالتا تھا، اس نے گویا مجھے اپنی زمینوں کا ٹکراں مقرر کر رکھا تھا۔"

"اگر اسے آپ پہ اتنا اعتماد تھا تو اس نے چند سال پیشتر زمین کا ہزارہ کیوں کرایا تھا؟ اور کچھ لوگوں سے یہ بھی کہا تھا کہ شاید اس کے ساتھ بددیانتی ہوئی ہے؟" ٹھا کر گھونتا تھ گڑبڑا سے گئے۔ "نہیں ایسی بات نہیں تھی، پہلے شیکھر اور ہماری زمینیں مشترکہ تھیں، پھر اس نے ہزارہ کرایا۔ اس میں کوئی بڑی بات نہیں ہے۔"

مایا خاموشی سے دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

"شیکھر انگلستان سے کب واپس آیا؟"

"وہ آتا جاتا رہتا تھا، اب آخری دفعہ شادی کر کے آیا تھا۔" ٹھا کر گھونتا تھ نے ذرا کی ذرا نظر مایا پہ ڈالی وہ اسی طرح سپاٹ سا چہرہ لیے بیٹھی تھی۔

"یہاں میں آپ کو کچھ زحمت دوں گا میم صاحب! ان پکڑ شاہ اس کی جانب متوجہ ہوا۔ "شیکھر سے آپ کی شادی کب ہوئی؟"

"جیسا قبل۔"
"انگلستان میں؟"
"میلانے سر کو معصوم۔"
"آپ نے اس۔"
"میں تقریباً سترہ سال۔"
"تیس سال کل۔"
"نہیں تھا ہم کسی۔"
"میرا تعلق برطانیہ۔"
"ہوئے گردن قدر۔"
"سوطا ہری بات۔"
"cheiftain۔"
"تو کرنے سے رہو۔"
"قی اور وہ تھی محبت۔"
"شادی انگلستان۔"
"جی۔"
"آپ شادی۔"
"آمین؟"
"تقریباً دو ماہ۔"
"رہی، پھر ڈیڑھ سال۔"
"شیکھر مجھے پہلے۔"
"آپ کی۔"
"مکرایا۔"
"میری فار۔"
"وہ آنکھوں۔"
"تھی یہ انداز یہ۔"
"ساتھ اگل۔"
"بھی آگیا، مگر۔"
"بر تقسیم۔"
"ہے۔"
"مور ہمار۔"
"بددیانتی کی نظر۔"
"انہی بہت ہو۔"
"کر سکے۔"
"بجایا فرمایا۔"

تھے؟ میرا مطلب ہے خوش گوار یا درمیانے؟
 ”ویسے جیسے ہر خوش و خرم میاں بیوی کے ہوتے
 ہیں۔“
 ”مثلاً کیسے؟“

”جیسے ہفتے بھر میں ایک لڑائی دو چار بار تلخ کلامی۔
 کیوں؟ کیا آپ نے کوئی ایسا جوڑا دیکھا ہے جس کی
 آپس میں لڑائی نہ ہوتی ہو؟“
 ”آخری بار آپ کی تلخ کلامی کس بات پر ہوئی
 تھی؟“

”یہ ہی کوئی پانچ روز پہلے میں نے اس سے کہا تھا کہ
 ہندوستان میں خاصی گندگی ہے، یہاں کے لوگ صفائی
 کا خیال نہیں رکھتے۔“ وہ آرام سے کہے جا رہی تھی۔
 ”تو اس نے آگے سے کیا کہا؟“

”اس نے کہا کہ کم از کم وہ فرنگیوں سے تو بہتر ہیں
 جو مہینے میں بس ایک بار غسل کرتے ہیں اور یہ کہ وہ
 کمپنی بہادر کے جتنے افسروں کو جانتا تھا وہ ایسے ہی
 تھے۔“

”یہ تو معمولی بات ہے، کبھی کوئی غیر معمولی تلخ کلامی
 ہوئی؟“

”جو عورت ایک شخص کی محبت میں محل چھوڑ
 دے اور اس گاؤں میں آن کر بس جائے وہ کیوں غیر
 معمولی تلخ کلامی کرے گی؟“

انسپکٹر شاہ لا جواب سا ہو کر خاموش ہو گیا، پھر ٹھاکر
 دیکھو نانتھ کی جانب مڑا۔

”وقوعہ کے روز شبکھو کو آخری بار آپ نے کب
 دیکھا تھا؟“

”صبح ناشتے پہ۔ میں ناشتے کے بعد زمینوں پہ چلا گیا
 تھوڑی دیر بعد ہی نوکر بھاگتا ہوا آیا کہ مہمان خانے میں
 آگ لگ گئی ہے، جب تک میں پہنچا سب کچھ جل چکا
 تھا۔ آگ کے بجھنے تک اس کی کوئلہ صورت لاش
 ملی۔ اس کے قد بت اور گھڑی اور دیگر چیزوں سے اس
 کی شناخت ہوئی۔ میں نے فوراً ایک ملازم کو امر سر
 مایا دیوی کو لینے بھیجا۔“

”وہ بھی ایک ست رفتار جگھی پہ اور میرے پہنچنے

”تھماہ قبل۔“
 ”ہم انگلستان میں؟“

”میاں نے سر کو معمولی سی جنبش دی۔
 ”آپ نے اس سے شادی کیوں کی؟ آپ کی عمروں
 میں تقریباً سترہ سال کا فرق تو ہو گا۔“

”یہ سترہ سال کا۔“ اس نے تصحیح کی۔ ”شبکھو ایک
 رئیس تھا، عمر کسی رئیس۔ جیسا کہ آپ کو علم ہو گا کہ
 میرا تعلق برطانیہ کے شاہی خاندان سے ہے۔“ کہتے
 ہوئے غرون قدرے تقاخر سے بلند ہوئی۔

”موطا ہری بات ہے میں ایک
 native chieftain سے شادی دولت کی بنا
 پر کرنے سے رہی۔ ہم میں بس ایک قدر مشترک
 تھی اور وہ تھی محبت، سو ہم نے شادی کر لی۔“
 ”شادی انگلستان میں ہوئی؟“

”جی۔“

”آپ شادی کے کتنے عرصے بعد ہندوستان
 آئیں؟“

”تقریباً دو ماہ بعد میں دہلی پہنچی تھی، کچھ عرصہ ادھر
 رہی، پھر دہلی وری چلے گئے۔ تقریباً تین ماہ قبل
 شبکھو مجھے بلی راجپوت لایا تھا۔“

”آپ کی اردو بہت صاف ہے۔“ انسپکٹر شاہ
 سراہا۔

”میری فارسی بھی بہت صاف ہے۔“

”آپ انھوں میں آنکھیں ڈال کر اعتماد سے بات کرتی
 تھی یہ انداز ایسا تھا کہ وہ کہے بغیر نہ رہ سکا۔“

”ساتھ اہل فرنگ بے باک ہوتے ہیں، آج یقین
 ہی آگیا ورنہ۔“

”برعظیم میں نگاہیں ملانے کو بے ادبی تسلیم کیا جاتا
 ہے۔“

”اور ہمارے یہاں نگاہیں جھکانے یا چرانے کو
 دیانتی کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔ راست گو انسان میں
 یہ بہت ہونی چاہیے کہ وہ ٹوک بلا خوف و خطر
 کہے۔“

”بجا فرمایا۔ شبکھو سے آپ کے تعلقات کیسے

”انداز میں

”وہ اثر
 کچھو کے
 تھی۔“

”میرے
 و گیا اس
 شبکھو

”ج کی عمر
 ایک اپنا
 کا بات
 مل چکی

”اس
 لگستان
 بات تھا
 لڑ رکھا

”د سال
 سے یہ
 ہے؟“

”بات
 شتر کہ
 بات

”ر کے
 الی وہ

”میں
 ہوا۔“

خواتین و اجبست 8

وہ دونوں کھروں سے بچتے اس کے پیچھے آئے۔
 ”یہ دیکھیں یہ شیکھر ٹھاکر چلتا ہوا آ رہا ہے،
 انداز میں سستی ہے، تھکاوٹ سے آہستہ آہستہ چل
 رہا ہے شاید کسی گہری سوچ میں ہے۔“
 کھوجی زمین پہ بیٹھا مٹے نشان دیکھ کر بول رہا
 تھا اس کا انداز ایسا تھا کہ جیسے سامنے پوری فلم چل
 رہی ہو۔

مایا نے ان نشانوں کو دیکھا اسے کچھ سمجھ میں نہیں
 آیا۔
 ”یہ دیکھئے اب چوکھٹ سے چند قدم دور ٹھاکر کا
 ہے اور کچھ دیر جیسے سوچ کر اس طرف پیچھے کو مڑا ہے،
 پہلے وہ حویلی کے اندر کے راستے سے ادھر آیا تھا اب
 اس طرف باہر کو جا رہا ہے تیز تیز چل رہا ہے غصے میں
 ہے۔“

وہ بولتے بولتے کھروں کا پیچھا کر رہا تھا۔ یوں لگتا تھا
 جیسے اس کے اندر کوئی روح گھس گئی ہو اور وہ وقت میں
 پیچھے جا کر لمحے ام کر رہا ہو۔

”اب وہ حویلی کے پچھلے پھانک تک پہنچا ہے،
 یہاں رک کر اس نے اپنا جوتا جھاڑا۔“
 ”مجھے تو کچھ نظر نہیں آ رہا آپ کو کیسے علم کہ اس
 نے ادھر رک کر جوتا جھاڑا ہے؟“ مایا بے زاری سے
 بولی۔

کھوجی نے سر اٹھایا اس کے خزاں سید چہرے پہ
 تجربے کی لکیریں تھیں۔

”عمر گزری ہے اس کام میں بیارانی، بچپن میں جو
 کھڑے اپنے باپ کے ساتھ دیکھتا تھا وہ آج تک ذہن
 میں نقش ہیں۔ تمہاری انگریز سرکار کھوجیوں کی
 نشاندہی کو بطور ثبوت نہیں مانتی، مگر گاؤں کے ہر
 داروغے کو ہمارے کام کا پتا ہے، تب ہی تو آج بھی
 تھلنے وار صاحب ہمیں بلا لیتے ہیں۔“

پھر وہ جھک کر مٹی کو غور سے دیکھنے لگا۔
 ”یہ اپنے کام میں پراسرار حد تک ماہر ہوتے ہیں
 یہ صاحب۔“
 اس نے شانے اچکا دیے گویا ہتھیار ڈال دیے۔

”اب ادھر وہ جوتا جھاڑ کر پھر سے چل پڑا ہے
 حویلی کے پھانک کے قریب اسے کوئی ملا ہے، غالباً
 ملازم ہے کہ یہ نوکیلی جوتی کا کھرامیں نے پچھلی طرف
 بھی دیکھا تھا۔ اس نے ٹھوڑی دیر ملازم سے بات کی
 ہے، پھر شاید غصے میں اسے جھاڑا ہے، ملازم سہم کر
 پیچھے ہو گیا ہے۔ چھوٹا ٹھاکر اب پھانک پار کر کے باہر
 نکل آیا ہے۔“

وہ حویلی سے باہر نکل آئے تھے، کھوجی کسر پہ ہاتھ
 رکھے سوچتی نگاہوں سے سامنے کھیتوں کو دیکھنے لگا۔
 ”کھیتوں کے اندر سے تو شاید کھرانہ ملے، مگر نہیں،
 وہ پگڈنڈی سے ادھر جا رہا ہے۔ یہاں بہت سے کھڑے
 ایک دوسرے پہ چڑھے ہوئے ہیں۔ لوگ ادھر سے
 گزرتے رہتے ہیں، مگر مجھے دیکھنے دیجئے۔“

وہ دونوں کھیتوں کے کنارے کھڑے ہو گئے، جبکہ
 کھوجی بچوں کے بل زمین پہ بیٹھا مٹی کی زبان پڑھنے
 لگا۔

اور پھر جب وہ یہی زبان پڑھتے بڑھتے کھیتوں کے
 اختتام تک پہنچ گیا تو اشارے سے انہیں اپنی طرف
 بلایا۔

”وہ پگڈنڈی سے گزر کر اس طرف آیا ہے۔ یہاں
 سے آگے کھڑے واضح ہیں، مگر اس کے کھروں پہ اس کا
 اپنا ہی کھر چڑھا ہے، مطلب چھوٹا ٹھاکر بعد میں ان ہی
 قدموں واپس بھی آئے گا۔“

وہ انہیں اپنے پیچھے لیے جھک کر مٹی کو دیکھتا آگے
 بڑھتا رہا، پھر ایک دم رگ گیا۔

”داروغہ صاحب! وہ پچھلے راستے کی طرف مڑ گیا
 ہے۔“

”گاؤں کے تو سارے راستے کچے ہیں۔“ مایا حیرانی
 سے بولی۔

”نہیں بیارانی! ہم اس راستے کو بولتے ہی کچا راستہ
 ہیں، یہ مسلمانوں کے پرانے قبرستان کی طرف سے
 جانا ہے آگے چلنا ہے داروغہ جی؟“ کھوجی شش و پنج
 میں مبتلا ہو چھ رہا تھا۔
 ”ہاں چلنا ہے۔“

”ایسا کیا ہے کہ آپ کو سوچنا پڑ رہا ہے؟“ مگر دونوں نے لمبا کی بات کا جواب نہیں دیا۔

”وہ کچے راستے پہ چلے جانے قبرستان کی طرف جا رہا ہے۔ ادھر اس سے کوئی آکر ملا ہے۔“ اب کھوجی بیٹھ کر بغور نشانات کو دیکھنے لگا۔ ”آئے والا اونچے قد کا مرد ہے، ذیل ڈول اچھا ہے، اس نے ہٹا کر شیکھر سے مصافحے کے لیے ہاتھ برصایا ہے، مگر ہٹا کر پلٹ گیا ہے، پھر چند قدم واپس جا کر پھو دو بارہ نووارد کی جانب آیا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے نووارد کافی دیر ہوئی اس کے انتظار میں ٹھہرا رہا ہے۔ اب ہٹا کر نے اس سے ہاتھ ملا لیا ہے یا گلے ملا ہے یا نووارد نے اس کے شانے پہ ہاتھ رکھا ہے۔ اب وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ادھر تک آئے ہیں۔“

سامنے رائے قبرستان کا لکڑی کا خشتہ حال پھانک تھا۔ اس کا آلا ٹوٹا ہوا تھا۔

”وہ یہاں کھڑے کافی دیر باتیں کرتے رہے ہیں، پھر دونوں میں لڑائی ہو گئی ہے، شاید ہاتھ پائی بھی ہوئی ہے۔ اب شیکھر نے مقابل کو ادھر دھکا دیا ہے اور تیز تیز چلا واپس آیا ہے۔ انداز میں غصہ ہے۔“

یہ کہہ کر کھوجی کھڑا ہو گیا اور کپڑوں سے مٹی جھاڑی اس کے بعد تو آپ کو علم ہے کہ ہٹا کر واپس مہمان خانے میں چلا گیا تھا۔

”ایک آخری بات فضل الہی! کیا یہ شخص جو اس سے ملا ہے اس کے پیچھے مہمان خانے تک آیا ہے؟“ ”کچے راستے پہ کچھ ایسے نشان ہیں جیسے کسی نے کھرے مٹا ڈالے ہوں، ہو سکتا ہے وہ پیچھے آیا ہو، مگر راستہ بدل کر۔“

”شکریہ فضل الہی۔“

”ڈپٹی کارروالی تھی انسپکٹر صاحب! آپ اس نووارد کے کھرے کا مولڈ تیار کروالیں، اور کسی بھی قسم کی پیش رفت سے مجھے ضرور آگاہ کیجئے گا۔ میں شیکھر کے قاتلوں کو سلاخوں کے پیچھے دیکھنا چاہتی ہوں۔“ وہ کہہ کر جانے لگی۔

”میم صاحب! آپ کو کسی پہ شک ہے تو بتا

دیتے۔“

”نہیں ہے۔“ پھر شہر کرہولی۔ ”ہٹا کر کھوجی کا بیٹا گویا آج کل گاؤں سے باہر شکار کر گیا ہوا ہے، وہاں سے آئے تو اس کا بیان ضرور کیجئے گا۔“ کہہ کر کھوجی بیٹھ قدموں سے ہیتوں کی جانب بڑھ گئی۔

انسپکٹر شاہ اس کی ہشت پہ گرتی ساڑھی کے پیرہ دیکھتا کسی گہری سوچ میں گم تھا۔

کرم دین نے صدمہ سہا لیا تھا، مگر حاجی بشیر اگلے کئی روز تک بخار میں پھٹکتا رہا تھا۔ گاؤں والے اس کی عیادت کے لیے آتے تو اسے ہمراہ کئی کمائیاں دوسرے کو سنانے کے لیے لے لے کر ملتے۔

”کوئی کتنا ان کے دیکھتے ہی دیکھتے قبر شق ہوئی اور اندر سے وہ بھوت نکلا۔“

”اس کا قد دس فٹ تھا، اس نے منتر پھونک کر حاجی بشیر کو بے بس کر دیا۔“

”میں نہیں جت کر کے وہ خوف ناک قسمے لگا تا آسمان پہ اڑتا چلا گیا۔“

”اس کی آنکھوں اور منہ سے لہو بہہ رہا تھا۔“

بات اپنے حجم سے کئی گنا بڑھ کر نیلی راجپوتانہ کے چپے چپے تک پھیل گئی۔ حاجی بشیر کو اس کی بیوی بچوں نے مولوی سے کئی بار دم کروایا، تب وہ جا کر سنبھلا، لیکن پھر گاؤں والوں نے پرانے قبرستان کے قریب سے گزرنا بھی چھوڑ دیا، جو بات پہلے لوگ دلی دلی زبان سے کہتے تھے اب اس کا ثبوت بھی انہیں مل چکا تھا۔

اس نے بالکونی کی جانب کھلنے والے دروازے کو دھکیلا۔ لکڑی کے دونوں پٹ چرچاہٹ کے ساتھ کھلتے چلے گئے۔ چمکیلی تیز دھوپ اس سے لپٹنے لگی۔ ماتھے پہ ہاتھ کا چھبنا بنائے، پلکیں سکڑ کر ادھر ادھر کا جائزہ دیتی باہر بالکونی میں آگئی۔

نیلی راجپوتانہ پہ جاتی سرما کی چمکی دھپہ اتاری

نیلی بالکونی سے
ہاتھ
ایسے مندر پہ
کھینچ کر کسی مصو
نی۔ چوہا اب بھی
ہوئی آنکھوں میں
بال آٹھنے کر کے
لے لے کر وہ
رہی تھی۔

تب ہی ملازمہ
ٹشتری میں تازہ
آئی۔

وہ گلاس تھا
نگاہیں دور کھیتوں
”جانے کس

اس کو خاموش
لگائے کھڑی تھی
جب چھوٹے

تھے، کتنا جش
نے، پورا گاؤں
ٹھا کروں نے،

آپ امر تر گئے
لگ گئی۔ چھو
جا رہی تھی۔

تو بالکل ہی۔“
”شیکھر

اس کی بات کا
رہی تھی۔“

جواب نہیں دیا
”مجھے تو علم

کس وقت گئے
بارہ کچھ تھا، کچھ

”کیا راستہ؟“
پھر کر استعجاب

جی۔ بالکونی سے دور دور تک پھیلا گاؤں دکھائی دے

ہاتھ۔
ایسے منڈیر پہ ترچھی بیٹھی، زرد دیوار سے سر
نکلے وہ کسی مصور کا خوب صورت پورٹریٹ لگ رہی
تھی۔ چہرہ اب بھی برف سا تھا، بالکل بے تاثر اور
پوری آنکھوں میں چمکیلی دھوپ کا عکس اتر آیا تھا۔
ہل آکھٹے کر کے گردن کے دائیں جانب آگے کو ڈال
لیے تھے وہ بہت خاموشی سے دور پھیلے کھیتوں کو دیکھ
رہی تھی۔

تب ہی ملازمہ روپ وٹی اس کے لیے چاندی کی
ٹشتری میں تازہ پھلوں کے رس سے بھرا گلاس لے
تلی۔

وہ گلاس تھامے گھونٹ گھونٹ رس پیتی رہی۔
”جائے کس نے جاوہ ٹوٹا کر دیا ہے اس حویلی پر۔“

اس کو خاموش پار کر روپ وٹی وہیں دیوار سے ٹیک
لگے کھڑی کئے لگی۔ ”چند ماہ پہلے کی ہی تو بات ہے
بب چھوٹے ٹھاکر آپ کو لے کر پہلی دفعہ حویلی آئے
تھے ہفتنا جشن منایا تھا، کیسا چراغاں کیا تھا بڑے ٹھاکر
نے، پورا گاؤں سچ گیا تھا، کتنی دعوتیں کی تھیں
ٹھاکروں نے، پرہائے بھگوان۔ بس ایک دن کے لیے
آپ امرتسرگین اور پیچھے سے مہمان خانے میں آگ
لگ گئی۔ چھوٹے ٹھاکر کی تو لاش پہچانی بھی نہیں
جاری تھی۔ بس انگوٹھی اور کھڑی سے پہچانا، ورنہ چہرہ
تو بالکل ہی۔“

”شیکھر صبح اس مہمان خانے میں کیوں گیا تھا؟“
اس کی بات کاٹ کر مایا نے پوچھا، وہ ابھی تک باہر دیکھ
رہی تھی۔ ”مجھے کسی نے اس سوال کا تسلی بخش
جواب نہیں دیا۔“

”مجھے تو علم بھی نہیں تھا کہ وہ ادھر گئے ہیں، جانے
کس وقت گئے تھے میں نے تو انہیں شام میں آخری
بار دیکھا تھا، کچے راستے پر۔“

”کیا راستہ؟ کون سا کچا راستہ؟“ مایا نے گردن
بمیر کر استعجاب سے اسے دیکھا۔ یہ معلومات اس کے

لیے نئی تھی۔

”وہ جو مسلمانوں کے پرانے قبرستان کی طرف جاتا
ہے، وہ والا راستہ میم صاحب!“

”مسلمانوں کے پرانے قبرستان کی طرف؟“ مایا
نے حیرت سے دہرایا۔ ”شیکھر کا مسلمانوں کے
قبرستان میں کیا کام تھا۔“

”بھگوان جانے میم صاحب! میں نے تو آخری دفعہ
انہیں ادھر ہی دیکھا تھا، جب میں اپنی موسیٰ کے گھر
سے واپس آ رہی تھی۔“

”کیسے اتنی اچانک سے ہو گیا یہ سب کچھ۔“ مایا زیر
لب برہنہ تھی۔ ”میں بس ایک روز کے لیے امرتسرگین
اور واپس آئی تو شیکھر کی چنتا تیار رکھی تھی۔ مجھے تو
کسی نے اس کا چہرہ بھی نہیں دیکھنے دیا۔ بس ایک روز
میں اتنا کچھ جیسے موت اس کے تعاقب میں بیٹھی
تھی۔“

مایا کو بے اختیار یاد آگیا، وہ دن جب وہ پہلی دفعہ
حویلی میں آئی تھی۔

روشنیوں اور دلوں سے چراغاں کیا گیا تھا، پوری
حویلی کسی دلہن کی طرح سجی ہوئی تھی۔ جب وہ اور
شیکھر اپنی مورس سے اترے تو ٹھاکر رگھوناتھ ان
کے استقبال کے لیے دروازے پر کھڑے تھے۔

”ہایا ڈرائنگ لمیہ میرے تیار ٹھاکر رگھوناتھ ہیں،
میری تالی کا کٹی برس ہوئے انتقال ہو چکا ہے، ان کا
ایک ہی بیٹا ہے گویاں جو کہ۔“ اس کا تعارف کراتے
کراتے شیکھر نے رک کر سوالیہ نگاہوں سے ٹھاکر
رگھوناتھ کا چہرہ دیکھا، جنہوں نے جلدی سے وضاحت
کی۔

”وہ دوستوں کے ساتھ شکار پر نکلا ہے، صبح تک
آجائے گا۔“

”اوکے بہر حال مایا ڈیر! تیا ہی میری کل فیملی
ہیں، انہوں نے مجھے ماں اور باپ دونوں بن کر پالا
ہے۔“

اور رات کو اپنے کمرے میں اس کے قریب بیڈ پر
بیٹھے شیکھر نے اسے بتایا تھا۔

”یہ خبیث بڑھا شروع سے ہی میری جائیداد کے پیچھے سے اور اس کا وہ کمینہ بیٹا ان دونوں کا بس چلے تو شیکھو کو گولی مار کر اس کی ساری پر اپنی تھمیں۔“ اور مایا نے جھٹ سے اس کے لبوں پہ ہاتھ رکھ دیا اور شیکھو نے وہ ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا تھا۔

اس نے سر جھکا کر اپنے ہاتھوں کو دیکھا۔ روپ وٹی ابھی تک اس کے سر پہ سوار کچھ کے جاری تھی۔ مایا پھر سے دور فصلوں کو دیکھنے لگی جہاں کھیتوں کے درمیان بنی پگڈنڈی پہ ایک لڑکی چلتی آ رہی تھی۔

بالوں کا جھولتا پراندہ گردن میں لاپرواہی سے بڑا دوشہ اور ہاتھ میں پکڑا بھڑے جسے وہ چلتے ہوئے ساتھ ساتھ کھاتی جا رہی تھی۔

پگڈنڈی سے اتر کر اب وہ حویلی کے سامنے والے راستے سے گزر رہی تھی۔ فاصلہ کم ہونے کے باعث مایا اس کا چہرہ بغیر کسی دقت کے دیکھ سکتی تھی۔

گندی رنگت، تھکے نقوش، مغرور سی بڑی بڑی آنکھیں، وہ بلاشبہ بہت خوب صورت تھی، اتنی جتنی پنجاب کے کسی گاؤں کی کوئی الزمیار ہو سکتی تھی۔

”یہ زہرہ ہے، ملکوں کی دھی۔“ روپ وٹی نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”سارے گاؤں میں اس جیسی سندر لڑکی کوئی نہیں ہے۔“

وہ بلا ارادہ اس لڑکی کو دیکھے گئی۔ وہ خوب صورت بھی تھی اور کم سن بھی، تقریباً ”سترہ“ اٹھارہ برس کی۔ اب وہ لاپرواہی سے بھٹک کھاتی حویلی کے بالکل قریب سے گزر رہی تھی۔

دفعۃً ”چی سڑک برسے دھول اڑاتی جیب راستہ بدل کر اس کے سامنے آئی۔ لڑکی ہڑبڑا کر پیچھے ہوئی۔

جیب رک چکی تھی۔ اس میں چار افراد بیٹھے تھے، ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھے تھیں، کوہ جیب کی کھلی چھت کے باعث بخولی پہچان گئی تھی۔

وہ ٹھاکر گھوٹا تھا، مایا کو پال تھا۔ شیکھو کا تیا زاد بھائی۔

”اسے راستہ کیوں روکا ہے؟“ لڑکی نے ایک طرف پھینک کر ماتھے پہ تیوری ڈالے فٹے سے پوچھ رہی تھی۔

جواب میں گویال اور اس کے دوست ایک ساتھ اس پہ فقرے گنے گئے۔ ان کا لہجہ دیکی پن سے بھرا تھا، مایا کو الفاظ سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔

”میرے ساتھ زبان سنبھال کر بات کرو۔“ لڑکی ہاتھ کمر پہ رکھے تیزی سے بولی۔ ”میں بدرغازان کی جنگ ہوں، میرے ساتھ بد تمیزی کی تو لاش بھی نہیں ملے گی تمہاری۔“

آن کی آن میں گویال کے چہرے کا رنگ متغیر ہوا۔ اس نے جیب اشارت کی اور اسے موڑ کر آگے لے گیا۔ لڑکی نے فاتحانہ انداز میں دھول اڑاتی دور جاتی جیب کو دیکھا اور استہزائیہ سر جھٹک کر کچھ زیر لب برز داتی۔

”روپا دیوی، جاؤ اس کو میرے پاس لے کر آؤ۔“ مایا نے حکم سے کہا اور چند لمحوں بعد وہ لڑکی روپ وٹی کے عقب میں اس کے کمرے سے ہو کر بالکونی میں داخل ہوئی۔

مایا ابھی تک منڈیر پہ ترچھی بیٹھی کھیتوں کو دیکھ رہی تھی، آہٹ پہ اپنی ران جس سی گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“ اس کے لہجے میں ٹھاکرائیوں کی سی رعونت ور آئی تھی۔

”زہرہ جی، زہرہ بتول۔“ وہ ویسی ہی لاپرواہی سے کھڑی تھی، مگر نگاہوں میں راجپوتوں کی گوری، سو کے لیے بے پناہ ستائش تھی۔ ”آپ ٹھاکر شیکھو کی بیوہ ہو؟“

مایا نے اثبات میں سر ہلایا، اور ایک بے نیاز سی نگاہ سے زہرہ کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔

”بڑا افسوس ہوا جی ٹھاکر شیکھو کی موت کا کچھ بتا چلا آگ کیسے لگی تھی؟“ زہرہ منہ زور اور تندر ہونے کے ساتھ ساتھ براعتا بھی تھی۔

”تم بتاؤ آگ کیسے لگی تھی؟ تمہیں کچھ بتا چلا؟“ مایا

پوشی سے اس کی بات

میں جی

منڈیر پہ

روپ وٹی نے

اس کی لڑکی نے

کے جذبات سے

بھی نہ دیکھتا

نام سے تو جان

کے لہجے میں

”ہوں۔“

سے کھیتوں کو

سے اسے کوئی

ماہانے گرو

گئی۔ جاتے۔

سمجھ میں

تھا۔

ناموشی سے اس کی بات سننے کے بعد ٹھنڈے لہجے میں بولی۔

”میں جی۔۔۔ وہ سہتا نہیں جی۔“ پڑ پڑ مٹولنے والی زہرہ زہرہ کر خاموش ہو گئی۔

منڈیر پہ بیٹھی اس مہارانی کے سامنے بولنا اب اسے قدرے مشکل لگ رہا تھا۔

”یہ گوپال تم سے کیا کہہ رہا تھا؟“ وہی بے اثر بغیر دہلی دہلی جس لیے لہجہ۔

”گھٹا دہتا کیا ہے جی۔“ زہرہ کے ماتھے پہ بل رگیا۔ ”جہاں اکیلی لڑکی دیکھی، کتوں کی طرح بھونکنے اُٹاتے ہیں ٹھاکروں کی لڑکے۔“

روپ وٹی نے گھبرا کر زہرہ کو دیکھا جو ٹھاکروں کی جوبلی میں ہی شروع ہو چکی تھی۔

”تو کتوں کو خاموش کرانے کا کڑ کہاں سے سیکھا، اس اکیلی لڑکی نے؟“ اس کا لہجہ ابھی تک کسی بھی قسم کے جذبات سے عاری تھا۔

”میں نے بھی کہہ دیا کہ میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھنا میں پھر غازان کی منگ ہوں۔ بس بدر کے نام سے تو جان جاتی ہے ٹھاکروں کے لڑکوں کی۔“ اس کے لہجے میں فخر تھا۔

”ہوں۔“ بیاگہری سانس بھر کر گرون موڑے پھر سے کھیتوں کو دیکھنے لگی، جیسے پیچھے موجود ان دو نفوس سے اسے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ ”میں جاؤں گی؟“

”ماہانے گرون پھیرے بغیر“ ہاں“ کہہ دیا تو زہرہ چلی گئی۔ جاتے سے وہ کچھ کنفیوژن سی تھی، شاید اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ٹھاکرانی نے اسے کیوں بلوایا تھا۔

ان کے جانے کے کتنی ہی دیر بعد گوپال کی جیب جوبلی کے کھلے کیٹ سے اندر داخل ہوئی۔ وہ ابھی تک منڈیر پہ بیٹھی کھیتوں کو دیکھ رہی تھی۔ گوپال کو دیکھ کر اسے چند روزہ رانی وہ شام یاد آگئی، جب وہ اس سے پہلی دفعہ جوبلی میں ملی تھی۔

یہ اس کا پہلی راجپوتوں میں دو سرار روز تھا۔ وہ شیکھر کے ساتھ برآمدے میں بیٹھی شام کی

چائے پی رہی تھی، جب اس نے ایک اونچے لمبے تیس پینتیس برس کے شخص کو جیب سے نکل کر سامنے کسروں کی جانب جاتے دیکھا۔ اس کی چال میں واضح لڑکھڑاہٹ تھی جیسے وہ نشے میں ہو۔

”یہ کون ہے؟“ مایا نے شیکھر کا ہاتھ ہلایا۔ وہ بیٹھا کوئی فائل دیکھ رہا تھا، متوجہ کرنے پہ گرون موڑ کر ایک نظر پیچھے دیکھا۔

”مائی کزن! گوپال راج۔“ شیکھر نے سر جھٹکتے ہوئے پھر سے فائل کی جانب متوجہ ہو گیا۔

”شاید نشے میں ہے۔“ مایا نے چائے کی پیالی میز پہ رکھ دی۔ گوپال اب اندر جا چکا تھا اس نے اگر شیکھر کو دیکھا بھی تھا تو ملنے کی یا بات کرنے کی سعی نہیں کی تھی۔

ماہا گھونٹ بھرتی اس تناؤ کو محسوس کرتی رہی جو شیکھر اور تایا رگھوناتھ کے درمیان، ہمیشہ سے موجود تھا۔

شام کی سرد ہوا کا تیز جھونکا آیا تو وہ چونکی اور منڈیر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اندر ہیرا پھیلنے لگا تھا، سورج جانے کب کا ڈوب چکا تھا۔ وہ ساڑھی کا پلو ہاتھ سے سنبھالے اندر کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

چاچی یاورچی خانے میں بیٹھی سبزی کاٹ رہی تھی، زہرہ اوھر اوھر سے اسے آوازیں دیتی یاورچی خانے کے دروازے تک آئی۔

”چاچی بدر کہاں ہے؟“ ”نکل سے شہر گیا ہوا ہے، کیوں خیریت میری دھی؟“ چاچی ہاتھ روک کر پوچھنے لگی۔ زہرہ کو مخاطب کرتے ہوئے اس کے لہجے میں بیا رست آتا تھا۔

”خیریت نہیں ہے۔“ وہ نزو بھی سی دھپ سے چونکی، کچھ کر اس کے ساتھ آن بیٹھی۔

”کسی نے کچھ کہہ دیا ہے کیا؟“ ”مہانے ٹھاکروں کے لڑکوں کو مسئلہ کیا ہے؟“ وہ کچی سبزی اٹھا کر کھانے لگی۔

چاچی نے چھری رکھ دی۔ ”کسی نے کچھ کہا ہے تجھے؟“
”آہو۔ ٹھاکر گوپال ہے تا اس نے اپنی موٹر سے میرا راستہ روکا۔“

”پھر؟“ چاچی پریشان ہو گئی۔
”میں نے بھی بدر کے نام کی وہم کی دے دی ایسے بھاگا کہ بس! وہ مزہ لے کر کھلکھلائی پھر کسی خیال کے تحت پوچھنے لگی ”ویسے بدر کب آئے گا؟ بتاؤں تو سہی اسے وہ خود ہی منٹ لے گا۔“

”بالکل مت بن زہرہ! گوپال دیک گیا بس اتنا ٹھیک ہے اب بدر کو نہ بتانا میری دھی تجھے اس کے غصے کا پتا تو ہے، خواہ مخواہ بات بڑھے گی۔“

”پر چاچی، بدر ایک دفعہ اس کی طبیعت تو ٹھیک کرتے تھے۔ وہ مینمائی۔“

”ارے جھلی ہر بات گھر کے مردوں کو بتانے کی نہیں ہوتی، ورنہ خون خرابا ہو جائے گا اور تجھے کتنی دفعہ کہا ہے یوں اکیلی نہ لور لور پھرا کر اب تو بڑی ہو گئی ہے۔ خیال کما کر۔“ چاچی نے ڈیٹ دیا۔

”اچھا۔“ وہ خفا سی ہو گئی پھر ایک دم جوش سے بولی۔ ”چاچی، تو نے ٹھاکر شیکھو کی گوری میم، بیسی ہے؟ راجپوتوں کی بیٹی ٹھاکرانی؟“

”ٹھاکر شیکھو کی بیوہ؟ نہیں، ان سے کون سا ایسے تعلقات ہیں جب۔“ چاچی سر جھٹک کر سبزی کاٹنے لگی۔

”مجھے روپ وٹی نے آج کہا کہ تمہیں مہارانی بلاری ہے تو میں راجپوتوں کی حویلی چلی گئی۔“

”زہرہ! چاچی دنگ رہ گئی۔ ”تو راجپوتوں کی حویلی چلی گئی؟ بدر کو علم ہوا تو جانتی ہے کیا ہو گا؟“

”اور بدر کو کیسے علم ہو گا؟“ وہ ہنس دی۔ ”پر چاچی، وہ بہت شان والی ہے۔“

”شیکھو کی بیوہ؟ کیا بہت حسین ہے؟“

”حسین تو بتا نہیں سکتی۔ مگر۔“ زہرہ کو جیسے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ ”بس میں تجھے کیا بتاؤں چاچی، وہ بہت شان والی ہے، بالکل جیسے مہارانیاں ہوتی ہیں

۔ اتنی خوب صورت نہیں ہے، مگر بالکل مہارانی لگتی ہے، آنکھ نہیں ملائی جاتی اس سے۔“
پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”چاچی بدر آئے تو مجھے بتانا مجھے کام ہے اس سے۔“

”ہاں بتا ہے مجھے کیا کام ہے تجھے؟“ چاچی ہنس دی تو وہ جھینپ کر وہاں سے بھاگ گئی پھر بھانے سے پہلے چاچی نے زہرہ کے چہرے پہ بکھرے دھنک رنگ پھیر لیے تھے۔



گھاس شبنم کے قطروں سے لدی تھی۔ وہ ان قطروں پہ اپنے سپید پاؤں رکھتی کیاری کی طرف چلی آئی جہاں بڑے بڑے تازہ سرخ گلاب لگے تھے۔ سامنے گھاس پہ سرخ پیتیاں بکھری تھیں۔

شاید کوئی باکی گلاب ٹوٹ کر گر اٹھا اور ہوائے اس کی پیتیاں بکھیر دی تھیں۔

مایا وہیں کیاری کے قریب جھک کر پیتیاں چنے لگی۔ دیر باغیچے کے آغاز پہ کوئی تیزی سے چلتا برآمدے کی جانب برہہ رہا تھا، اسے دیکھ کر جیسے ٹھٹک کر روک گیا۔

تازہ سرخ گلابوں کے قریب گھاس پہ چنے پاؤں بیٹھی لڑکی سر جھکائے پیتیاں چن کر اپنی گود میں بھر رہی تھی۔ وہ گلابی رنگ کی پاؤں تک آتی ٹانگیں میں بلبوس تھی اور شہر رنگ بیاہوں شالوں پہ بکھرے تھے۔

ٹھاکر گوپال راج اندر جانے کا ارادہ ترک کر کے گھاس پہ آ گیا۔ بھاری جو تون تلے نرم گھاس دیتی کچلتی تھی مگر مایا اسی طرح مگن کیاری سے پھول توڑ کر گود میں ڈال رہی تھی۔

وہ اس کے بالکل سامنے آ گیا۔

”گلاب پسند ہیں آپ کو مایا دیوی؟“

”سب کو ہوتے ہیں۔“ وہ بغیر چونکے اسی اطمینان سے گود میں رکھے پھولوں کی شبنیاں برابر کرتی رہی، سر اٹھا کر بھی اسے نہ دیکھا۔

جانے کیسی بے نیازی اور غور تھا اس چند قدم کے

کرپائل مہارانی لکھی

رہ آئے تو مجھے بتانا

”جی ہنس دی تو
رہا گئے سے کئے
دھنک رنگ دیکھ

”جی تھی۔ وہ ان
کی طرف چلی
ب لگے تھے۔

دور ہوانے اس

ن جتنے لگی۔
چھابڑ آدے
دھنک کر رک

پہ ننگے پاؤں
میں بھر رہی
ہا میں بیوس

ک کر کے
عاس دیتی
بول توڑ کر

باطمینان
ناری سر

قدم کے

ناملے بیٹھی لڑکی کے اندر کہ گویا کچھ کہہ نہ سکا۔ وہ
نہیں تھی، مگر گویا نے اس سے کہیں زیادہ حسین
ہو نہیں دیکھی تھیں۔ یہ بھی نہیں تھا کہ وہ گوری میم
نہی گویا نے بہت سی میمیں، پھیلے شاپم جیسی
گوریاں دیکھ رکھی تھیں۔ یہ حسن نہیں تھا جو اس
عورت کو دوسروں سے بالکل ممتاز بناتا تھا، یہ ایک سحر
کش اور تھمکت تھی جو گویا راج نے زندگی میں
پہلی دفعہ کسی عورت میں دیکھی تھی۔

”آپ۔ آپ انگلستان واپس جا رہی ہیں؟“

”نہ جاؤں؟“ اس نے گلدستہ بناتے بناتے رک کر
بید حال کی آنکھوں میں دیکھا۔

”نہیں تو۔ ہاں مگر۔“

وہ کوئی وضاحت سے بغیر سر جھکائے گلدستے کی
باب متوجہ ہو چکی تھی۔

”آپ۔۔۔ شیکھو کی تمام جائیداد بیچنا چاہتی ہیں؟“
”نہیں۔“

”اس سلسلے میں یہ جی آپ کی مدد کر سکتے ہیں۔“

”وہ کر رہے ہیں۔“ ایک لمبی سنی کو مروڑ کر
گلدستے کے گرد باندھا۔

”اوہ اچھا۔“ وہ شرمندگی چھپانے کو کھوکھلی سی سنی
بنا۔ ”آپ کی اور شیکھو کی پسند کی شادی تھی؟“

”ہوں۔“

”آپ دونوں ساتھ بہت خوش تھے، کسی کے گمان
میں بھی نہ تھا کہ وہ اتنی جلدی ہم سے جدا ہو جائے
گی۔“

وہ گلدستہ بنا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ گود سے بہت سی
چٹیاں گھاس۔۔۔ آن گریں۔ وہ کیاری سے کھڑے
کھڑے جھک کر کچھ پتے توڑنے لگی۔

”آپ واپس انگلستان جا کر کیا کریں گی؟“

”یہ بدرعازان کون ہے؟“ پتے توڑ کر گلدستے کو
بالتے اس نے پوچھا۔

گویا اس جملے کے لیے تیار نہیں تھا، یہ سوال اس
کے لیے قطعاً غیر متوقع تھا۔

”جی۔۔۔ بدرعازان؟ آپ کو کس نے بتایا؟“
”کل جس لڑکی کو آپ حویلی کے باہر پھینچ رہے تھے
کو۔“ اس نے بدرعازان کے نام کی ہی دھمکی دی تھی تا آپ
گویا کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

”کون ہے یہ بدرعازان؟“ وہ نگاہیں گلدستے پہ
بماتے اسے بڑے بڑے سبز پتوں سے سجا رہی تھی۔

”مسلما،“ اور کچھ نہیں۔“ کوئی موٹی گالی بولنے پہ
روک کر، بس اتنا کہہ کر وہ تیز تیز قدم اٹھا تا وہاں سے
چلا گیا۔

مایا نے اطمینان سے گلدستہ مکمل کیا، گھاس یہ گری
پتیاں چن کر کیاری میں ڈالیں اور پچھم کے نرم قطروں
پہ پاؤں رکھتی باغ سے باہر آئی۔ کنارے پہ رکھی اپنی
نازک جوتی پہنی اور ہاتھ سے بال سنوارتے ہوئے
حویلی کے اندر دینی جھ کی جانب بڑھ گئی۔

روپ دتی کو اس وقت یقیناً ”روپتی“ میں ہونا
چاہیے تھا، وہ کچھ سوچ کر ہال کمرے سے دائیں جانب
ہوئی۔ چند راہداریاں عبور کر کے وہ روپتی کی چوٹ
میں کھڑی تھی۔

”روپادیو۔“ اس نے ہلکا سا رواڑہ بجایا۔

ناشتہ بنائی روپ دتی چونک کر پیچھے مڑی۔ بیچ
چوٹ میں گلابی ناخی پتے، ہاتھ میں گلدستہ لیے مایا
کھڑی تھی۔

”مہارانی جی، آپ؟ خیریت؟“ روپا ہاتھ دھو کر
ساڑھی کے پلو سے خشک کرتی اس تک آئی۔

”مجھے باہر جانا ہے میرے ساتھ چلو۔“

”ناشتہ کر کے یا۔۔۔؟“

”نہیں میں بس۔۔۔“ مایا نے ایک نظر اپنے شب
خوابی کے لباس کو دیکھا۔ ”لباس تبدیل کر لوں۔“

”جانا کدھر ہے جی؟“

”زہرہ کے گھر، جو کل آئی تھی۔“ کہہ کر وہ گلدستہ
ہاتھ میں لیے واپس راہداری میں مڑ گئی۔

”ایس؟ زہرہ کے گھر؟“ روپا چران پریشان کھڑی
رہی۔ یہ نئی مہارانی بھی ایک معرہ تھی۔

چند منٹ بعد وہ لباس تبدیل کر کے پھر سے رسوئی کے دروازے پہنچ گئی تھی۔
”چلو۔“ حکم سے کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی۔

سفید لانگ اسکرٹ ہلکا گلابی بلاؤز اور شانوں پہ سفید رنگ کی چھوٹی سی اسٹول پھیلائے، وہ بہت بے نیازی سے چل رہی تھی۔

زہرہ کے گھر جانے کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ وہ وہیں ان کو بھیتوں کے اس طرف اپنی کسی سہیلی کے ہمراہ شہلی مل گئی۔

اس کا تعلق اپنے گھرانے سے تھا، گاؤں میں مسلمانوں کے اونچے گھرانوں کی جوان بیٹیاں یوں نہیں پھرا کرتی تھیں مگر زہرہ کو اس کی کم سنی اور غالباً لاڈلی ہونے کے باعث خاصی رعایت مل جاتی تھی۔
”مایا دیوی۔۔۔ آپ۔“ وہ سہیلی کو بھگا کر ان کی طرف آئی۔

”ہاں زہرہ! مہارانی جی تم سے ہی ملنے آرہی تھیں۔“

”یہ تمہارے لیے۔“ مایا نے گلدستہ اس کی جانب بڑھایا۔ ”کل میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی سو تم سے ٹھیک سے بات نہیں کر سکی۔“

کل کی نسبت آج مایا کے چہرے پہ دوستانہ مسکراہٹ تھی مگر پھر بھی انداز میں کچھ ایسا ضرور تھا کہ اپنی عادت کے برعکس اس سے بے تکلف ہونے کی کوشش نہ کر سکی۔

”شکریہ ادا کرتی جی۔“ اس نے جوابی مسکراہٹ کے ساتھ گلدستہ قبول کیا۔

”تم اچھی بہادر لڑکی ہو۔“ وہ دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگیں۔ روپا ان سے چند قدم پیچھے تھے۔
”بنا پڑتا ہے جی! اٹھا کروں گے لڑکے ورنہ بیٹے نہیں دیتے۔“

سورج نکل چکا تھا اور نرم گرم دھوپ سے اس کے سنہرے مائل شدہ رنگ سیل چمکنے لگے تھے۔
”شکریہ کیسا لگتا تھا نہیں؟“

ان کے بارے میں گاؤں والے زیادہ جانتے نہیں

ہیں۔ وہ بچپن سے ہی تعلیم کے لیے دہلی چلے گئے تھے پھر کاروبار کے بعد یا تو دہلی ہوتے یا ولایت مہکوں تو بھی کبھار ہی آتے تھے۔
”اور یہ بدرغ از ان کون ہے؟“

زہرہ کے چہرے پہ دھنک کے سارے رنگ مگر لگے مایا نے بہت غور سے انہیں دیکھا تھا۔

”میرے چچا کا بیٹا میرے ماں باپ کے بعد میرے چچا چاچی نے ہی مجھے پالا ہے۔“ وہ سر جھکائے مسکراتے ہوئے بتا رہی تھی۔

وہ چلتے چلتے کچے راستے پہ دو رنگل آئی تھیں۔
”کرنا کیا ہے؟“

”وہ باہر سے پڑھ کر آیا ہے، اب تو باپ دلاوا کی زمینیں سنبھالتا ہے۔“

”کیا سنی راجپوتوں کے سارے زمین داروں سے اٹھا کر گویا اسی طرح ڈرتا ہے؟“ مایا کا لہجہ ٹھنڈا تھا۔
”ہمارا خاندان گاؤں کا واحد مسلم خاندان ہے،“

ہماری زمینیں راجپوتوں سے زیادہ نہیں ہیں تو کم بھی نہیں ہوں گی۔ پہلے یہ لوگ بات بات پہ ہندو مسلم فسادات بھڑکا دیتے تھے مگر اب نئی برس سے کوئی فساد نہیں ہوا۔ یہ بدر سے ڈرتے ہیں، جانتے ہیں اس کے پاس طاقت بھی ہے اور اثر و رسوخ بھی۔
”بس اسی لیے ڈرتے ہیں؟“

”تو آخر ہے کوئی اس پورے گاؤں میں بدر جیسا؟“

اپنے برائے سے حقیقی وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی آگے دم رک گئی۔ ”اگر نہ جائیں مایا دیوی۔“

وہ جوان کے ساتھ چلتے چلتے اس کے راستے پہ کئی آگے تک آگئی تھی، ٹھنک کر رک گئی۔

”مگر کیوں؟“ اصرار کیا ہے؟ اس نے حیرت سے کچے راستے کو دیکھا اور پھر روپ وٹی اور زہرہ کے چہروں پہ چھائے خوف کو۔

”مہارانی جی یہ راستے پرانے قبرستان کو جاتا ہے وہاں۔۔۔ وہاں سلیہ ہے جی۔“ روپ وٹی کی آواز میں خوفور آیا تھا۔

”سایہ؟ کس جگہ کاسلیہ؟“

”بھوت کاسلیہ کوئی بھیجی ہوئی آتا ہے جی۔“

”کیا بات کر رہی ہو روبا!“ مایا نے ناگواری سے سر جھٹکا۔

”روبا دیوی ٹھیک کہہ رہی ہے ٹھاکرنی جی! پرانے قبرستان میں سایہ ہے۔ لوگ اب اس کے قریب سے بھی نہیں گزرتے۔“

”بلکہ اس دن تو اچھو کہہ مارے خود اس بھوت کو دیکھا ہے، سیاہ چنڈ پہن رکھا تھا اور قبرستان کے آس پاس چکر لٹ رہا تھا۔ تین روز تک اچھو کہہ مار کو بخار رہا۔“

”اور گاؤں والے کہتے ہیں کہ روز رات کو سیاہ چنڈ میں ملبوس ایک لمبا سا بھوت پرانے قبرستان میں آتا ہے اور پھر ایسی آوازیں آتی ہیں جیسے وہ کچھ کھود رہا ہو۔“

”گاؤں والوں نے کبھی اس کا پیچھا کرنے کی کوشش کی؟“ مایا کو ابھی تک یقین نہ تھا۔

”نہ جی، توبہ کریں۔ ہوائی چیزوں کا بھی پیچھا کیا جاتا ہے کیا؟“ روبا نے کانٹوں کو ہاتھ لگائے۔

”اور ٹھاکرنی جی! کسی نے آج تک اسے آتے جاتے نہیں دیکھا کسی قبر سے اٹھتا ہے وہ شاید۔“

”شاید!“ اس نے طنزاً دہرایا۔ ”ہو گا کوئی عامل پایا، کوئی چلہ وغیرہ کر رہا ہو گا، تم گاؤں والے بھی نا۔“

”بدر بھی یہی کہتا ہے۔“ زہرہ نے تاسف سے سر جھٹکا جیسے مایا اور بدر دونوں کی عقل پہ ماتم کر رہی ہو۔

”کیا کہتا ہے وہ؟“ بلا ارادہ بھی وہ متوجہ ہو گئی۔

”یہی کہ یہ گاؤں کا ہی کوئی بندہ ہے، کسی واردات میں ملوث، یقیناً کسی کو قتل کر کے دبایا ہو گا اور اب لاش ڈھونڈ رہا ہے۔“

”بہت معقول آدمی ہے تمہارا تایا زاد ملوانا مجھے کبھی اس سے ابھی تو چلو تمہارا وہ قبرستان دیکھتے ہیں۔“

روپ وٹی اور زہرہ روکتی رہ گئیں مگر بتلی راجپوتان کی وہ مہارانی کہاں کسی کی سنارکتی تھی۔

قبرستان کی چار فٹ اونچی چار دیواری کچی تھی۔ داخلے کے لیے ایک لکڑی کا خستہ حال پھانک تھا۔ وہ پھانک کھول کر اندر چلی آئی۔

قبرستان بہت قدیم تھا، جیسے کوئی صدیوں پرانا کھنڈر ہو۔ اس کا احاطہ کافی وسیع تھا۔ کونے میں بڑے بڑے کالیک بوڑھا درخت کھڑا تھا جس کی جھکی شاخیں اور قبرستان کی پراسرار فضا میں اس بتلی راجپوتان کے بھوت کی گواہ تھیں، جس نے پورے گاؤں کو متوحش کر رکھا تھا۔

وہاں کی خاموش فضا بہت پراسرار تھی، اسے اندر بہت سے صدیوں پرانے راز دفن کیے۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہاں سفید لبادے اوڑھے ان دیکھی روحوں بھٹکتی پھر رہی ہوں۔ بالکل ان کے آس پاس۔

”تو ادھر آتا ہے وہ بھوت؟“ سینے پہ ہاتھ باندھے وہ طائرانہ نگاہوں سے ارد گرد کا جائزہ لے رہی تھی۔

”جلے مہارانی جی! مجھے تو وحشت ہو رہی ہے۔“ وہ دونوں مارے باندھے اس کے پیچھے آئی تھیں اور اب خوف سے روپ وٹی کا برا حال تھا۔

”کیا خیال ہے، رات تک انتظار نہ کریں؟ میں اس سورا کو دیکھنا چاہتی ہوں جو معصوم لوگوں کو جانے کتنے عرصے سے ڈرا رہا ہے۔“

”جھگوان نہ کرے، جو ہم رات ادھر بسر کریں۔ جلے مہارانی جی، بڑے ٹھاکر کو علم ہوا تو بہت خفا ہوں گے۔“

”کیوں؟“ مایا تیزی سے پلٹی۔ ”تمہارے بڑے ٹھاکر کو میرے گاؤں میں چلنے پھرنے پر بھی اعتراض ہے؟ میرا گھر پر باد ہو گیا، میرا بتی مجھ سے چھن گیا، اس کا آخری بار منہ نہیں دیکھنے دیا، مجھے کیا یہ ظلم کم تھا۔ تو اب مجھے چوٹی میں قید کرنا چاہتے ہیں؟“

روپ وٹی اور زہرہ ششدر رہ گئیں۔

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں مہارانی جی؟“

”کیا غلط کہا میں نے؟ کیوں بڑے ہیں یہ شیکھو کی جائیداد کے پیچھے؟ کیا انہیں اتنا بھی احساس نہیں کہ اس کو مرے ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں؟“ بہت دن کا لاوا جیسے اس کے اندر سے نکلا تھا۔

”ٹھاکروں کو بھی چھوٹے ٹھاکر کی موت کا اتنا ہی دکھ ہے مہارانی جی، آپ یوں بول برائہ کریں۔“

”جانے بھی دے، رویا۔“ وہ سر جھٹک کر تیز تیز قدموں سے چلتی کھلے پھاٹک سے باہر چلی گئی۔
روپوتی اور زہرہ بتول ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئیں۔



زہرہ پر اندھ جھلاتی، ہمیشہ کی طرح بھاگتی ہوئی برآمدے میں داخل ہوئی اور پھر ایک دم ٹھٹک کر رک گئی۔
سامنے چارپائی پہ بدر بیٹھا تھا، اس کی زہرہ کی طرف کر تھی اور وہ چاچی کی کوئی بات خاموشی سے سن رہا تھا۔

ایک دم سے برآمدے میں جیسے دھنک اتر آئی تھی زہرہ کو ہر شے خوب صورت لگنے لگی وہ دھڑکتے دل کے ساتھ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی آگے آئی اور سلام کیا۔

وہ ماں کی کسی بات پہ الجھا بیٹھا تھا چونک کر سر اٹھایا اور سلام کا جواب دیا پھر دوبارہ ماں سے بات کرنے لگا۔
وہ وہیں خاموشی سے چارپائی کی پائنٹی پہ ٹپک گئی۔
”زہرہ! صبح کدھر چلی گئی تھی میں تجھے ڈھونڈ رہی تھی۔“ چاچی بات اوسوڑی چھوڑ کر زہرہ سے کہنے لگی۔

زہرہ نے سر اٹھایا اور ایک چورنگہ اس پہ ڈالی جو کچھ مچتا ہوا چائے کے گھونٹ بھر رہا تھا اس کی نگاہیں سامنے دیوار پہ جمی تھیں اور وہ کسی گہری سوچ میں الجھا تھا۔

”بس نسیمہ کے ساتھ کنویں تک گئی تھی۔“ وہ پلکیں جھکائے کہنے لگی۔ بدر کے سامنے اس کی پلکیں ڈوڑخو جھک جاتی تھیں۔

”اتنی دیر کر دی کنویں پہ۔ بدر تمہارا بوجھ رہا تھا۔“
زہرہ کا چہرہ کھل اٹھا، اس نے بے اختیار نگاہیں اٹھا کر بدر کو دیکھا۔ وہ اسی مغرور بے نیاز انداز میں چائے کے گھونٹ بھر رہا تھا۔ کیلے سیاہ بال ہاتھ پہ بکھرے تھے اور آستینیں کمنیوں تک چڑھا رکھی تھیں شاید وہ ابھی ناکر آیا تھا۔

پتا نہیں وہ اس کا پچھتاہی تھا یا چاچی ایسے ہی اس کا دل رکھتے کو کہتی تھی۔
”بس چاچی، وہ ٹھاکر شیکھر کی بیوی مل گئی تھی راستے میں وہ پرانے قبرستان لے گئی تو وہیں دیر ہو گئی۔“

بدر نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”تم پرانے قبرستان کیوں گئیں؟“
”میں نہیں گئی، ٹھاکر شیکھر کی بیوی لے گئی تھی۔ وہ گوری ٹھا کر گئی۔“ وہ نظریں جھکائے بدر کے نزدیک تھوں کو دیکھ رہی تھی۔

”ٹھاکر شیکھر کی بیوی؟“ بدر ایک دم چونکا۔ ”وہ جو انگلستان سے آئی ہے؟“
”ہاں۔“ زہرہ نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا، وہ اتنا وجہ نہ دیا کہ وہ زیادہ دیر اسے دیکھ نہ سکی۔

”وہ واپس نہیں گئی ابھی تک؟“
”نہیں، ابھی تک تو ادھر ہی ہے مگر خوش نہیں لگتی۔“

”ظاہر ہے اس کا شوہر مرا ہے۔“ وہ بظاہر لا پرواہی سے کہہ کر چائے کے گھونٹ بھرنے لگا۔

”تم نے اس انگریز لڑکی کو دیکھا ہے بدر؟“
”لڑکی؟“ بدر کو بس اس لفظ پہ حیرت ہوئی تھی۔
”ٹھاکر شیکھر کی ٹھا کرانی لڑکی ہے؟“

”ہاں۔“ زہرہ ہنس دی۔ ”اور اتنی حسین کہ تم دیکھتے رہ جاؤ۔“

”میں کیوں دیکھتا رہ جاؤں؟“ وہ ناگواری سے شانے جھٹک کر رہ گیا۔

”نہیں بدر! اس کا واقعی شیکھر سے کوئی جوڑ نہیں تھا۔ شیکھر تو چالیس کے قریب تھا، سانولا سا، معمولی قد کا اور وہ تو مہارانی ہے، لوگ کہتے ہیں برطانیہ کی شہزادی ہے۔“

”ہوگی۔“ اس نے بے نیازی سے شانے اچکائے۔

”مگر وہ خوش نہیں لگتی۔ وہ کہتی ہے اسے ٹھاکروں نے قید کر رکھا ہے اور اسے واپس انگلستان نہیں

جانبے دے رہے۔

”تو کس نے کہا تھا اسے راجپوتوں میں شادی کرے؟ کیا برطانیہ میں لڑکے ختم ہو گئے تھے؟ اب خود بھگتے بد رنے اکھڑے اکھڑے انداز میں کہہ کر پیالی خالی کر کے رکھ دی۔ اس کے مغرور چہرے پہ تناؤ سا آگیا تھا۔

”ہاں پتا نہیں اس نے شیکھر سے شادی کیوں کی۔“

”اور یہ پرانے قبرستان کا کیا قصہ ہے؟ تم کیوں گئیں اور ہر؟“ وہ ماتھے پہ بل ڈالے پوچھ رہا تھا۔ یہ حق جتنا ”عرب جانا انداز ہرہ کو بیش اچھا لگتا تھا۔“

”مایا دیوی لے گئی تھی، کہتی تھی یہ کوئی انسان ہے جو بھوت کا ڈھونگ رہا رہا ہے اور ہم سب ایسے ہی ڈر رہے ہیں۔ وہ قبرستان دیکھتا چاہتی تھی۔ بس اسی کے ساتھ میں چلی گئی۔“

”زیادہ میل جول نہ رکھا کرو راجپوتوں کی عورتوں سے، یہ اچھے لوگ نہیں ہیں۔“

وہ خفگی سے کہتا اٹھ کھڑا ہوا۔ زہرہ نے سراٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ اس سے خاصا اونچا تھا، لمبا چوڑا وچہرہ مڑو جس کے ساتھ وہ خود کو ہمیشہ محفوظ تصور کرتی تھی، مگر جانے وہ واقعی اس کا پوچھتا تھا یا چاچی خود ہی۔ وہ سوچتے ہوئے اس کو لمبے ڈگ بھر کر دھرتے دیکھتی رہی۔

روپ وٹی بہت خاموشی سے برتن دھو رہی تھی۔ اس کا ذہن کہیں دور الجھا تھا۔

”روپا دیوی، کدھر گم ہو؟“ رتن بوا رسوئی میں آئی تو اسے یوں کم صمیمانی میں ہاتھ ڈالے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

”ہوں؟“ روپا چونکی، پھر بے دلی سے سرٹھی میں ہلا دیا۔ ”کچھ نہیں رتن بوا۔“

”کسی نے کچھ کہا ہے؟“ رتن بوا اس کے قریب آئی اور بغور اس کا چہرہ دیکھا۔

”بس بوا، مجھے مایا دیوی کی حالت پہ ترس آتا ہے

۔“

”اسے کیا ہوا مایا دیوی کو؟“ رتن بوا آخری عمر میں بھی اپنی تجسس فطرت کے ہاتھوں مجبور تھی، مارے تجسس کے وہیں بیٹھ گئی کیونکہ روپا کا انداز اسے کچھ اور بتا رہا تھا۔

”بڑے ٹھاکر کی نظر ٹھا کر شیکھر کی جائیداد ہے، اور وہ مایا دیوی کو حویلی میں محصور کر کے رکھنا چاہتے ہیں۔“

”رتن بوا، کابکارہ گئی۔“

”مجھے کس نے کہا؟“

”خود مایا دیوی کہتی ہے۔ شاید ٹھاکر اس کی زمین ہتھیانا چاہتے ہیں اور اسی لیے وہ مایا دیوی کو واپس انگلستان نہیں جانے دے رہے۔“

”ہائے بھوان! ایسے نہ بول روپا، ٹھاکر جیسے بھی ہیں ٹھاکرانی کو عزت دیتے ہیں، آخر وہ شیکھر کی دہن تھی۔“

”تجھے بھی پتا ہے کہ ٹھاکر کیسے ہیں اور مجھے بھی پتا ہے۔ اب تو دیکھتا بوا، یہ مایا دیوی کو کسی بہانے حویلی میں محصور کرنے کی کوشش کریں گے۔“ روپ وٹی دل کا بوجھ ہلکا کر کے مطمئن سی برتن دھونے لگی، جبکہ رتن بوا کو تو ہول اٹھ رہے تھے۔

انکشاف چھوٹا نہ تھا، گاؤں والے تو بس اتنا جانتے تھے کہ ٹھاکروں کے آپس کے تعلقات بہتر ہیں، مگر اب یہ نیا انکشاف خاصا خطرناک تھا۔ اگر ٹھاکر اپنی حویلی میں مایا دیوی کے خلاف کوئی سازش کر رہے تھے، تو یہ خبر ان کی برسوں کی ساکھ کو توڑنے کے لیے کافی تھی۔

رتن بوا کو اب جلد از جلد اپنے دل کا یہ بوجھ ہلکا کرنا تھا، سو اس نے فوراً ہی گھر جا کر اپنی بیٹی کو بتادیا۔ جس نے چار مزید لوگوں کو اور یوں۔

شام تک آدھے بیلی راجپوتوں کو خبر مل چکی تھی کہ راجپوت اپنی انگریز بہو کی جان کے درپے ہیں اور اس کی جائیداد ہتھیانے کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔

تنہا آج کی عمر میں
محبور تھی، مگر
کانڈاز اسے کچھ اور

دیکھنا چاہتا ہے
رکے رکھنا چاہتا ہے

اگر اس کی زمین
دیوئی کو واپس

اگر جیسے بھی ہیں
کھڑکی کی دھن

دور مجھے بھی ہے
بائے حویلی

روپ وٹی
نے لگی جبکہ

س اتنا جانتے
زین ہیں مگر

رٹھا کر اپنی
رہے تھے

لیے کافی تھی۔
بوجھ بھارت

نادیا۔ جس
ہلکی تھی کہ

س اور اس
ہیں۔

دروازے پہ دم دم دستک ہوئی۔

مایا نے بال سنوارتے ہوئے ”آجاؤ“ کہا۔ وہ
تکھار میز کے سامنے بیٹھی ڈھیلی سی چوٹی گوندھ رہی
تھی۔

دروازہ ہلکی سی چرچاہٹ کے ساتھ کھلا۔

روپ وٹی نے چوکھٹ پہ کھڑے کھڑے اندر بھاٹکا

”مہارانی جی، بڑے ٹھا کر شام کی چائے آپ کا
انتظار کر رہے ہیں۔“ چوٹی گوندھتے اس نے مصروف
انداز میں شخص سر کو جنبش دینے پہ اکتفا کیا۔

روپ وٹی سر جھٹکائے دروازہ بند کرتی واپس پلٹ
گئی۔

لبی سنہری چوٹی اس نے گردن کے دائیں آگے کو
ڈال دی، سفید ساڑھی کا پلو درست کیا، اور آئینے میں
خود پہ ایک آخری نگاہ ڈال کر باہر آگئی۔

اپنی ازلی نزاکت سے زینے اتر کر وہ نیچے آئی تو ہال
کمرہ خالی پڑا تھا، ”یقیناً“ ٹھا کر گھونٹا تھ باہر آمدے میں
اس کا انتظار کر رہے تھے۔

وہ میز ٹیوں سے اتر کر آگے بڑھتے بڑھتے رک
گئی۔ میز ٹیوں کے اس طرف ایک بڑا سا پیانو رکھا
تھا۔

مایا کسی معمول کی طرح اٹھتی پیانو تک آئی۔ اس کا
کیس سیاہ لکڑی کا بنا تھا، اور اوپر دیوار پہ ہم رنگ لکڑی
کا بیاضی آئینہ نصب تھا۔

اس نے ہاتھ سے پیانو کی کیز کو ہلکا سا چھوا، پھر ایک
ٹی رو میں انگلی تمام کیز سے گزاری۔

خاموش فضا میں انوکھا سا رنگ گونج اٹھا۔
مایا نے چونک کر سر اٹھایا۔ سامنے آئینے میں اس کا

عکس نمایاں تھا۔ بالوں میں پروئی موتیوں کی لڑی کے
میں وسط میں لگی ایک بد صورت گرہ۔ اس کی انگلی
خود بخود اس گرہ پہ جا پھری۔

سامنے لگا آئینہ یک دم جیسے اسکرین بن گیا، ماضی کی
ایک یاد فلم کی طرح اس پہ چلنے لگی تھی۔ اسے اس

اسکرین میں ایک منظر دکھائی دے رہا تھا۔ اونچی چوٹی سی
چڑھائی، سرسبز پہاڑی اور ہاتھ میں ڈالے، اوپر چڑھتے
دو نفوس اور پیچھے ڈھلوزی کا ڈھنسا سورج۔

”شام ہو رہی ہے، واپس چلنا چاہیے۔“ وہ دونوں
ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے اس سرسبز پہاڑی پہ اوپر
چڑھتے جا رہے تھے، جب شمشکھو نے رک کر کھائی پہ
بندی کھڑی دیکھی۔

”میں سورج ڈوبتے دیکھنا چاہتی ہوں۔ آج ہماری
ڈھلوزی میں آخری رات ہے، یہ ہمارے بنی مومن کا
آخری غروب آفتاب ہے۔“

اس نے ہلکا پنک سوئیٹر پہن رکھا تھا، شہد رنگ سبیل
شانوں پہ بکھرے تھے۔

”نہیں ڈھلوزی اتنا پسند آیا کیا؟“
”نہیں“ مجھے تم پسند آئے“ اور دونوں ہنس
پڑے۔

”ہم اگلی دفعہ“ وہ کہتے کہتے ایک دم رک
گئی۔ اسے لگا اس نے کسی کی کراہ سنی ہے۔

شمشکھو ہنستے ہوئے کچھ کہتے کہتے چند قدم آگے
بڑھ گیا تھا، اسے ساتھ نہ پا کر پیچھے دیکھا، وہ وہیں کچھ
کنفیوزی کھڑی تھی۔

”آؤ ناؤ رنگ! رک کیوں گئیں؟“
”ایسے ہی۔“ وہ سنبھل کر مسکراتی دو قدم آگے
بڑھی اور پھر سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

وہ دونوں ہنستے ہوئے باتیں کرتے آگے بڑھتے
رہے۔ اسی دوران مایا نے دوسرے ہاتھ سے سونٹری
جیب سے چابیوں کا چھانکال کر غیر محسوس انداز میں
زمین پہ گرا دیا۔

سڑک عبور کر کے وہ دونوں اپنے جنگل کے گیٹ کی
طرف آگئے وہاں قطار میں چند جنگل بنے تھے جو دیلی
عمر تر اور بمبئی کے امراء کی ملکیت تھے جنہاں وہ
ہر سال چھٹیاں منانے آتے تھے۔

چوکیدار نے گیٹ کھولا۔ شمشکھو اندر داخل
ہوا، مایا نے اس کے پیچھے قدم بڑھاتے ہوئے جیب

میں ہاتھ ڈالا اور رک گئی۔

”میری الماری کی چابیاں، شیکھر!“ اس نے

پاکٹ الٹ دی۔ وہ خالی تھی۔

”کدھر گئیں؟“ وہ بھی رک گیا۔

”اوہ۔ جس پتھر پہ ہم بیٹھے تھے وہیں میں نے نکالی

تھیں، اوہ رہی رہ گئی ہوں گی۔ میں ابھی لے کر آتی

ہوں۔“

وہ جانے کو پلٹی تو اس نے روکا۔ ”میں بھی چلتا

ہوں، نکلی نہ جاؤ۔“

”اوہ ڈارلنگ! دوست ہی تو لگیں گے۔ تم اندر جا کر

فریش ہولو، میں بس ابھی آئی۔“ پھر جاتے جاتے

مڑی۔ ”اور اگر دیر ہو جائے تو پریشان نہ ہونا۔“

”دیر ہو جائے گی کیا؟“

”بتایا تھا، میں ڈھوڑی گاڈوینا سورج دیکھنا چاہتی

ہوں۔“ مسکرا کر اس کا شانہ تختہ پٹا کر وہ آگے سڑک پہ

چلی گئی۔ شیکھر کشش میں کچھ دیر وہاں کھڑا رہا، پھر

اندر کو ہولیا۔

ملایا تیز قدموں سے اس جگہ واپس آئی، جہاں اس

نے چابیاں گرائی تھیں، جھک کر کچھا اٹھایا اور جیب

میں ڈالتی نیچے اترتی گئی۔

شام کی روشنی ابھی باقی تھی۔ سورج کی کرنیں ابھی

تک درختوں سے لپٹی تھیں۔ وہ بغیر وقت کے دور دور

تک دیکھ کتی تھی۔

اب وہ سڑک سے اتر کر پہاڑی کی ڈھلان اترنے

لگی۔ اسی جگہ کے آس پاس اسے کسی کے کراہنے کی

آواز سنائی دی تھی۔

وہ احتیاط سے سب سے سب سے قدم رکھتی، اوہ

اوہ دیکھتی اتر رہی تھی۔ وہ جو بھی تھا، اسے اوہ رہی

اس پاس ہونا چاہیے تھا۔

اور پھر وہ اسے نظر نہ آئی۔

چند درختوں کے نیچے گرا ایک ندھال وجود۔

ملایا آہستہ آہستہ درختوں کا سہارا لیے، خشک پتوں پہ

قدم رکھتی اس تک آئی۔

وہ ایک درخت کے تنے کے ساتھ ندھال سا گرا

کراہ رہا تھا۔

وہ اس کے سامنے والے درخت کی اوٹ میں سے

سر نکالے اسے دیکھنے لگی۔

پہلی نظر میں تو اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اسے ہوا کیا

ہے۔ وہ ستا میں اٹھائیں برس کا خوش شکل مرد تھا۔

چہرے پہ ہلکی ہلکی شیو بڑھی ہوئی تھی۔ اس کا رنگ

بالکل زرد سا رہا تھا اور وہ مسلسل درد سے کراہ رہا تھا۔

”اے۔ کیا ہوا ہے تمہیں؟“ وہ اب درخت کی

اوٹ سے نکل کر اس کے سامنے آگئی۔ زخمی نے شاید

سنائیں تھا، وہ آنکھیں تکلیف کی شدت سے بند کیے

کراہ رہا تھا، وہ اس کے قریب آئی، اور اس کا شانہ

ہلایا۔

اس نے آنکھیں کھولیں اور سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔

سنسان درختوں کے درمیان ایک دراز قد، سنہری

چوٹی والی لڑکی اس کے سامنے کھڑی تھی۔

”مسٹر! کیا ہوا ہے؟ کیوں بچوں کی طرح رو رہے

ہو؟“ وہ چہرے پہ ناگواری لیے پوچھ رہی تھی۔

وہ کچھ کہنا چاہتا تھا، مگر شاید اس میں لمبی بات کرنے

کا دم نہیں تھا۔ اس نے ایک نظر ملایا کو دیکھا اور دوسری

نظر اپنے اوپر درخت کی لٹکتی شاخ پہ ڈالی۔

ملایا نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں سر اٹھایا۔

شاخ پہ ایک سیاہ رنگ کا سانپ پھن پھیلائے بیٹھا

تھا۔

”اوہ۔“ سارا معاملہ اس کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ وہ

بہت آرام سے جھکی اور ایک وزنی پتھر اٹھایا، پتھر شاخ کو

پکڑ کر جھٹکا دیا۔ سانپ نیچے آن گرا اور سرے ہی لمحے وہ

بہت اطمینان سے وزنی پتھر سے اس کا سر پچل چکی

تھی۔

”اب بتاؤ، کدھر کاٹا ہے تمہیں سانپ نے؟“ وہ

گھٹنوں کے بل اس کے قریب بیٹھ گئی اور زخمی کا ہاتھ

اس کی پٹنڈی سے ہٹایا۔

وہاں نچنے کے قریب۔ سانپ کے کانٹے کا نشان تھا

زخم بالکل تازہ تھا۔

”پہلی بات تو یہ کہ تمام سانپ زہریلے نہیں

ہوتے۔“

ہوتے، سو ڈرو مت۔“ اس نے رومال نکال کر زخم سے کچھ اور کس کر باندھ دیا اور پھر زخم پہ اپنا چہرہ جھکا دیا۔
”کیا کر رہی ہو؟“ زخمی گھبرا کر پیچھے ہونے لگا۔
”چپ رہو۔“ وہ ناگواری سے جھڑک کر دوبارہ زخم پہ جھکی اور قدیم ویڈیوں کے سے انداز میں چوس کر زہر نکال لیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اس کے زخم کو صاف کر رہی تھی۔

”میں کسی کو بھیج کر تمہیں ہسپتال پہنچا دیتی ہوں، مگر تمہیں سونا نہیں ہے، سو گئے تو مر جاؤ گے۔ ویسے کس نے کہا تھا اس سے ڈلموزی کے جنگلوں میں بھٹکتے رہو۔“ اس کے زخم کا آخری جائزہ لیتی وہ کہہ رہی تھی۔ زخمی کچھ کرب سے مسکرا دیا۔

”آپ بھی تو اسی سے اوھر بھٹک رہی تھیں۔“
”مگر مجھے یہ سانپ نہیں کاٹتے۔“
”آپ چھا؟ وہ کیوں؟“ وہ پہلے سے بہتر محسوس کر رہا تھا۔

”یہ جس نسل کا سانپ ہے اس کے بارے میں جانتے ہو؟“ اس نے سر پچلے سانپ کے جانب اشارہ کیا۔
اس نے نفی میں سر ہلادیا، نگاہیں مسلسل مایا کے چہرے پہ تھیں۔

”یہ ڈلموزی اور شملہ میں پائے جانے والے خاص نسل کے سانپ ہوتے ہیں اصل نام مجھے یاد نہیں، مگر ان کے بارے میں ایک صدیوں پرانا ہیچنڈ مشہور ہے کہ یہ مہارانیوں اور مہاراجوں کو نہیں ڈستے اور ان کا احترام کرتے ہیں۔ میں بلی راجپوتوں کی مہارانی ہوں، یہ مجھے نہیں ڈس سکتا تھا۔“ وہ فخر سے مسکراتے ہوئے ہاتھ جھاڑتی اٹھنے لگی۔ ”چلتی ہوں۔“

”نہیں رکو۔“ اس نے ہاتھ برہا کر مایا کو روکنا چاہا، مگر وہ کھڑی ہو رہی تھی، اس کے ہاتھ میں موتیوں کی لڑی آگئی، مایا اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ گئی۔
”میرا شوہر میرا انتظار کر رہا ہوگا، مجھے جانا ہے۔“ اس نے نرمی سے سمجھانا چاہا۔
”میری جان بچانے کا شکریہ۔“ لڑی ابھی تک اس

کے ہاتھ میں تھی، وہ نیم غنودگی کی کیفیت میں ڈوب رہا تھا۔
”مگر مجھے روک کر تم میری جان خطرے میں ڈال رہے ہو۔“ وہ مسکراتے ہوئے جیسے اس کی حالت سے محفوظ ہو رہی تھی۔ زخمی نے آہستہ سے نفی میں سر ہلادیا۔

”مجھے۔ مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔“
”مجبوری ہے، تم۔“ مایا نے اس کا ہاتھ لڑی سے ہٹایا، اور پھر جہاں اس شخص نے ہاتھ رکھا تھا وہاں سے اس نے پھینچ کر ایک جھٹکے سے لڑی کو توڑ دیا۔ چپکے دیکتے موتی نیچے گرنے لگے۔

جب چند موتی گر گئے تو اس نے وہاں پھر سے گرہ لگا دی۔ وہ نیم غنودگی اور نقاہت سے اسے دیکھ رہا تھا۔
”جن پہ تم نے ہاتھ رکھا، وہ تمہارے ہوئے یہ شاہی خاندانوں کا دستور ہوتا ہے۔“ مٹی میں گرے وہ سارے موتی اس نے مٹھی بھر کر اٹھائے، بہت سی مٹی بھی ان کے ساتھ اس کے ہاتھ میں بھر گئی۔ ریت مٹی میں لتھڑے موتی اس نے اس شخص کی جیب میں ڈال دیے اور ہاتھ جھاڑتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”مجھے جنگلوں میں بھٹک کر لوگوں کی جان بچانے کا قطعاً کوئی شوق نہیں ہے، نہ ہی مجھے تم سے کوئی ہمدردی ہے۔ مجھے ڈلموزی کا ڈوٹا سورج دکھانا تھا، جس کے لیے قدرت نے یہ بہانا بنا دیا۔ ہاں اوپر جا کر کسی کو نیچے بھیج دوں گی، اگر یاد رہا تو۔“ وہ اسی بے نیازی سے کہہ کر مٹی اور واپس اوپر چڑھنے لگی۔

”سنو۔“ اس نے پیچھے سے پکارا۔
مایا جیسے بادل خواستہ رگی۔
”تم تون ہو؟“ غنودگی میں ڈوبنے سے پہلے وہ بشکل بول رہا تھا۔

درخت کی لکڑی پہ ہاتھ رکھے، مایا نے اداس مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا، ”میں بلی راجپوتوں کی ملکہ ہوں، اور کچھ نہیں۔“ اس کی سنہری آنکھوں میں ڈوبے سورج کا عکس جھلکا رہا تھا۔
وہ ابھی تک ایسے ہی نیم غنودگی میں ڈوبے ہوئے دیکھ

کی کیفیت میں ڈوب رہا
ان خطرے میں ڈال
ہے اس کی حالت سے
ستہ سے نفی میں سر

س کا ہاتھ لڑی سے
ہاتھ رکھا تھا وہاں
ٹٹے سے لڑی کو
لگے

وہاں پھر سے گرہ
سے دیکھ رہا تھا۔
ارے ہوئے یہ
مٹی میں گرے وہ
نئے بہت سی مٹی
مر گئی۔ رت مٹی
کی جیب میں ڈال

کی جان بچانے کا
نھے تم سے کوئی
ج دیکھتا تھا جس
اوپر جا کر کسی کو
بے نیازی سے

سے پہلے وہ

یا نے او اس
ن راجپوتانہ کی
ن آنکھوں میں
سے اسے دیکھ

”اٹھو۔ تمہارا نام کیا ہے؟“
اس نے غودگی میں جانے سے قبل بس آخری
دھبہ بکھولے۔
”بدرد غاغان۔“ اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔
مایا نے لاپرواہی سے شانے اچکائے اور اپنے جو کرز

کی بند سے واپس اوپر چڑھنے لگی۔
بے دھیانی میں پھر سے اس کی انگلیوں نے پناہ کی
کیر کو چھینا تھا۔ خاموش فضا میں پھر سے راگ گونج
اٹھا وہ جیسے چونک کر حال میں واپس آئی۔
تد اور آئینے میں اس کا عکس اب بھی وہیں تھا؟
پسے کوئی خوب صورت تصویر ہمیشہ کے لیے امر کر دی
تھی ہو۔

اس نے سر جھٹکا ساڑھی کا پلو درست کیا اور اسی پر
تمکنت انداز میں گردن اوپر کی اٹھائے باہر چلی آئی۔
برآمدے میں کرسیاں میز کے گرد بچھی تھیں وہاں
ٹھاکر گھوٹا تھا اور گویال بیٹھے تھے مایا کو آدھ دیکھ کر وہ
دونوں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔
”آئیے مایا دیوی۔“

وہ اسی سپاٹ چہرے کے ساتھ ٹانگ پہ ٹانگ
چڑھائے کرسی پہ بیٹھ گئی۔ ”چائے پیجئے“ گویال نے
ایک پیالی اس کے سامنے کی۔ یہ وہ واحد عورت تھی
جس کے لیے گویال یہ سب کر سکتا تھا۔
”شکریہ۔“ مایا نے پیالی اٹھالی۔

”مایا دیوی! آپ نے جائیداد بکوانے کی بات کی
تھی۔“ ٹھاکر گھوٹا تھا نے گلا کھنکھار کر گفتگو کا آغاز کیا۔
ان کا کپ ان کے سامنے ان چھوڑ رکھا تھا۔ ”میں نے
ایک دو فریقوں سے بات کی ہے۔ اس میں کچھ عرصہ
لگ جائے گا۔“

وہ خاموشی سے انہیں دیکھتی مگر مچائے کے
گھونٹ حلق میں اتارتی رہی۔

”سروالی زمین خریدنے میں دو فریق دلچسپی رکھتے
ہیں میں ابھی ان سے معاملات طے کر رہا ہوں۔
کانڈرات وغیرہ بھی تیار ہو رہے ہیں پٹواری سے بھی

بات کھلی ہے۔“

اس نے کپ خالی کر کے میز پر رکھ دیا۔ سب بھست
توجہ سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔

”کچھ عداوتی کارروائی مزید ہوگی جس کے لیے آپ
کو واپس برطانیہ جانے میں کچھ وقت لگ سکتا ہے مگر
میری کوشش ہوگی کہ زیادہ تاخیر نہ ہو اور جیسے آپ
چاہتی ہیں ویسے ہی ہو۔ باقی جب تک آپ کی مرضی
آپ حویلی میں رہیں گاؤں میں محو میں پھر میں زمین
کے معاملات میں خود دیکھ لوں گا“ آپ کو محض دستخط
کرنے ہوں گے کیا خیال ہے آپ کا؟“

”یہ بلی راجپوتانہ کے بھوت کا کیا قصہ ہے؟“
سوال ان دونوں کی توقع کے اس قدر برعکس تھا کہ
ٹھاکر گھوٹا تھا نے حیرت سے دیکھا۔

”بلی راجپوتانہ کا بھوت؟“ وہ کیا پوچھ رہے تھے اور
وہ کیا پوچھ رہی تھی۔

”جی“ بلی راجپوتانہ کا وہ بھوت جو روز رات کو
مسلمانوں کے قبرستان میں گھومتا پھرتا ہے۔“

”مسلمانوں کے پرانے قبرستان یہ سایہ سے
جی۔“ گویال ٹھاکر صاحب سے پہلے ہی بول اٹھا، کوئی بھٹکی
ہوئی آتما ہے“ کالی عرصے سے رات کو گاؤں میں بھٹکی
پھرتی ہے“ اب تو گاؤں والوں نے اس طرف جانا بھی
چھوڑ دیا ہے۔“

”مگر میں نے سن کہ بدرد غاغان کہتا ہے وہ کوئی
کرمنل ہے جو اپنے کسی جرم کا ثبوت ملانے کے لیے
بھوت کا ڈھونگ رچا رہا ہے۔“

”بدرد غاغان تو خود بھی۔“ کوئی مٹی گلی اس کے
لبوں تک آتے آتے رکی شاید اسے مایا کی وہاں
موجودگی کا احساس ہو گیا تھا۔ ”وہ سایہ ہے جی“ آپ
مسلوں کی باتوں پہ مت جائیں یہ تو سامنے کی بات
ہے کہ وہ سایہ ہے۔“

”مگر سٹنگ۔“ مایا گردن موڑ کر باغیچے کو دیکھنے
لگی۔

”تمہارا موسم ہی گیا ہے“ آپ کے بلی راجپوتانہ
میں پھول بت پیارے لگتے ہیں۔“ وہ دھجھی سے

پھولوں کو سراہتی کہہ رہی تھی۔ جائیداد کے معاملات اس کی معمولی سی توجہ کے بھی حامل نہیں تھے۔
ٹھا کر رگھوناتھ گہری سانس بھر کر پیچھے کو ہو گئے۔
بکھی بکھی مایا فرینڈس انہیں اسی طرح بہت بے عزت کر دیا کرتی تھی۔

”بال بنادوں، مہارانی جی؟“ روپا اسے بالکونی میں دیکھ کر اس طرف آگئی۔
وہ بالکونی میں کرسی ڈالے کتاب پڑھ رہی تھی۔ سرخ سامنے کو تھا جہاں سنہری گندم کی تیار فصل کے گھیت دکھائی دے رہے تھے۔

روپا کی آواز پر اس نے سر اٹھایا۔ وہ ہاتھ میں کنگھا لیے منتظر کھڑی تھی۔ ”ہاں، چولی بنادو۔“ اس نے نگاہیں کتاب پر جھکا دیں اور ایک ہاتھ سے ڈھیلے سے جوڑے کی گرہ کھول دی۔ سارے بال کسی آبشار کی طرح کمر پہ گرتے چلے گئے۔

روپا بہت نرمی سے اس کے سنہری بال سمیٹنے لگی۔ مایا پھر سے کتاب میں منہمک ہو گئی تھی۔
”کل سویرے بڑے میدان میں ہمارا میلہ لگ رہا ہے۔“ اس کے بال اٹھے کرتے روپا کو اچانک جیسے یاد آیا۔

”اچھا۔“ وہ کتاب پڑھتی رہی۔

”نیزہ بازی کا مقابلہ بھی ہو گا۔“

”ہوں۔“ اس نے صفحہ پلٹایا۔

”پورے گاؤں کو اس مقابلے کا انتظار ہے، سال بھر سے۔ بڑا کانٹے دار مقابلہ ہو گا جی اس دفعہ۔“ روپا اس کے بالوں میں کنگھا اوپر سے نیچے لاری تھی۔ اس دفعہ مایا نے جواب بھی نہیں دیا۔

”چھوٹے ٹھا کر گوپال راج بھی حصہ لے رہے ہیں، اب تو اس مقابلے کی پار جیت پہ بڑی بڑی شرطیں لگ چکی ہیں۔“ وہ اب چولی گوندھ رہی تھی۔
”گوپال کی جیت پہ؟“ غیر دلچسپی سے محض روپا کا دل رکھنے کو مایا نے پوچھا۔

”نہیں دیوی جی، بدر غازان کی جیت پر گوپال تو اس سے پچھلے چار برس سے ہار رہے ہیں۔“
وہ کتاب بند کر کے ایک جھٹکے سے مڑی، چولی روپا کے ہاتھ سے پھسل گئی، سارے بل کھلتے چلے گئے۔
”بدر غازان گوپال کو ہراتا ہے؟“ بے اختیار وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”ہاں جی، پچھلے چار برسوں سے۔ چھوٹے ٹھا کر کو بہت غصہ ہے اس بات کا، اس دفعہ انہوں نے پوری تیاری کی ہے، بھری پنجائیت میں دعو ابھی کیا ہے کہ اس دفعہ وہ بدر غازان کو ایسی شکست دیں گے کہ اس کی اگلی سات نسلیں یاد رکھیں گی۔“

”پھر؟“

”پھر بدر نے ایک محفل میں کہا، اس دفعہ جو شکست ٹھا کر گوپال رام کو ملے گی، اس کی اگلی کیا، پچھلے بھی سات نسلوں کو خبر مل جائے گی۔“ روپا کہہ کر کھلکھلائی، پھر ایک دم سر جھکا کر خاموش ہو گئی۔
”میں جانتی ہوں تمہاری ہمدردی زہرہ کے بچا زاد کے ساتھ ہے، اچھی بات ہے۔ میں یہ مقابلہ دیکھنا چاہوں گی۔ کب ہے؟“

”کل سویرے۔“ روپا شہ پاکر جوش سے اسے تفصیلات بتا رہی تھی مگر وہ کسی اور ہی سوچ میں ڈوبی کھڑی رہی۔

گاؤں کے بڑے میدان میں رنگ و بو کا سیلاب اٹھ آیا تھا۔ روایتی انداز میں سجا میلہ اور خوشی اور جوش چروں پہ لیے سجے سنورے دیہاتی۔ وہ واقعی ان کا سب سے حسین شہوار تھا۔
مایا روپ وٹی کے ساتھ بصد اصرار مقابلہ دیکھنے آئی گئی تھی۔

”یہ نیزہ بازی کیا ہوتی ہے روپا؟“ وہ مقابلے میں دلچسپی لیے بغیر ساتھ موجود روپ وٹی سے پوچھنے لگی۔
”وہ جی۔“ روپا ہچکچاتی ”وہ دیکھیں نا، پچھی تپ کو خود میں سمجھ آ جائے گا۔“

جیت پہ گوپال تو اس

سے مڑی، چوٹی روپا
کھلتے چلے گئے
بے اختیار وہ اٹھ

چھوٹے ٹھاکر کو
جنہوں نے پوری
بھی کیا ہے کہ
س کے کہ اس کی

اس دفعہ جو
اگلی کیا، پھیلی
روپا کہہ کر
ہوئی۔

کے پتھا زاد
مقابلہ دیکھتا

سے اس
میں ڈوبی

اب اند
رجوش
ان کا

دیکھنے

میں

پ کو

اور اسی بل ایک طرف سے الٹی زہو نکل کر ان
کے قریب آئی۔

”ٹھاکران، آپ بھی آتی ہیں مقابلہ دیکھنے؟“ وہ
اسے دیکھ کر حیران بھی تھی اور خوش بھی۔
میلانے مسکرا کر سر کو خم دیا۔

اس نے آج بھی بے داغ اہلی سفید ساڑھی پہن
رہی تھی۔ آنکھوں کے گرد بہت گہرا کاجیل ڈالا تھا،
پسے کل رات میں چمکتا سورج۔

”بڑا کانٹے دار مقابلہ ہو گا جی آج۔“ بڑے سے
میدان میں بھاگتے گھوڑوں کو دیکھ کر زہو کہہ رہی
تھی۔ آج تو اس کے چہرے پہ اور ہی رنگ بکھرے
تھے۔

میلانے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں گھوڑے
بھاگتے تیزوں سے میٹھیں اکھاڑتے گھڑ سواروں کو
دیکھا اور پھر گہری سانس بھری۔

”یہ تو tent pegging ہے۔“
روپا نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ ”آپ کو اس
میل کا علم ہے جی؟“

”ہاں، مگر میری جینی نے مجھے یہ نہیں بتایا تھا کہ
tent pegging تیز بازی کو کہتے ہیں۔“

سانے دو گھوڑے، ایک سفید اور ایک سیاہ بھاگتے
آ رہے تھے۔ سیاہ گھوڑا گوپال راج کا تھا وہ پہچان گئی
تھی۔

”تیز بازی کا اور بچن مسلم فوجوں کی شب خون کی
ٹنگ تھی۔“ جب وہ موڑ میں ہوتی تو بہت بولا کرتی
تھی۔ ”اس ہیل میں تو صرف میٹھیں گاڑی جاتی ہیں،
پورے پورے جیسے نہیں لگائے جاتے، مگر درحقیقت
شب خون میں مسلمان فوجیں رات کو دشمن کے
اجلانے پہ اپنے تیز ترین گھڑ سوار دشمن کی کمین گاہ
میں بھیجا کرتی تھیں جو اپنے نیزوں کی مدد سے ان کے
پٹھوں کے میٹھیں اکھاڑ دیتے تھے، پھر پٹھوں کو اکھٹا
کر کے آگ لگا دی جاتی تھی اور سویا ہوا دشمن۔“

بولتے بولتے وہ رنگ گئی۔ گوپال کے ساتھ والا سفید
گھوڑا ابھی اس کے سامنے سے گزر کر گیا تھا۔ یہ

چہرہ اسے ڈھوڑی کے جنگل میں گرا زخمی یاد آیا۔
”یہ سفید گھوڑے پہ کون ہے؟“

”بدر ہے، میرے چچا کا بیٹا۔“ زہو بہت سہجے
سے اسے دیکھ رہی تھی۔

میلانے کی نگاہیں دور تک سفید گھوڑے کے پیچھے گئی
تھیں۔ گھڑ سوار بہت مہارت سے اسے دوڑانا آب
میٹھیں اکھاڑتا جا رہا تھا۔

پھر جب تیز بازی کا مقابلہ ختم ہو گیا اور پانچویں
برس بھی ٹھاکروں کے لڑکے کو مسلمانوں کے لڑکے
نے شکست دے دی، اور تالیوں اور نعروں کا شور
قدرے تھما تو کتنی ہی دیر بعد اس نے سفید گھوڑے کی
لگام تھامے اس اونچے لمبے مغزور دھتے والے تیز باز کو
اپنی جانب آتے دیکھا۔ شاید زہو کو دیکھ کر ادھر گیا
تھا۔

ان کے قریب آتے اس کے قدم سست پڑ گئے، وہ
حیرت زدہ سا ملایا کو دیکھ رہا تھا، پھر گھوڑے کی لگام تھامے
آہستہ آہستہ چٹان تک آیا۔

”آپ؟“ مغزور تے ہوئے نقوش دھتے پڑ گئے
تھے، وہ شاید اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔
”تم سانے کے کانٹے سے قے گئے؟“ میلا مسکرائی،
وہی محفوظ سی مسکراہٹ۔

بہت جیسے سے ڈھوڑی کی ڈوبی شام دونوں کے
آس پاس اتر آئی تھی۔
”آپ۔۔۔ ادھر؟“

”تم نے مجھے پہچان لیا؟“ وہ اس کی حیرت سے لطف
اندوز ہو رہی تھی۔

”میں نیلی راجپوت کی ملکہ کو کیسے بھول سکتا
ہوں؟“ وہ وہی سا مسکرایا۔ شاید روپا تھیک کہتی تھی،
وہ گاؤں کا سب سے وجہ مرد تھا۔

”بھولنا بھی نہیں چاہیے تھا۔“

”مگر آپ۔۔۔ ادھر؟“ وہ چھوٹا سا گاؤں تھا اور اس
میں واحد گوری لڑکی تھا کہ شکھو راج کی بیوہ تھی،
بظاہر وہ جیسے کڑیاں ملا رہا تھا۔ ”آپ شکھو کی۔“
”ہاں، میں میلا فرزند ہوں اور تم مجھے اچھی

طرح جانتے ہو۔“

”شیکھر راج اچھا آدمی تھا، گاؤں کے ساتھ مخلص تھا، اس کی موت کا افسوس ہوا۔“ اس نے مایا کا آخری فقرہ نظر انداز کیا تھا۔

”شکریہ۔ مگر کیا دوسرے شاکر مخلص نہیں جو تم نے آج گوپال کو پانچویں دفعہ ہرایا ہے؟“

”شکریہ۔“ وہ بس بس دیا، پھر سفید گھوڑے کی پشت پر ہاتھ پھیرا۔ ”یہ ایک وفادار جانور ہے، اس نے بہت وفا بھائی ہے میرے ساتھ۔“

”بھی راجپوتوں کی حویلی آؤ میں تمہیں گوپال کے ایسے تین گھوڑے دکھاؤں گی۔“

”آپ کبھی ملکوں کی حویلی آئیے میں آپ کو اپنا پورا اصطبل دکھاؤں گا۔“

وہ بس بڑی۔ ”ملکوں کی حویلی کس طرف ہے؟“

”آپ کی خادمہ آپ کو لے آئے گی۔“

”مگر میں نے تو نہیں کہا کہ میں آؤں گی۔“

بدر بے ساختہ مسکرا دیا۔ ”آپ کو شش کیجئے گا“ میں انتظار کروں گا۔“

”تم انتظار کرنا، مگر میں نہ وعدہ کرتی ہوں نہ کوشش کروں گی۔“ اعمتاو سے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مسکرا کر وہ جانے کے لیے پٹی۔ ”چلو روپا۔“

”سنئے۔“

مایا نے مڑے بغیر، محض گردن ترچھی کر کے عقب میں دیکھا۔

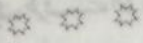
”میں انتظار کروں گا۔“

”ضرور کرنا۔“ واپس جاتے ہوئے اس نے ایک نظر زہرہ کے تاریک پڑتے چہرے کو دیکھا، جو کتنی ہی دیر سے خاموش کھڑی تھی۔ آج پہلی دفعہ بدر نے گاؤں کی سب سے سندر لڑکی کو یوں نظر انداز کیا تھا۔

مایا اثر لیے بغیر آگے بڑھ گئی۔ روپوتی اس کے پیچھے تھی۔

وہ گھوڑے کی لگام ہاتھ میں تھامے اسے دور جاتے دیکھتا رہا۔

ڈی سوزا کی ڈویتی شام کا فوسل ابھی تک بھاتی تھا۔



چوہدری منگل سنگھ کا تعلق گاؤں کے ایک معزز گھرانے سے تھا۔ وہ ذات کے راجپوت تھے۔ مگر امارت کے لحاظ سے ٹھاکروں سے کہیں کم۔ ہر حال گاؤں کے متوسط طبقے کے زمینداروں میں چوہدری منگل سنگھ کو خاص اہمیت حاصل تھی۔

منگل سنگھ کا پچھلے آٹھ ماہ سے ایک سکھ زمیندار سے جائیداد کا تنازعہ چل رہا تھا۔ یہ تنازعہ پیری کے ایک درخت کی ملکیت سے شروع ہوا تھا اور بڑھتے بڑھتے جانی دشمنی تک پہنچ گیا تھا۔ اس درخت کے دوسرے دعوے دار شوہا سنگھ نے جس کی زمین منگل سنگھ کی زمین کے ساتھ ملی ہوئی تھی، بھری پختائیت میں منگل سنگھ کو جان سے مار دینے کی دھمکی دی تھی۔

1939ء میں انگریز کے قانون کی عملداری کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ بے درپے سیاسی محاذوں پر شکست کھا کر سرکار خاصی کمزور ہو چکی تھی۔ ڈکیتی اور قتل کی وارداتیں عام سی بات بنتی جا رہی تھیں۔ ایک

مہینے میں جائیداد کے تنازعے پر دو چار قتل ہو جانا تو اب معمول بن چکا تھا۔

اس رات شوہا سنگھ کا ارادہ اسی معمول کو دہرانے کا تھا، معاملہ اب پیری کے درخت کا نہیں رہا تھا۔ شوہا سنگھ نے سنا تھا کہ منگل سنگھ یا دو ستوں میں بیٹھ کر کہتا ہے کہ ”اگر شوہا سنگھ نے درخت والی جگہ میرے حوالے نہ کی تو میں اس کی بہن کو اٹھا لوں گا۔“

شوہا سنگھ کی بہن نرملتا جوان، خوب صورت عورت تھی۔ جب بات نرملتا پہ آئی تو شوہا سنگھ کی

غیرت نے جوش مارا اور اس نے بھری پختائیت میں دعوہ کیا کہ اگر منگل سنگھ باز نہ آیا تو وہ اس کا خون کر دے گا۔

مگر منگل سنگھ باز نہ آیا اور اس رات شوہا سنگھ نر کے کنارے گھات لگا کر منگل سنگھ کی ناک میں بیٹھ گیا۔ اسے علم تھا کہ منگل سنگھ آج اسے بھائی کے گھر ہے، اور وہاں محفل جمی ہوئی، جسے چھوڑ کر وہ رات گئے

گھر واپس لوٹے گا۔ اسے ٹھکانے لگانے کا یہ وقت بہتر تھا۔

رات گہری ہو گئی تو منگل سنگھ اپنے بھائی کے گھر سے نکلا۔

پورا گاؤں خاموشی اور اندھیرے میں ڈوبا تھا۔ گھروں کی بتیاں گل ہو چکی تھیں اور گاؤں کے مکین بستر میں دیکے بے خبر سو رہے تھے۔

منگل سنگھ کا گھر زیادہ دور نہ تھا۔ مگر راستے میں کمیت پڑتے تھے اور آگے نہر تھی۔ نہر کے ایک طرف کچا راستہ تھا جو پرانے قبرستان سے ہو کر دوسرے گاؤں جاتا تھا، جبکہ دوسری جانب منگل سنگھ کے گھر کا راستہ تھا۔

وہ خاموشی سے کھیتوں کے درمیان بنی کچی پگھنڈی چل رہا تھا۔ سامنے نہر تھی اور اس طرف کچا راستہ جس کے ساتھ ساتھ درختوں کی پاؤں لگی تھیں۔ چلتے چلتے یونہی منگل سنگھ نے سراٹھایا تو ایک دم اسے عجیب سا احساس ہوا۔ وہ وہیں اپنے قدموں پہ رک گیا۔

درختوں کے جھنڈ کے ساتھ ساتھ کوئی دے بے قدموں کے راستے چل رہا تھا۔ منگل سنگھ شاید کبھی توجہ نہ دیتا، مگر اس شخص کا رخ پرانے قبرستان کی جانب تھا۔ اگر وہ کوئی دوسرے گاؤں جانے والا مسافر ہوتا تو اسے کسی سواری یا گھوڑے وغیرہ پہ ہونا چاہیے تھا مگر وہ پیدل چل رہا تھا۔

”رات کے اس پہر کوئی شخص کیوں پرانے قبرستان جانے گا؟“

اس کے ذہن میں گاؤں والوں کی باتیں گونجنے لگیں۔

نبلی راجپوتوں کا بھوت۔

ایک چنچہ پوش جو رات کو پرانے قبرستان کے آس پاس منڈلاتا ہے۔ بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ کوئی بھگلی ہوئی آتما ہے اور روز رات کو کسی قبر کو بھاڑ کر نکلتی ہے اور پھر صبح ہونے سے قبل دوبارہ کوئی قبر کھود کر اندر خود کو دفن کر لیتی ہے۔ قبرستان میں کھدائی کے آثار تھے۔

جس سے لوگوں نے شروع شروع میں ہی قیاس ظاہر کیا اور جیسے جیسے بات پھیلی گاؤں والوں نے رات کو کیا دن میں بھی اودھ جانا چھوڑ دیا۔

وہ چنچہ پوش کون تھا؟ کہاں سے آیا تھا اور پرانے قبرستان میں وہ روز رات کو کیا کرتا تھا؟ یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔

چوہدری منگل سنگھ کے ذہن میں انسان کا فطری تجسس بیدار ہوا۔ گھر جانے کا ارادہ ترک کر کے کچے راستے کی جانب بڑھ گیا۔

اس رات چاند نہیں نکلا تھا، تاروں کی روشنی میں منگل سنگھ کو وہ سیاہ ہیولہ یا سایہ سا نظر آ رہا تھا۔ ان دونوں کے بیچ فاصلہ بہت زیادہ تھا۔

سایہ درختوں کے جھنڈ کے ساتھ ساتھ اودھ اودھ دیکھتے احتیاط سے چل رہا تھا۔ منگل سنگھ دے بے قدموں اس کے پیچھے چل دیا۔ اسے علم نہیں تھا کہ اس کا تعاقب بھی اسی طرح کچھ فاصلے سے ہو رہا ہے۔

تاریک سایہ پرانے قبرستان کے قریب جا کر رکا۔ اودھ اودھ دیکھا اور لکڑی کا بھانگ دکھایا۔ وہ بھاری چرچاہٹ کے ساتھ کھٹکا چلا گیا۔

سایا اندر داخل ہو گیا۔ شاید ابھی تک وہ اپنے تعاقب میں آتے منگل سنگھ سے بے خبر تھا۔

منگل سنگھ بھانگ کے اس طرف کھڑا چند لمحے سوچتا رہا۔

قبرستان میں اس وقت ہو گا عالم تھا۔ دور دور تک پھیلی قبریں اور فطری خوف، ایک لمحے کو تو منگل سنگھ کے دل نے کہا کہ لعنت بھیجو اس پہ اور بھاگ چلو۔ مگر دوسرے ہی لمحے اس نے جی کڑا کر اس چنچہ پوش کو بے نقاب کرنے کا تہہ کر لیا۔ دور سے اس کو ٹھیک سے تو نہیں دیکھ سکتا تھا، مگر ایک بات کا اسے چند منٹوں میں ہی یقین ہو گیا تھا کہ وہ سایہ کوئی انسان تھا، بھوت نہیں۔

سایا اب برگد کے گھنے بوڑھے درخت کے نیچے پہنچ چکا تھا اس کے ہاتھ میں کدال تھی اور اس کا ارادہ زمین کھودنے کا تھا۔

ہنر

تن گاؤں کے ایک معزز کے راجپوت تھے مگر سے کہیں کم۔ سر اصل سینہ اوروں میں چوہدری

سے ایک سکھ زمیندار یہ تازہ عہدیری کے ایک ہوا تھا اور بڑھتے بڑھتے درخت کے دوسرے کی زمین منگل سنگھ کی سری پچائیت میں منگل نادی تھی۔

کے قانون کی عملداری دے سیاسی محاذوں پہ ہو چکی تھی۔ ڈیکتی اور تی جارہی تھیں۔ ایک د چار قتل ہو جانا تو اب

سی معمول کو دہرانے کا نہیں رہا تھا۔ شوہا دوستوں میں بیٹھ کر کتا خشت والی جگہ میرے اٹھالوں گا۔

وان، خوب صورت آئی تو شوہا سنگھ کی نے بھری پچائیت میں تو وہ اس کا خون کر دے

رات شوہا سنگھ نہر سنگھ کی تاک میں بیٹھ آج اپنے بھائی کے گھر سے چھوڑ کر وہ رات گئے

منگل سنگھ نے خود کو تسلی دی، وہ گرو کا نام لیا اور

قبرستان میں قدم رکھ دیے۔

سب اب زمین پہ جھکا، لکیر کھینچ رہا تھا۔ اس کا سیاہ

چغہ کافی ٹھلا سا تھا اور اس میں اس کی جسامت کا اندازہ

نہیں ہوتا تھا۔ سر پہ چغے کی ٹوپی تھی اور اس کی منگل

سنگھ کی جانب کر رہی تھی۔

منگل سنگھ آہستہ آہستہ چلتا چغہ پوش کے سر پہ

پہنچ گیا۔ آہٹ تھی یا کوئی اور احساس، چغہ پوش نے

بو کھلا کر پیچھے دیکھا۔

ٹوپی اس کے سر پہ تھی اور تاروں کی روشنی میں

اس کا چہرہ واضح تھا۔ منگل سنگھ کو حیرت کا شدید جھٹکا

لگا۔

چغہ پوش نے ایک دم کدال چھوڑ دی اور بھاگ کر

درخت کی اوٹ لی۔ ایک لمحے کو تو منگل سنگھ کو اس

حرکت کی وجہ سمجھ میں نہ آئی، وہ بے شکل ہی اس شاک

سے نکل پڑا تھا کہ ایک دم وہ سایہ یوں غائب بھی ہو گیا

تھا۔ منگل سنگھ بے اختیار درخت کی جانب لپکا، مگر اس

سے پہلے کہ وہ آگے بڑھ پاتا، کسی نے پیچھے سے کرپان کا

وار کیا۔

بے درپے چند وار کر کے حملہ آور ہا ہر کو بھاگ گیا،

یہ یقینی تھا کہ حملہ آور نے وہ ”بھوت“ نہیں دیکھا تھا۔

وہ قدموں وہ سایہ درخت کی اوٹ سے نکلا اور

قریب آکر منگل سنگھ کا چہرہ دیکھا۔ وہ چند منٹ کا سہمان

تھا، یہ اس کی حالت سے ظاہر تھا۔

”معاف کرنا مجھے تمہاری موت کا افسوس ہوا ہے،

اگر تمہیں کوئی بچانے آجائے تو اسے کہنا کہ آئندہ جو

نبلی راجپوتوں کے بھوت کا پیچھا کرے گا اس کا انجام یہ

ہی ہوگا۔“

چند لمحے بعد سایہ کچے راستے پر گم ہو چکا تھا۔

منگل سنگھ ابھی تک پراگراہ رہا تھا۔



”مایا دیوی۔ مایا دیوی۔“ روپ وتی بھاگتی ہوئی

بدحواس سی اس کے کمرے تک آئی۔

وہ سنگھار میز کے سامنے بیٹھی بالوں کی چوٹی کو منہ

رہی تھی۔ شاید گاؤں میں مایا کے پاس کرنے کو اور کوئی

کام نہیں تھا۔

”کیا ہو گیا روپا؟“ چوٹی کے بل ڈالتے ہوئے اس

نے تنقیدی نگاہوں سے خود کو آئینے میں دیکھا۔

”مایا دیوی۔ وہ۔“ بھاگنے کے باعث روپ وتی کی

سانس چڑھ گئی تھی۔ ”وہ چوہدری ہری سنگھ کا بیٹا۔“

وہ۔“

”وہ کیا؟“ اس نے ہاتھ بالوں میں روک کر گردن

اٹھا کر اسے دیکھا۔

”وہ چوہدری ہری سنگھ کے بیٹے کو بھوت نے قتل

کر دیا ہے۔ اس کی لاش پرانے قبرستان سے ملی

ہے۔“

”کیا؟“ وہ جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”بھوت نے

قتل کر دیا؟ مگر کب، کیسے؟“ وہ حیران پریشان سی کھڑی

تھی۔

”رات کو کسی وقت جی۔“

”مائی گڈنیں۔“ وہ حیرت سے کچھ بول نہیں پاری

تھی۔ ”اس ٹیریل۔ میں تو سمجھی تھی وہ کوئی چور اچکا

ہوگا، مگر۔“

”وہ بھٹکی ہوئی آتما ہے جی۔ اب تو آگیا نا آپ کو

یقین؟“

”مگر روپا، قتل کیسے ہوا ہے؟ کیا گولی ماری ہے؟“

”پتا نہیں جی، پولیس کا کہنا ہے کہ کسی تیز دھار

آلے سے وار کیا گیا ہے۔ ابھی لاش کا وہ نہیں ہوا۔“

وہ جیسے لفظ یاد کرنے لگی۔

”نوسٹ مارٹم؟“ مایا نے فوراً کہا۔ روپ وتی سر

ہلانے لگی۔

”مگر اس کا کیا ثبوت ہے یا تم لوگ کیسے یہ کہہ رہے

ہو کہ قتل بھوت نے ہی کیا ہے؟“

”بدرعازان نے خود سنا ہے، مرتے سے چوہدری

منگل سنگھ نے بھوت کا ہی ذکر کیا ہے۔“

”بدرعازان؟“ وہ ہری طرح چوٹی۔

”جی، ملکوں کا بیٹا، بدرعازان۔“

مہلکا

نفی، پچش اور

خون میں کو لیٹر

گرمی، پیاس کی

اور مروڑ میں بھی

”وہ ادھر کیا کر رہا تھا؟“ وہ تیزی سے بولی۔
 ”وہ ساتھ والے گاؤں سے واپس آ رہا تھا اپنے
 گھوڑے پر، پرانے قبرستان کے قریب سے گزرتے
 ہوئے اس نے منگل سنگھ کی چیخوں کی آواز سنی۔ وہ
 پہنچا تو منگل سنگھ کا آخری سانس تھا۔“
 ”اور آخری سانس میں منگل سنگھ نے پورے صفحے
 کا بیان بھی دے دیا؟“

”جی نہیں جی میں نے تو منشی کرم دین سے سنا ہے کہ
 منگل سنگھ نے بدر غازان کو بھوت کا بتایا ہے، بدر کسی
 سے ذکر کر رہا تھا۔“

مایا شش و پنج میں مبتلا کھڑی اسے دیکھتے رہی پھر سر
 جھٹک کر کھڑکی کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

”عجیب سی بات ہے۔ آدھی رات کو قبرستان میں
 قتل ہو جاتا ہے جو بقول تم لوگوں کے، کوئی سو کا لڈ
 بھوت کرتا ہے اور پھر اتنا اتفاق کہ عین موقع پر بدر
 غازان پہنچ جاتا ہے اور مقتول سے نزعی بیان بھی لے
 لیتا ہے۔“ وہ مشکوک سی نفی میں سر ہلا رہی تھی۔
 ”او نہوں کہیں کچھ غلط ضرور ہے۔“

”کیا غلط ہے مہارانی جی۔ مجھے تو سمجھ نہیں آ رہا۔“
 ”سوال یہ ہے کہ روپا کہ اتنی رات کو بدر غازان
 قبرستان میں کیا کر رہا تھا۔“
 ”چھوٹا ملک دوسرے گاؤں سے آ رہا تھا۔“
 ”کون چھوٹا ملک؟“

”بدر بابو۔ وہ دوسرے گاؤں سے آ رہا تھا۔“ روپ
 وتی نے دہرایا۔

”پتا نہیں روپا، مگر پارہا میرے ذہن میں ایک شک
 سا ابھر رہا ہے۔“ وہ کھڑکی کے باہر نگاہیں جمائے سوچتے
 ہوئے کہہ رہی تھی۔ بند شیشے کے اس پار گاؤں کی
 زندگی رواں دواں تھی۔

”کیسا شک مایا دیوی؟“

”کہیں نہ کہیں کچھ غلط ضرور ہے۔ یہ بدر غازان
 مجھے کچھ۔۔۔ پھر گردن پھیر کر اسے دیکھا اور کہتے کہتے
 رک گئی۔“ کچھ نہیں تم جاؤ۔“

اور روپ وتی اس کی ادھوری بات کا مفہوم سمجھنے

کی کوشش کرتی اس لئے قدموں والپس مڑی۔
 ”سنو۔“

روپا جاتے جاتے پلٹی۔

”جی، مہارانی جی؟“

”یہ ملکوں کی حویلی کس طرف ہے؟“

”قریب ہی ہے جی، کھیتوں سے گزر کر جانا پڑتا
 ہے۔“

”اچھا۔۔۔ ٹھیک۔ چلنا پھر میرے ساتھ۔“

”جی؟“ روپا حیران ہوئی۔

”او نہوں۔“ وہ پھر سے کھڑکی کے پار دیکھنے لگی۔

”کچھ دن تک چلیں گے۔“ روپ وتی سر جھکائے

کمرے سے باہر نکل آئی۔ دروازہ بند کرتے ہوئے مایا

کی دھیمی بریڈر اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔

”میں بھی دیکھتی ہوں، آخر کون سو رہا ہے جو بھوت

بن کر لوگوں کی زندگیوں سے کھیل رہا ہے۔“ روپ وتی

نے دروازہ بند کر دیا۔

”ایک بات سمجھ میں نہیں آتی ہے۔“ اس کا کھانا

برتنوں میں نکالتے ہوئے روپ وتی غمگین سی بولی۔

اس کی آواز میں کسی حسین خواب کے ٹوٹنے کا غم تھا۔

اچے نے برتن اپنی طرف کرتے کرتے رک کر

اسے دیکھا۔ وہ کنفیوژڈ سی کسی گہری سوچ میں گم

تھی۔

”کیا بات سمجھ میں نہیں آ رہی؟“ اچے شاید کھانا

کھانے کا ارادہ ترک کر چکا تھا۔ روپا پریشان ہوا اس سے

یہ برداشت نہ ہوا تھا۔ وہ کئی برس سے روپ وتی کے

ہمراہ حویلی میں ملازم تھا اور اس کی فطرت کو بخوبی سمجھتا

تھا۔ وہ آج بہت غم زدہ لگ رہی تھی۔

”ایک بات تو بتاؤ۔“ اس نے جیسے اچے کا سوال سنا

ہی نہیں تھا۔ ”تمہیں کس نے کہا کہ بدر بابو نے منگل

سنگھ کے منہ سے بھوت کا ذکر سنا ہے۔“

”منشی کرم دین سے۔“

”تمہیں منشی کرم دین کی بات پہ کتنا اعتبار ہے؟“

طنز و مزاح سے بھرپور کالم

باتیں انشاء جمی

ابن انشاء



باتیں انشاء جمی کی

ابن انشاء

قیمت: 300/- روپے

ڈاک خرچ: 30/- روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

”وہ راستہ گواہان ہے“ میں اسے عرصے سے

ہائیا ہوں۔ مگر۔“

”کیا مٹی کرم دین کو بدرغازان نے خود یہ بات بتائی

”نہیں وہ کسی سے کہہ رہا تھا“ مٹی نے سنا ہے۔“

”مٹی کو جھوٹ نہیں بول سکتا ہے؟“

”مٹی کو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟“ روپا

”سوال اب اسے کو پریشان کر رہے تھے۔“

”مگر ہو سکتا ہے بدرغازان نے مرتے سے منگل

”سے بات ہی نہ کی ہو۔“

”اس نے خود تھانے دار کو بتایا ہے کہ اس نے

منگل گھگھ کے منہ سے کیا سنا ہے۔“

”کس نے؟“

”چھوٹے ملک نے۔“ روپا ٹھٹھک کر اسے دیکھنے

”گئی۔“

”چھوٹے ملک نے خود یہ بیان دیا ہے تھانے دار کو

”اے؟“

”ہاں روپا، مگر ہوا کیا ہے؟“

”سوال یہ ہے کہ اے کہ چھوٹا ملک اس وقت

قبرستان میں کیا کر رہا تھا؟“

”مگر تم سے یہ سوال کس نے کیا ہے؟“

”کسی نے بھی کیا ہو، کچھ گڑبڑ تو ہے نا اے۔“

”کیا گڑبڑ ہے اس میں۔ چھوٹا ملک سفر سے لوٹا تھا“

”وہ سویر تو ہو ہی جاتی ہے۔“ روپا توئی نفی میں سر ہلاتی

”گردن جھکائے برتن سمیٹنے لگی۔“

”بس اے! یہ بدرغازان اتنا اچھا آدمی ہے نہیں

”تتنا خود کو ظاہر کرتا ہے۔“ اس کی آواز میں دکھ بھرا تھا۔

”وہ اچھا آدمی ہے روپا، تم راجپوتوں کی باتوں میں نہ

”اؤ۔“

”پر مایا دیوی راجپوت نہیں ہیں۔“ وہ بے اختیار

”بولی۔“

”تو یہ سب تم سے مایا دیوی نے کہا ہے؟“

”وہ کہنا نہیں چاہتی تھیں، سوانہوں نے بات لیوں پہ

”لوکل۔“

ٹری۔

”گزر کر جانا پڑتا

تھ۔“

”بار دیکھنے لگی۔

”ن سر جھکائے

”رتے ہوئے مایا

”کرائی تھی۔

”اے جو بھوت

”روپوئی

”اس کا کھانا

”بن کی بولی۔

”ٹنے کا تم تھا۔

”تے رک کر

”سوج میں گم

”جے شاید کھانا

”ہوا اس سے

”پوئی کے

”بجوبی سمجھتا

”نے کا سوال سنا

”ہوئے منگل

”ار ہے؟“

”لیکن مایا دیوی ایسی بات کیوں کریں گی؟“ اے سوچ میں پڑ گیا۔
 ”کوئی تو بات ہوگی اے۔“
 ”چھوڑو دیا، مایا دیوی کو گاؤں کے لوگوں کا کیا پتا۔
 انہیں تو باہر دیکھ کر تک جانے کے لیے تمہارا سہارا
 چاہیے ہوتا ہے، کہیں حویلی سے باہر گاؤں کے
 رستے تک تو پتا نہیں، یہاں کے معاملوں کا کیا پتا
 ہوگا۔“
 مگر روپا مسلسل نفی میں سر ہلا رہی تھی۔
 ”کچھ تو ہے اے۔“ پھر سر جھٹک کر کام میں
 مصروف ہو گئی۔



”بد رعازان سے ملنا ہے۔“ بس اسے اتنا کہنا پڑا اور
 ملکوں کے ملازم پورے روٹو کول سے اسے اور روپا کو
 مسمان خانے میں لے آئے یقیناً بد رعازان نے ٹھاکر
 شیکھ کی بیوہ کے لیے کوئی خصوصی ہدایت دے
 رکھی تھی۔
 ملکوں کی حویلی مایا کی توقع سے بڑھ کر عالی شان اور
 خوب صورتی سے آراستہ تھی۔ اس کی آرائش و
 زیبائش میں جدید انگریزی طرز کی جھلک تھی۔ شاید
 اس لیے کہ بد رعازان انگلستان سے بڑھ کر آیا تھا اور
 اس نے ایک دیسی حویلی کو دیہی کے کسی انگریز اعلیٰ افسر
 کے بیگلے کی طرز پر آراستہ کر لیا تھا۔
 ”آپ اندر تشریف رکھیے، چھوٹے ملک ابھی
 آتے ہیں۔“
 ”وہ ہیں کدھر؟“ مایا نے واپس مڑتی ملازمہ کو روک
 دیا۔
 ”اسنے اصطبل میں ان کا گھوڑا تیار ہے، امر ترسے
 ایک ڈاکٹر کو بلایا ہے، ابھی اسی کے ساتھ ہیں۔“
 ”روپا! تم یہیں ٹھہرو، میں وہیں چلی جاتی ہوں۔“
 وہ ملازمہ کو کچھ کہنے کا موقع دینے بغیر یاہر نکل آئی۔
 اصطبل حویلی کی پچھلی طرف تھا، اسے اچھا خاصا
 چلنا پڑا تھا۔

ملازمہ اسے اصطبل کے احاطے کے آگے پہنچا کر
 کر چلی گئی۔
 اصطبل خاصا وسیع تھا۔ تین اطراف میں گھوڑے
 قطاروں میں بندھے تھے۔ وہ چوکھٹ پہ کھڑی سائے
 دیکھنے لگی، جہاں بدر مخالف سمت سے ایک ملازم کے
 ہمراہ چلنا آ رہا تھا۔
 شاید وہ ابھی ابھی گھوڑے کا معائنہ کر کے ہٹا تھا۔
 آستینیں فولد کر کے کنٹیوں تک چڑھا رکھی تھیں اور
 وہ مسلسل قدرے بڑھی سے ملازم کو کچھ کہہ رہا تھا،
 تب ہی اچانک۔۔ اس کی نگاہ چوکھٹ میں پاؤں تک
 آٹا لبا سا سفید فراک پہنے اس لڑکی پہ پڑی۔ وہ بولتے
 بولتے رک گیا۔ چہرے پہ خوش گواری حیرت اتر آئی
 تھی۔
 ملازم کو جانے کا کہہ کر وہ ہاتھ جھانڑا اس کی طرف
 آیا۔
 ”آپ؟“ وہ ابھی تک حیران تھا۔
 ”ہاں میں!“ وہ کہہ کر بے نیازی سے ادھر ادھر
 بندھے گھوڑوں کا جائزہ لینے لگی۔ اس کے فراک کی
 آستینیں کافی چھوٹی تھیں اور دو دھیا سنہری بازو دھوپ
 میں مزید سنہری لگ رہے تھے۔
 ”مجھے خوشی ہوئی کہ آپ مجھ سے ملنے آئیں۔“
 ”مگر میں تو اصطبل دیکھنے آئی ہوں۔“ وہ دھیرے
 سے ہنس دیا۔ مایا کی برجستگی اسے محفوظ کرتی تھی۔
 ”تو پھر میں آپ کو اصطبل دکھاتا ہوں۔ انہیں دیکھ
 کر راجپوتوں کے گھوڑے بھول جائیں گی آپ۔“
 ”بہت لگتی ہے تمہاری راجپوتوں کے ساتھ؟“ وہ
 دونوں باڑے کے ساتھ ساتھ چلنے لگے تھے۔
 ”معذرت کے ساتھ، مگر ٹھاکر گھوٹا تھا کا خاندان
 اس گاؤں کے ماتھے بہت بڑا کلنگ ہے۔“
 ”مگر میں نے تو گاؤں میں ایسی کوئی بات نہیں
 دیکھی۔“
 ”آپ نے ابھی گاؤں دیکھا ہی کہاں ہے؟“ وہ
 مسکرا کر اس کے مقابل آکھڑا ہوا۔ وہ شائے اچکا کر
 آگے بڑھ گئی۔

بدروہیں کھڑا رخ پھیرے اسے دیکھنے لگا۔
”تمہارے اور ٹھاکروں کے درمیان جھگڑے کی
وجہ کیا ہے؟“ وہ جھک کر ایک گھوڑے کی پیشانی پہ
زی سے ہاتھ پھیر رہی تھی۔

”وہ ہندو ہیں مایا دیوی“ اور ہم مسلمان۔ وہ
dominant ہیں اور اسی — حاکمیت کا
فائدہ اٹھا کر مسلمانوں پہ ظلم کرتے ہیں، مگر پچھلے کافی
عرصے سے ان کو یہ ہمت نہیں ہوئی۔“

”ہوئی تو نہیں، لیکن۔“ گھوڑے کے سر پہ ہاتھ
پھیرتے ہوئے وہ بولی۔ ”کیا ہوگی بھی نہیں؟“

”جب تک بیلی راجپوتوں کا بدر غازان زندہ ہے،
انہیں یہ ہمت نہیں ہوگی۔“ اس کا لہجہ سخت ہو گیا۔

”بیلی راجپوتوں کا بدر غازان! دلچسپ نام ہے، کیا
مطلب ہوا اس کا؟“ وہ قطار میں بندھے گھوڑوں کو
دیکھتے آگے چلتی جا رہی تھی۔

”بیلی کا مطلب مجھے معلوم نہیں، راجپوتوں، البتہ
میل کے سرکردہ راجپوت خاندان کے حوالے سے

ہے جیسا کہ عموماً پنجاب کے دیہاتوں کے نام ہوتے
ہیں۔ انگریز سرکار نے اس کا نام بدل کر کچھ اور کر دیا

ہے، مگر ہم اسے اسی پرانے نام سے پکارتے ہیں۔“
”مگر میں تو تمہارے نام کی بات کر رہی تھی۔“ وہ

بے اختیار ہنس دیا۔
”میں سمجھا اگر آپ یہاں محض اصطبل دیکھنے آئی
ہیں تو نام میں دلچسپی بھی بس بیلی راجپوتوں تک محدود

ہوئی۔“
”م اصطبل بھی تو تمہارا ہے۔“ وہ اب ایک گھوڑے

کے سواری بالوں میں ہاتھ پھیر رہی تھی۔
”شکریہ۔ غازان میرے دادا کا نام تھا، ان کا انتقال

میری پیدائش کے روز ہوا تھا، اسی لیے میرے ابا جی
نے میرے نام کے ساتھ ان کا نام جوڑ دیا۔“

”اور اس کا مطلب؟“
”مگر مجھے علم ہوتا کہ بیلی راجپوتوں کی ملکہ کبھی مجھ

سے یہ سوال کرے گی تو میں اس کا مطلب جاننے کی
کوشش ضرور کرتا۔“

”تم اب بھی کر سکتے ہو۔“ وہ نیچے بیٹھی جھک کر
ایک مرل سے گھوڑے کو دیکھ رہی تھی۔ ”یہ مجھے بیمار
لگ رہا ہے۔“

”یہ بیمار ہے، اسی کے لیے ابھی ڈاکٹر بلایا تھا، دیے
سانپوں کے علاوہ گھوڑوں کو بھی بہت پہچانتی ہیں

آپ۔“ وہ چلتا ہوا اس کے عقب میں اکھڑا ہوا۔
”کافی چہرہ شناس ہیں آپ۔“

”چہرہ نہیں، یہ آنکھیں ہوتی ہیں، جوں کا حال بتاتی
ہیں۔“

”انسانوں کی آنکھیں پڑھ لیتی ہیں، ماوام؟“
وہ ہاتھ جھاڑتی اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کی آنکھوں

میں جھانکا۔
”بہت اندر تک۔“

”اور اپنی آنکھیں؟“

”وہ میں پڑھنے نہیں دیتی۔“

اور پیر نے دیکھا، اس کی سنہری آنکھیں آج بھی
بے اثر تھیں۔ کوئی سوچ، کوئی خیال، کوئی نفرت، کوئی

محبت، کوئی جذبہ نہیں تھا ان میں۔
”ایک بات تو بتاؤ۔“ وہ پھر سے ساتھ ساتھ چلنے

لگے تھے۔ ”یہ چوہدری منگل سنگھ کا قتل کس نے کیا
ہے؟“

”بیلی راجپوتوں کے بھوت نے۔“
”میں نے سنا ہے اس نے نزعی بیان تمہیں دیا

ہے۔“
”آپ نے درست سنا ہے۔“ وہ چلتے چلتے اصطبل

کے کھلے دروازے تک آگئے تھے۔
”تو کیا واقعی منگل سنگھ نے اعتراف کیا ہے کہ اسے

مارنے والا بھوت تھا؟“
”نہیں۔“ وہ ٹھٹھک کر رک گئی۔ ”تو پھر؟“

”وہ بھوت نہیں ہے مایا دیوی، وہ انسان ہے جو
بھوت کا ڈھونگ رچا رہا ہے۔ مجھے اس کا نام منگل سنگھ

نے بتا دیا ہے۔“ وہ دروازے کی چوکھٹ پہ ہاتھ رکھے
اس کا راستہ روکے کھڑا تھا۔

باقی آئندہ شمار رہے

پہلی راجپوتان کا دوسرا بار سوخ خاندان ملکوں کا ہے جو مسلمان ہے۔ خاندان کا ولی عہد بدر غازان وجہہ نوجوان ہے جس کی بہادری اور شجاعت پورے گاؤں میں مشہور ہے۔ راجپوتوں سے بالخصوص گوبال سے اس کی بالکل نہیں جتنی۔ بدر غازان کا تعلیم باہر سے حاصل کرنے کے بعد اپنی زمینیں سنبھالتا ہے۔ اس کی منگنی تیار زاد زہر سے ہو چکی ہے۔ بدر غازان کو زہر ملا سانب کاٹنا ہے تو عین وقت پر مایا دیوی پہنچ کر اس کی جان بچاتی ہے۔ وہ مایا کی بہادری اور حکمت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ چوہدری منگل سنگھ کا جائیداد کے معاملے پر شوہا سنگھ سے تنازعہ اٹھتا ہے کہ شوہا سنگھ اس کی جان لینے کے درے ہو جاتا ہے۔ اس کے آدمی گھات لگائے رات گئے بیٹھ جاتے ہیں۔ منگل سنگھ کو لکھ جاتے ہیں۔ بدر غازان میں کسی کے داخل ہونے کا کمان ہوتا ہے۔ قبرستان کے بھوت کا چرچا پورے گاؤں میں ہے۔ منگل سنگھ حقیقت جاننے کو اس اجنبی کا پیچھا کرتا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ اس پر قابو پاتا شوہا سنگھ کے آدمی تیز دھار آلے سے اسے شدید زخمی کر دیتے ہیں۔ محلے سے قبل وہ اس اجنبی کی شکل دیکھ لیتا ہے۔ منگل سنگھ کی موت کے بعد گاؤں میں خبر پھیلتی ہے کہ بھوت نے منگل سنگھ کو مار ڈالا۔ یہ افواہ مایا دیوی کو بھی شدید کر دیتی ہے۔ نوکرانی روپ دیتی اسے بتاتی ہے کہ منگل سنگھ نے مرتے ہوئے بدر غازان کو یہ بات بتادی تھی۔ مایا دیوی حقیقت جاننے ملکوں کی حویلی پہنچ جاتی ہے۔ بدر اس کی آمد پر بے حد مسرور ہوتا ہے۔ بدر مایا دیوی کو بتاتا ہے کہ قبرستان کا بھوت در حقیقت ایک انسان ہے جس کا نام منگل سنگھ مرتے ہوئے اسے بنا چکا ہے۔

(اب آگے پڑیے)

۲ دوسری قسط

کے عوض انہیں اس عفریت سے نجات دلانا چاہتی ہوں جو معصوم جانوں سے کھیل رہا ہے۔

”آپ کا قیاس کیا کرتا ہے؟“

”یہ بی بی کہ یہ کوئی کرمبل ہے اور اب تو یہ پولیس کیس بھی بن چکا ہے۔“

”پولیس کیس؟“ بدر نے استہزائیہ سر جھٹکا۔

”گاؤں کا تو ہم پرست مسلم تھا نے وار اس کیس کو کو کسی ہوائی چیز کی کارروائی گردان کر کب کا بند بھی کر چکا ہے۔“

”لیکن انگریز سرکار کو اصل معاملہ کون بتائے گا؟“

”میں بتاؤں گی“ اور۔۔۔ اور تم بتاؤ گے۔ چوہدری منگل سنگھ نے کس کا نام لیا تھا؟“

”اگر وہ نام میں نے آپ کو بتا دیا تو آپ اس کیس کا بندر بنائی بہتر سمجھیں گی۔“ وہ اداسی سے مسکرایا۔ مایا نے اچھٹے سے اسے دیکھا۔

”تو کیا تم مجھے وہ نام نہیں بتاؤ گے؟“

”جب وقت آئے گا تو بتا دوں گا، مگر مجھے نہیں معلوم کہ آپ یقین کریں گی یا نہیں۔“

”کیا واقعی؟“ مایا کی آنکھوں میں تجسس و اشتیاق ور آیا۔ ”تو کون ہے وہ شخص؟“

”ایک انسان جس نے بھوت کا ڈھونگ اس لیے رچایا ہے تاکہ روز رات کو وہ پرانے قبرستان میں جا کر اپنا کلم کر سکے بغیر کسی مداخلت کے۔“

”کیا کلم؟“

”یہ ابھی تک میں نہیں جان سکا۔ مگر پرانے قبرستان میں یقیناً کچھ ایسا ہے جس کے لیے اتنا بڑا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ کسی جرم کی نشانی، کسی لاش کی تلاش، مگر کس کی لاش؟ اس سوال کا جواب ہمیں تب ملے گا جب ہم منگل سنگھ کے بتائے ہوئے نام پہ یقین کریں۔“

”تم مجھے وہ نام بتا سکتے ہو۔“

”آپ کیا کریں گی؟“ وہ ہولے سے مسکرایا۔

”مجھے اس سارے قصے سے کسی سازش کی بو آ رہی ہے اور اگر یہ واقعی کوئی بھوت نہیں ہے تو میں انکالتان جانے سے قبل اس گاؤں کے لوگوں کی محبت

”میں کروں گی، تم مجھے کھرے آدی لگتے ہو،
”وہ ایک لمحے کو رک کر اور بغور اس کی آنکھوں میں
دیکھا۔ ”تم آدھی رات کو قبرستان میں کیا کر رہے
تھے؟“

”میں ہولے سے ہنس دیا۔

”اگر آپ یہ سمجھ رہی ہیں کہ وہ بھوت میں ہوں تو
میرے پاس بہت ٹھوس ثبوت ہے۔ میں ساتھ
والے گاؤں میں اپنے دوست کی شادی میں گیا ہوا
تھا۔“

”ہوں۔“ مایا نے مبہم سا سر ہلایا۔ ”بدر فیصلہ نہ
کر سکا کہ اس کی بات یہ یقین آیا ہے یا نہیں۔“

”خیر اب میں چلوں گی۔“

”کھانا کھا کر جایئے۔ ملکوں کی حویلی سے مہمان
ایسے نہیں لوتے۔“

”پھر بھی سہی۔“

”یعنی آپ وعدہ کر رہی ہیں کہ پھر کبھی دوبارہ آئیں
گی؟“ اس نے مسکراتے ہوئے اس کا راستہ چھوڑا۔

”نہ وعدہ کر رہی ہوں اور نہ کو شش کروں گی۔ موڈ
بناؤ آجاؤں گی۔“ وہ اسی بے نیازی سے کہہ کر چوڑھٹ
پار کر گئی۔

وہ دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا در اسے جاتے دیکھتا
رہا۔



اور اسی شام مایا کا گویال سے سامنے ہوا۔

وہ اسٹول پر بیٹھی پیانو کی کیز کو انگلیوں سے چھوتی
فضا میں اس نغمے بکھیر رہی تھی جب کسی نے اس
کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

وہ جو کسی اور دھیان، کسی اور دنیا میں تھی، کرنٹ
کھا کر اٹھ کھڑی ہوئی پیچھے گویال کھڑا تھا۔

”جی فرمائیے؟“ ساڑھی کا پلو کندھے سے درست
کرتی وہ ناگواری سے بولی۔ اسے گویال کی یہ بے تکلفی
اچھی نہیں لگی اس کے چہرے سے ظاہر تھا۔

”آپ سے کچھ پوچھنا ہے، پرسکون سی باز پرس کے

پیچھے دیا یا ساغما تھا۔

”پہلے کب آپ کو پوچھنے سے قبل اجازت درکار
ہوئی ہے، کھا کر صاحب؟“ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا
لہجہ ترش ہو گیا۔

”آپ ملکوں کی حویلی میں تھیں؟“

”ہاں، کئی تھی۔“

”آپ جانتی ہیں مایا دیوی، ملکوں اور راجپوتوں کی
دریہ نہ دیکھتی ہے۔“

”ہاں، جانتی ہوں۔“

”اور یہ بھی کہ راجپوتوں سے کوئی شخص کبھی ملکوں
کی حویلی نہیں جاتا۔“

”مجھے سب علم ہے، وہ بھی جو آپ کو نہیں ہے۔“
وہ عجیب سے لہجے میں بولی تو پال ٹھٹھا۔ پھر سنبھل کر
بولی۔

”اس کے باوجود آپ ملکوں کی حویلی گئیں؟“

”ہاں میں گئی تھی۔“ وہ گردن اٹھائے اس کی
آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بات کر رہی تھی۔

”مگر کیوں؟“ اشتعال سے گویال کی آواز بلند ہونے
لگی تھی۔

”اس لیے کہ۔“ مایا نے اطمینان سے ہاتھ سے
بال پیچھے کیے۔ ”میں راجپوت نہیں ہوں۔“

اس کے لہجے کا تقاضا گویال کو اپنی انسلٹ محسوس
ہوا، وہ بھڑک اٹھا۔

”آپ راجپوتوں کی ہو ہیں۔“

”تھی!“ وہ سرد لہجے میں بولی۔ ”شیکھر کی موت
کے ساتھ سارے رشتے ختم ہو گئے۔ میں ایک آزاد
برطانوی شہری ہوں اور جب تک ہندوستان برٹش
راج کے تحت ہے، میں اس کے کسی بھی کونے میں
جاسکتی ہوں، اس کے لیے مجھے کھاکروں کی اجازت کی
ضرورت نہیں ہے۔“

وہ پلیٹ کر میز چھبوں کی طرف بڑھ گئی، سفید
ساڑھی کا پلو اس کے پیچھے فرش پر پھسل گیا۔

”جانتا ہوں مایا دیوی، بدر عازان خاصا خوب
صورت مرد ہے، گاؤں کی بہت سی عورتیں اس پر دل

ہار بیٹھی ہیں۔“

طنز بھرنا شروع کیا، طہینان سے واپس پلٹی۔
”جب گاؤں کی عورتیں کوئل ہارنے کے لیے بدر
غازان اور گوپال رام جیسے امیر زادے ملے ہوں تو ظاہر
ہے چوائس ان کے لیے خاصی آسان ہو جاتی ہے۔
سنا ہے بدر غازان نے مسلسل پانچ برس آپ کو نیزہ
بازی کے مقابلے میں ہرایا ہے۔“ اس کی دکھتی رگ پہ
مایا نے ہاتھ رکھا تھا، وہ بھڑک اٹھا۔
”تم اس کی جوبلی کے جتنے چکر لگاؤ، وہ مسلمان ہے
اور تم عیسائی۔ وہ تم سے کبھی شادی نہیں کرے گا۔“
”شادی کرنی کس کو ہے؟“ وہ تپانے والے انداز
میں مسکرائی۔

گوپال پانچوٹھاس کے ایک طرف سے نکل گیا۔
مایا نے آرام سے فرش پہ گرا پلو اٹھایا اور اوپر
سیڑھیاں چڑھتی چلی گئی۔



پرانا قبرستان ہر رات کی طرح اس رات بھی
تاریک اور سنسان پڑا تھا۔ برگد کے بوڑھے درخت کا
سایہ قبول پہ چھایا ہوا تھا۔ اندھیرے میں خستہ حال
قبریں اور بھی خوف ناک لگ رہی تھیں۔
ایک وجود قبرستان کے کونے میں کھڑا کدال سے
مسلسل زمین کھود رہا تھا۔ گڑھا کئی فٹ گہرا کھد چکا تھا،
جیسے کوئی کھلی ہوئی قبر ہو۔ اس کا سایہ چغہ مٹی سے اٹ
چکا تھا۔ مگر اس نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ اس کی کمر
اور سر جھکے تھے اور ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے۔
تاریک آسمان پہ پادل اکٹھے ہو رہے تھے۔ ہوائیں
تیزی سے چلنے لگی تھیں۔ برگد کی بوڑھی شاخیں
جھولنے لگیں، زمین پہ گرے پتے دور تک اڑتے
بکھرتے جا رہے تھے۔

چغہ پوش نے سر اٹھا کر اوپر آسمان کو دیکھا۔ وہاں
وقتے وقتے سے بجلی چمک رہی تھی۔ جب بجلی چمکتی تو
ایک لمحے کو پورا قبرستان روشنی میں نہا جاتا اور ایک
کھلی قبر کے سرہانے کھڑا سایہ کوئی بھوت سا دکھاتا تھا۔

✽ خواتین ڈائجسٹ ✽

ستمبر 2010 ✽

ہوا میں تیز ہو گئیں، اور پورا پاندی شروع ہو گیا۔
اس نے تھکے تھکے انداز میں واپس مٹی پر ہاتھ رکھ کر
کروڑی۔ مسلسل تیز ہوتی بارش اور طوفان ہوا میں
عمل کو مشکل بنائے دے رہی تھیں۔ مٹی بھیک کر کچر
بنتی جا رہی تھی۔

اس نے کچھ دیر مزید کوشش کی اور پھر جیسے تھک کر
کدال چھوڑ دی۔ بجلی ایک لمحے کو زور سے چمکی۔
اس نے بے اختیار بندھال سے انداز میں خود کو
زمین پہ گرا لیا۔ چغہ مٹی میں گھس گیا اور وہ سایہ خود
میں سمٹا سا گیا۔

بادل اسی طرح گرج رہے تھے، طوفان اپنے عروج
پہ تھا۔ چغہ پوش نے کسی چھوٹے معصوم بچے کی طرح
بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹے اور سران میں چھپا کر ایک دم
رونا شروع کر دیا۔

طوفان کی رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی اور اس کے
درمیان میں وہی دہی سسکیاں ابھر رہی تھیں۔ بہت
تھکی تھکی زخموں سے چور سسکیاں، دکھ اور ناکامی کی
آخری سرحد کو چھوٹی بے بس آہیں۔

”کدھڑھونڈوں میں اسے؟“ ایک بھرپور انسان
کی روتی آواز چغہ میں سے ابھری۔ ”کدھڑھونڈوں
کدوں میں اسے؟ پورا قبرستان کھود ڈالا میں نے، مگر وہ
کیس بھی نہیں ہے۔ میں کدھڑھونڈوں میں اسے؟ کوئی
کو نہ کہیں، بجائے میں نے نہ کھودا ہو، پھر کدھڑھونڈوں
گیا وہ؟“ سسکیاں بلند ہوتی جا رہی تھیں، جیسے کسی
عزیز ترین شے کو کھو جانے پہ کوئی بین کر رہا ہو۔ ”میری
برسوں کی ریاضت رائیگاں چلی گئی۔ میری برسوں کی
محنت ضائع ہو گئی۔“

کھلی قبر کے دہانے بیٹھا وہ وجود ابھی تک رو رہا تھا۔



وہ والان میں کرسی ڈالے کسی کتب میں منہمک
تھی۔ جاتی سردیوں کی نرم گرم دھوپ سارے میں
بکھری تھی۔ اس کی کتب پہ بجلی آجھکوں میں دم
توڑتے سوا کے آخری سورج کا عکس تھا۔

”مہارانی جی، مہارانی جی۔“ روپوتی کوئی خبر دینے
جاتی آئی تھی، مگر اسے دیکھ کر اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ
گیا۔ ”ہائے بھلوان، یہ کب پہنا آپ نے؟“

مہارانی نے کتاب سے نظریں اٹھا کر اس کی حیران
مایا کے تعاقب میں خود کو دیکھا۔

”کاشیوں کے تعاقب میں دار تک پاجامہ اور ہم رنگ لمبا کرتا“
سفید چوڑی دانت پاجامہ بڑا سا بے داغ اجلا سفید پوشہ اور
شانوں پہ پھیلا یہ بڑا سا بے داغ اجلا سفید پوشہ اور
بھورے سنہری بالوں کی ڈھیلی سے چوٹی سامنے کندھے
پر ڈالی ہوئی۔

”کیا تمہیں یہ خوب صورت نہیں لگا؟“

”ہائے نہیں دیوی جی، بہت سندر ہے۔“ روپا
استغراق سے اس کے چاروں اطراف میں گھوم کر اسے
دیکھتی واپس اس کے سامنے آئی۔ ”یہ خود سلوا یا آپ
نے؟“ وہ جوابات کہنے آئی تھی وہ بھول کر پوچھنے لگی۔
اس نے ابھی تک مایا کو ساڑھیوں اور مغربی لباس میں
دیکھا تھا، یہ نیا روپ اس کے لیے بہت منفرد تھا۔

”اوپن ہو۔ تمہارے دہلی میں کسی نے تحفتاً دیا
تھا۔“ وہ پھر سے کتاب کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”مہارانی کیوں مہارانی جی، کیا دہلی آپ کو اپنا نہیں
لگتا۔“ روپا وہیں اس کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

”کیا فائدہ ہندوستان کے شہروں کو اپنانے کا روپا؟
مجھے تو واپس انگلستان چلے جانا ہے چند دنوں میں۔“

روپوتی نے کچھ سوچتے ہوئے اسے دیکھا۔ سفید
کرتا پاجامہ پہنے کرسی پہ ٹانگ پہ ٹانگ رکھ کر بیٹھی وہ
شہزادیوں کی نمکنت واپی لڑکی کیا اٹھا کر گوپال راج کے
تال میں تھی؟

اس کے ذہن میں گزشتہ شام گوپال کی وہ باتیں
گونجنے لگیں، جو اس نے اسے بطور خاص بلوا کر تنہائی
میں کی تھیں۔

”مایا تم بہت بھروسہ کرتی ہے روپوتی تمہیں
لباس کو اپنا ہم خیال بنانا ہے۔“

روپوتی نے ایک چور نگاہ اس پہ ڈالی۔ وہ اسی
طرح ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائے کتاب پہ نظریں جھکائے
بیٹھی تھی۔

”کچھ کہنا چاہتی ہو روپا؟“ وہ کتاب سے نظر ہٹائے
بغیر پوچھنے لگی تو روپوتی کو لگا اس کی چوری پکڑی گئی
ہے۔

”کیا یہ ممکن نہیں ہے دیوی جی کہ آپ ہندوستان
سے نہ جائیں اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اوہرہ جائیں؟“

”جائے بھی دو روپا! شیکھر کے بعد کون ہے اب
میرا؟“

”میں ہوں دیوی جی، اور آپ کی ساری زمین
جائیداد۔“

مایا استہزائیہ ہنس دی۔ ”کیا کمبیشن ہے، روپ
وتی اور زمین، جائیداد۔“

”تو وہ بدربیا ہو بھی تو ہے نا۔“

”اس کا یہاں کیا ذکر؟“ اسے اچھنچا ہوا دھوپ
اب کرسیوں سے سمٹ کر دالان کی دیواروں تک رہ
گئی تھی۔

”اس نے کبھی کسی کو اہمیت نہیں دی، رئیسوں کی
بیٹیاں اس پہ مری ہیں، مگر وہ بہت مغرور بندہ ہے، لیکن
آپ کی بہت عزت کرتا ہے۔“

”تو اس نیزہ باز سے عزت کروانے میں اوہرہ
جاؤں؟“ نگاہیں پھر سے صفحے پہ جھک گئیں۔

”آپ جلی کھیں تو میں اداس ہو جاؤں گی۔“

”تمہیں نئی مہارانی جلد مل جائے گی روپا۔“

روپوتی کو سرائل گیا تھا۔ وہ جلدی سے بولی۔ ”تو
آپ بن جائیں نانی مہارانی!“

مایا نے ایک دم کتاب بند کر دی۔ اس کے ذہن میں
جیسے الارم سا بجا تھا۔

”میں کیسے بن سکتی ہوں تمہاری نئی مہارانی؟“

”چھوٹے ٹھاکر سے شادی کر کے! وہ آپ کو پسند
کرتے ہیں، مجھے سب پتا ہے۔“

”مگر یہ بات تمہارے چھوٹے ٹھاکر نے خود تو مجھے
نہیں کہی۔“

”آپ اشارہ دے دیں، وہ کہہ ڈالیں گے۔“ روپا کا
جوش دیدنی تھا۔

”میں کیوں اشارہ دوں؟ کہتا ہے تو خود کہیں۔“ اس

نے ہاتھ سے بال سنوارے۔ ”جاؤ میرے شو فر سے کہو گاڑی تیار کرے مجھے کہیں جاتا ہے۔“
 ”میں بس ہنسیا دیکھ لوں پھر۔“ روپا اٹھنے لگی۔
 ”تم نہیں روپا میں اسلی جاؤں گی۔“ ایک جتانی نگاہ اس پر ڈال کر وہ کھڑی ہو گئی۔
 ”کیلی؟“ روپو کی حیران سی کھڑی ہوئی۔
 ”ہاں، کیلی اور میں بات دہرانے کی عادی نہیں ہوں۔“

وہ حویلی کے اندر چلی آئی اور روپا وہیں فق چہرہ لیے اسے دور جاتے دیکھتی رہی۔
 ”تو اب تھا کر خادماؤں کو پیادے کے طور پر استعمال کریں گے۔“ میڑھیوں کے ساتھ کھڑی آئینے میں اپنا عکس دیکھتے وہ بڑبڑائی۔ ”نہیں تھا کر گوپال راج اتنی آسانی سے مایا فرینڈس کو کوئی نکل نہیں سکتا۔“ وہ خاموشی سے کھڑی کچھ سوچتی رہی۔
 دفعنا اس کے عکس کے پیچھے روپا کا چہرہ نمودار ہوا۔

”شو فر تیار ہے مہارانی جی۔“ روپو کی نے سر جھکا دیا اس کی آواز بہت پست تھی۔ وہ جان گئی تھی کہ اس نے مایا کا اعتماد کھو دیا ہے۔

وہ کچھ کے بغیر یا ہر آگئی۔ اس کی مورس اور شو فر تیار تھے وہ اسی گاڑی میں دہلی سے یہاں تک آئی تھی اور اپنے استعمال کے لیے یہ ہی گاڑی استعمال کرتی تھی۔

پھر تمام راستہ گاڑی میں بیٹھی کھڑکی سے باہر گاؤں کے کپے راستوں کو دیکھتی وہ کچھ سوچتی آئی تھی۔ اس کی سوچیں اس کے چہرے سے پڑھنا بہت مشکل تھا۔ شو فر نے مورس امروہ کے باغات کے سامنے روک دی۔ وہ ایک دفعہ پہلے شمشکھ کے ہمراہ اوہر آئی تھی۔ شمشکھ نے اسے بتایا تھا کہ کچی سڑک کے اس طرف والے باغ راجپوتوں جبکہ دوسری جانب والے ملکوں کے ہیں۔

بہت روز بعد آج اسے شمالی ملی تھی۔ وہ سینے پہ ہاتھ باندھے خاموشی سے گھنے درختوں کے درمیان

چلتی گئی جیسے کوئی صحرا میں بھٹکتا مسافر بغیر کسی منزل کے تعین کے یونہی ایک سمت میں بڑھتا چلا جائے۔
 ”مایا دیوی؟“ کوئی اس کے پیچھے آکر بولا۔
 وہ بہت آرام سے پٹی۔
 سامنے بدر کھڑا تھا۔ ہمیشہ کی طرح ہشاش بشاش اور وجہ۔

”راجپوتوں کے باغ میں ایک ملک کا کیا کام؟“
 ”نہیں ہے، تبھی تو ملک صرف اپنے اس باغ میں آیا ہے جہاں اسے نیلی راجپوتوں کی مہارانی کی آمد کی خبر ملی تھی۔“

”اچھا؟ یہ تمہارا باغ ہے؟“ مایا نے لاپرواہی سے شانے جھٹکے۔ ”میں غلطی سے شاید اس سمت آگئی۔“
 ”شیکھر کا باغ شاید سڑک کے اس طرف ہے۔“
 ”اسے شیکھر کا باغ کیوں کہتی ہیں؟ وہ تو اب آپ کی ملکیت ہیں۔“ وہ دونوں درختوں کے درمیان کھڑے تھے۔ دھوپ درختوں کے بیچ سے چھن چھن کر ان تک آ رہی تھی۔ دور چڑیاں بول رہی تھیں۔
 ”مجھے ان زمینوں جائیدادوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“

”شمشکھ کی جائیداد اچھی خاصی قیمتی ہے مایا دیوی۔“

”میری رشتے کی دادی برطانیہ کی ملکہ ہے اور تمہارا ہند عظیم اک برطانوی نو آبادی شمشکھ کی پادری غاڑان کی زمینیں بھی کوئین مدر کے راج میں آتی ہیں۔ تم ایک نو آبادی کے گاؤں کے ایک باغ کی قیمت ایک شہزادی کو گوارہ ہے ہو؟“ وہ ہلکا سا مسکرائی۔

”یہ غلطی پھر نہیں دہراؤں گا۔“ وہ بھی جواباً مسکرا دیا۔

”تمہارے حق میں بہتر رہے گا۔“ وہ درخت کی شاخ ہاتھ سے ہٹائی آگے گزر گئی۔

”نہیں پہچانتی ہیں؟“ شاخ ہاتھ میں پکڑے پکڑے مایا پٹی۔ وہ درخت کے اس پار کھڑا تھا۔ ان دونوں کے درمیان گھنی شاخیں حائل تھیں۔
 ”کیا؟“

تا مسافر بغیر کسی منزل
نہ رہتا چلا جائے
ہو آکر بولا۔

رج ہشاش بشاش اور

کا کیا کام؟
اپنے اس بلغم میں
لہ مارانی کی آمد کی

لے لاپرواہی سے
اس سمت آگئی۔
صرف ہے۔

قی ہیں؟ وہ تو اب
خوشی کے درمیان
چلے چکے تھے۔

ل رہی تھیں۔
کوئی دیکھی نہیں
سی قیمتی ہے مایا

ہے اور تمہارا
ہو کیا بدرعا زمان
س آئی ہیں۔ تم

کی قیمت ایک
لی۔
وہ بھی جواباً

ہے گا۔ وہ درخت کی
لی۔

لخ ہاتھ میں پکڑے
اس پار کھڑا تھا۔ ان
حائل تھیں۔

بدر نے اپنی ہتھیلی سامنے کی۔
سیاہ مٹی کے درمیان چند موتی جگمگا رہے تھے۔
مایا نے شارخ چھوڑ دی۔ وہ ہوا میں غوطہ کھا کر
لے گئی، پھر آہستہ آہستہ ساکن ہو گئی۔
مایا نے کہا۔ "اس نے بے نیازی سے شانے

دھکے دیے۔"
"جانتا تھا آپ کو یاد نہیں ہو گا۔"
"کس نے دیے تھے یہ موتی تمہیں؟" وہ انگلی پہ
ہاتھوں کی لڑی مروڑ رہی تھی۔
"میں نے ایک مہارانی کو روکنا چاہا تھا، میرے ہاتھ

میں اس کے بالوں میں جڑے چند موتی آئے تھے اس
نے کہا تھا یہ شاہی خاندان کا دستور ہے کہ جس نے
جس پر ہاتھ رکھا، وہ اس کو دے دیا گیا، سو وہ موتی اس
نے مجھے دے دیے۔" اس نے مٹھی بند کر کے ہاتھ

گرایا۔
"تم نے صرف اس کے موتی کیوں چھوئے؟ تم کچھ
بڑبڑاتی اپنے نام کو اسکتے تھے۔"
"اگر آپ میری جگہ ہوتیں اور کوئی ملکہ آپ کو
چھونے سے عطا کر دینے کا اختیار دے دیتی، تو آپ کیا

کرتیں؟"
"اگر کوئی ملکہ میرے اختیار دے تو میں اس کا تاج
لگاؤں۔ مگر میری بات نہیں سمجھو گے۔"
"میری بات آپ بھی نہیں سمجھیں۔" وہ ڈھلوزی
کی مٹی میں لتھڑے موتی واپس جیب میں ڈال کر

اصل سے شاخیں ہٹاتے ہوئے اس تک آیا۔
"آپ کی موتیوں کی یہ لڑی بہت خوب صورت
ہے، میں نے بھی آپ کو اس کے بغیر نہیں دیکھا۔"
"تم مجھے اس کے بغیر دیکھو گے بھی نہیں۔"
"کیا کوئی خاص وجہ ہے؟"

"بہت خاص۔"
"کس نے دی تھی یہ آپ کو؟"
"میری تیرہویں سالگرہ پر کوئی ملکہ بدر نے دی تھی۔
بدر نے کہا۔ "میں اسے کیوں پہنتی ہوں۔" وہ ایک
راست سے ٹیک لگائے بیٹھنے پر ہاتھ باندھے پوچھ رہی

تھی۔
"میں اسے اچھے شگون کے لیے پہنتی ہوں۔ جب
تک یہ پاس ہے، خوش بختی کا ہمارے سر پہ سایہ کے
رکھتا ہے۔ اگر کبھی تم ان موتیوں کو ٹوٹ کر بکھرتے
دیکھو تو جان لیوا کہ یا تو مایا نے دل ہار دیا۔ یا۔"

"یا؟" وہ منتظر تھا۔
"یا مایا نے جان ہار دی۔"
بدر نے ہاتھ بڑھا کر لڑی میں لگی بد صورت گرہ کو
تھما، اس کی انگلیاں مایا کے ملائم بالوں سے مس ہوئی
تھیں۔

"ادھر کیا ہارا تھا؟" وہ گرہ تھام کر پوچھ رہا تھا۔
"اور اگر مجھے کبھی اس سے بہتر کچھ ایسا مل گیا جو
خوش بختی کے ہمارے ہمیشہ میرے سر پہ رکھے تو میں خود
اسے توڑ دوں گی۔"

بدر نے گرہ چھوڑ دی۔ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ نظر انداز
کر گئی ہے تو پھر نہیں بتائے گی۔
"آپ ہمیشہ سفید رنگ کیوں پہنتی ہیں؟"
وہ اب ساتھ ساتھ چلتے باغ کے باہر کی سمت بڑھ
رہے تھے۔

"دیکھو، یہ ہندوستان کی بیواؤں کا دستور نہیں ہے؟"
"مگر آپ تو۔۔۔"
"تمہارا بیچارہ گھوڑا کیسا ہے؟"
وہ مایا کی مورس تک پہنچ گئے تھے، شو فرنے اسے
دیکھتے ہی کار کا پچھلا دروازہ کھولا۔
"بہت بہتر۔ آپ پھر حویلی نہیں آئیں۔"
"مجھے آنا تھا کیا؟"

"ایک دعوت آپ پر ادھار تھی۔"
"مگر میں نے کہا تھا نہ وعدہ کروں گی نہ کوشش، تو
پھر ادھار کیسا؟" وہ بیٹھ گئی تو شو فرنے دروازہ بند کر دیا۔
بدر نے بند کھڑکی کے اس پار بیٹھی اس لڑکی کو دیکھا،
وہ اب سامنے دیکھ رہی تھی، جیسے وہ وہاں موجود ہی نہ
ہو۔

شو فرنے گاڑی آگے بڑھا دی۔
وہ وہیں کھڑا دھول اڑاتی گاڑی کو دور جاتے دیکھتا

چاچی سب کے دھلے ہوئے کپڑے ڈھیر سے علیحدہ کر رہی تھی۔ پاس ہی زہرہ دوسری چاچائی پہ بیٹھی تھی۔

بدر کی قیص کی تہہ لگاتے چاچی نے لمحے بھر کو زہرہ کا چہرہ غور سے دیکھا۔ وہ اس کے ہاتھوں میں بڑی ہوتی تھی، اس کے ایک ایک رنگ کو چاچی پہچانتی تھی۔ پچھلے چند روز سے وہ اسے بہت چپ چاپ اور اکھڑی اکھڑی لگ رہی تھی۔

”زہرہ! اے زہرہ۔“

تہہ کیے کپڑوں کا ڈھیر لگاتے چاچی نے اسے پکارا۔ وہ بے دلی سے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ ”جاشاباش یہ اس طرف والے کپڑے بدر کے کمرے میں رکھ آ۔“

”جنتے کو کہہ دو چاچی۔“ وہ بے زاری بیٹھی رہی۔ ”نہ بدر کا کام جنتے کو کیوں کہوں؟ تیرے ہوتے ہوئے کوئی اور کیوں کام کرے اس کا؟“

”مجھے نہیں پتا بس مجھے بدر کا کوئی کام نہ کہا کرو۔“ غصے سے بولتے بولتے اس کی آواز بھر آئی۔ چاچی نے دیکھا اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگنے لگے تھے۔ ”زہرہ! ادھر میرے پاس آ۔“ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

”زہرہ! ادھر آ۔ مجھ سے کیا خفگی۔“

وہ سر جھکائے چاچی کے پاس آ بیٹھی۔

”بدر سے جھگڑا ہوا ہے؟“

”میرا کیوں ہو گا اب اس سے جھگڑا؟“

”اب؟“ چاچی ”اب“ کے لفظ پہ چونک اٹھی۔

”اب کیا ہوا؟ بدر تو ویسا ہی ہے۔“

زہرہ نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”وہ ویسا نہیں رہا چاچی۔“

”مگر کیا ہو گیا ایسا؟“ چاچی پریشان ہو گئی۔

”اب وہ انگریز میم جو آگئی ہے گاؤں میں۔ اب بدر

مگر نے لگے تھے۔ اسو اس کی پلوں سے لہرتا

”تو شیکھو کی بیوی کی وجہ سے پریشان ہے؟“

”تو نہ ہوں؟“

”اگرے اولیگی۔“ چاچی ہنس دی۔ ”وہ تو انگریز ہے۔“

اس کا ہم سے کیا جوڑ۔“

”جوڑ تو اس کا تھا کہ شیکھو سے بھی نہیں تھا۔“

شادی تو بچہ بھی اس نے کر لی تھی تا اس سے۔“ زہرہ

بست دیکھی تھی۔

”مگر تجھے اس سے کیا ڈر ہے؟ وہ تو واپس انگلستان چلی جائے گی۔“

”اور اگر وہ بدر کو ساتھ لے گئی تو؟“

”بدر کوئی بچہ ہے جو اسے ساتھ لے جائے، جملی نہ ہو تو۔“ چاچی ہنستے ہوئے کپڑے تہہ کرتے لگی۔

”تجھے نہیں پتا چاچی، تو نے ابھی اس کو دیکھا نہیں ہے۔“ زہرہ کی آنکھوں کے سامنے منڈیر پہ بیٹھی سنہری بالوں والی لڑکی آگئی۔

”کیا میری زہرہ سے زیادہ حسین ہے؟“

”نہیں چاچی، بہت حسین نہیں ہے، مگر وہ ساہو

سے، اور تیری زہرہ کو سحر کرنا نہیں آتا۔“ اس نے

شکستگی سے سر جھکا دیا، ”اسو اس کی ہتھیلی پہ گر رہے تھے۔“

”تو تم نہ کر زہرہ! جب اتنے برس ولایت پر رہنے کے

باوجود کوئی میم بدر کو نہیں ہتھیلیا سکی تو چند دنوں میں یہ

تھا کرانی کیا کر لے گی؟ اگر بدر کو میموں کے چکر میں پڑنا

ہو تا تو وہ بھی شیکھو کی طرح ایک میم اٹھاتا۔“

”اب تو بدر بڑا ہوا ہے نا میم کے چکر میں اس روز

وہ حویلی آگئی، کل شہر تو تار رہا تھا وہ ہمارے باغ میں آگئی

اور بدر اسے لے کر گھومتا رہا۔ کبھی مجھے تو بل غ کی میر

نہیں کرائی، سارا غصہ اور رعب میرے لیے ہے اس

سے تو ہنس کر بات کرتا ہے؟“

”غصہ اینوں پہ ہی کیا جاتا ہے، انسان حق اینوں پہ

ہی جاتا ہے، پرانی لڑکی کو وہ کیا کہہ سکتا ہے۔ تو غم نہ کر

یہ گوری میمیں زیادہ دیر ٹکٹنے والی نہیں ہو تیں۔ دیکھی

پکوں سے ٹوٹ کر
پریشان ہے؟

”وہ تو انگریز ہے“

سے بھی نہیں تھا
اس سے۔ ”زہرہ

تو واپس انگلستان

لے جائے، جھلی نہ
نے لگی۔

س کو دیکھا نہیں
منڈیر پہ بیٹھی

”ہے، مگر وہ ساحرہ
”اس نے
لی پی کر رہے

ت پر ہنسنے کے
دروں میں یہ
لے چکر میں پڑنا
الانا۔“

ن۔ اس روز
باغ میں آگئی
وہ باغ کی سیر
لیے ہے اس

حق اپنوں پہ
تو غم نہ کرے
نیں۔ دیکھتی

نہیں ہے کیسے ابھی شیکھر مراد اور ابھی وہ اونے پونے
نہیں چکر واپس جاری ہے؟ جب اتنی بڑی جائیداد
اس کا راستہ نہیں روک سکی، تو ایک بدر کے لیے وہ
بے رک جائے گی؟ ان انگریزوں کو محبت، رشتوں کا
کیا پتا بھلا؟ شیکھر کی بات اور بھی وہ شہر میں رہتا تھا
اگر لڑکی گاؤں میں رہنے والی ہوتی تو شیکھر اس کے
لے آگے سے شہر میں کوٹھیاں کیوں بناتا؟ پہلے دن ہی
گاؤں میں نہ لے آتا؟ تو بھی کس کا غم کر رہی ہے زہرہ!
جائے دے اس کو، نظر انداز کر۔ اس نے چند دن میں
ملے جاتا ہے، اور بدر کہاں ماں کی بات مالتا ہے۔ اس
گھر کی ہو صرف تو بنے گی، یہ تو بچپن سے ملے ہے۔
اب جائے کپڑے جا کر بدر کے کمرے میں رکھ آ۔“
بات زہرہ کے دل کو لگی تھی، وہ ایک دم ہلکی پھلکی
ہو کر ابھی، اور آنسو صاف کرتی کپڑے اٹھا کر اندر چلی
گئی۔

چاچی باقی ڈھیر کو دوسری چارپائی پہ رکھنے لگی۔

وہ پلنگ پہ آڑی تر چھی لیٹی تھی۔ سپید بازو سے
آنکھوں کو ڈھانپ رکھا تھا۔ شب خوالی کا گلابی رنگ کا
لباس اس کے گتوں سے کچھ اور تنگ آتا تھا، اور
وہ حیا بے داغیوں بستر سے نیچے لٹک رہے تھے۔
وہ سو نہیں رہی تھی، یونہی لیٹی کچھ سوچے جارہی
تھی۔

ایک دم اسے لگا کسی نے ہولے سے ٹخنے سے کچھ
اوپر اس کی پنڈلی پہ ہاتھ رکھا ہے۔ ایک جھٹکے سے ماہا
اٹھ بیٹھی۔

گوبال پلنگ کی پائنٹی کے قریب کھڑا تھا۔
”آپ ادھر کیا کر رہے ہیں؟“ وہ ناگواری سے کہتی
اٹھ کھڑی ہوئی اور وال کلاک کو دیکھا۔ رات کا ایکسج
رہا تھا۔

”بہت محسوس ہو رہی تھی، سوچا آپ سے گپ
شب لگال جائے،“ اس کی آنکھیں ہلکی ہلکی سرخ
تھیں شاید وہ نشے میں تھا۔

”رات کے ایک بجے آپ کو گپ شب لگانے کا
خیال کیوں آیا؟“ اس کے اندر غصے کی لہر ابھی تھی۔
”کیا میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا؟“ وہ دو قدم آگے
بڑھا۔

مایا پیچھے ہٹی۔

”آپ ابھی اور اسی وقت یہاں سے تشریف لے
جائیں۔“ غصے سے اس کی آواز بلند ہونے لگی۔

”مایا دیوی ہم مل بیٹھ کر۔“ وہ چند قدم مزید اس
کے قریب آیا۔

”مل بیٹھ کر کیا؟“ مایا نے ایک دم اسے کہنی سے
پکڑا اور دھکیلتی ہوئی دروازے تک لائی اور پتھر اس
سے کہ وہ سنبھل پاتا، اس نے اسے باہر دھکا دے
دیا۔ ”آئندہ ایسی ہمت بھی کی تو دیکھنا مایا فرینڈس کو
تم ابھی جانتے نہیں ہو۔“

اور پھر تیزی سے دروازہ بند کر کے اس نے چٹنی
چڑھا دی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

وہ وہیں دروازے سے لگی نیچے بیٹھتی چلی گئی۔

”کب آیا یہ میرے کمرے میں؟ مجھے پتا کیوں نہ
چلا۔ آج جو کچھ ہو جاتا تو۔“ وہ بڑبڑاتی تھی، آہستہ
آہستہ اس کی بڑبڑاہٹ دھیمی پڑتی گئی۔
اس نے سر گھٹنوں پہ رکھ دیا۔

”شیکھر، تم کیوں مر گئے؟ تم کیوں مجھے اکیلا کر
گئے؟“

اور اس شام بہت اچانک سے وہ بدر کو پھر نظر آگئی۔
وہ کسی کام سے اپنی زمینوں کی طرف جا رہا تھا، جب
کنویں کے قریب سے گزرتے ہوئے اسے ایک لڑکی
کی پشت پہ جھولتی سنہری چوٹی دکھائی دی۔

اس نے گھوڑے کی راگام کھینچی۔

وہ کنویں کی منڈیر پہ بیٹھی تھی، اس کی بدر کی جانب
کمر تھی بالکل گم غم سی بیٹھی سر اٹھائے آسمان کو
دیکھ رہی تھی۔

وہ گھوڑے سے اتر آیا۔

”کیا تھا کروں نے اب مہارانیوں سے پانی بھرنے کا کام لینا شروع کر دیا ہے؟“ بہت آہستہ سے وہ اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔

مایا چونک کر کھڑی ہوئی۔ پہلی دفعہ تھا جب بدرنے اسے پول چوکنے دیکھا تھا ورنہ وہ ہمیشہ بہت پرسکون رہا کرتی تھی۔

”مہارانیوں اپنی مرضی سے گھوم پھر تو سکتی ہیں۔“ وہ سنبھل کر مسکرا دی مگر بدرنے کو اس کی مسکراہٹ بہت پسند نہ آئی۔

اس نے بغور مایا کو دیکھا۔

اس نے آج پھر سفید کرتا نایابا اور بڑا سا سفید دوشہ لے رکھا تھا۔ چہرے پر سنہری زینیں گر رہی تھیں اور وہ یار انگلیوں سے انہیں کانوں کے پیچھے اڑس رہی تھی۔ بدرنے کو وہ کچھ پریشان سی لگی۔

”طبیعت ناما زبے مہارانی کی؟“

”ہوں؟“ وہ جیسے پھر چوکنی طور نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں تو ہرگز نہیں۔“ اس کی ازلی برہنہ آج مفقود تھی۔

پھر وہ واپس منڈیر پہ بیٹھ گئی بدرنے بھی اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ دونوں کی پشت پر گہرا کنواں تھا اور کنویں کے اس طرف اس کا سفید ٹھوڑا گردن جھکائے جھاڑیوں میں منہ مار رہا تھا۔

پھر کتنی ہی بل پونی خاموشی سے سرکتے رہے۔

بیلی راجپوتوں کی ٹھنڈی میٹھی شام ڈوب رہی تھی۔ کنویں کے ساتھ بڑا سا پیری کا درخت تھا جس کے کچے پیران کے قدموں میں بکھرے بڑے تھے۔ وہ دونوں گنتی ہی دیر ڈوبتی شام کی دم توڑتی دھڑکنوں کی آواز سننے رہے پھر بدرنے خاموشی توڑی۔

”کچھ پریشان لگ رہی ہیں۔“

”نہیں تو۔“ مایا نے سر جھکا دیا۔ وہ جوتے سے زمین پر گرے پیرا دھرا دھرا کر رہی تھی۔

”کوئی مسئلہ ہے کیا؟“

”ہاں۔“ وہ اسی طرح اضطرابی انداز میں انگلیاں جٹھا رہی تھی۔

”ایک بات کہوں مایا دیوی۔“

وہ پھر سے چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

”اس گاؤں میں بہت سے لوگوں سے آپ کے

ایسے تعلقات ہوں گے مگر ایک بات یاد رکھیے گا مایا آپ کے خیر خواہ بہت کم ہوں گے۔“

مایا نے سر شاکتی سے جھکا دیا۔ آج وہ بہت تھکی تھکی لگ رہی تھی۔

”اور اس طرح تمہارا دھرنہ گھوما کریں۔ کسی کو ساہو لایا کریں۔“

”مجھے ٹھاکروں کی خاماواں ہے۔ بھروسہ نہیں ہے۔“

”اور مجھے گاؤں کی فضا ہے۔ بھروسہ نہیں ہے۔ آپ

جانتی ہیں ایک سو کاٹڑ بھوت یہاں پھر رہا ہے۔ وہ آپ کو نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔ جتنا میں اسے جانتا ہوں

وہ آپ کی جان کے لیے خطرہ ہو سکتا ہے۔ اسی لیے کہہ رہا ہوں یہاں آپ کے خیر خواہ بہت کم ہیں۔“ وہ نرمی سے سمجھا رہا تھا۔

اس کی سنہری آنکھوں میں پانی تیرنے لگا۔ ”کیا واقعی شکھو کے بعد یہاں میرا کوئی خیر خواہ بچا ہے؟“

”شکھو سے شادی کیوں کی بھی آپ نے؟ آپ

کا اور اس کا جوڑ نہیں تھا۔“ مایا نے سر اٹھا کر سامنے دیکھا۔

دور اتر پہ بادل بکھرے تھے ان کے کنارے ڈوبتے

سورج کی آخری کرنوں سے سرخ پڑ رہے تھے۔

”محبت یہ سب نہیں دیکھتی بدرنے؟“

”مگر کم از کم اس کو تو دیکھتی ہے جس سے محبت کی

جاری ہو۔“

مایا نے ادا اس مسکراہٹ سے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ

سنجیدگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ رقابت کا جذبہ کہیں نہ

کہیں اس کی آنکھوں سے جھلکتا تھا۔

”ہاں اسی کو تو دیکھا تھا۔“ وہ پھر سے سامنے دیکھنے

لگی۔ سارنجی بادلوں کے سامنے سے پرندوں کا ایک غول

اڑ رہا تھا۔

”مگر کیا دیکھا تھا؟ آپ برطانیہ کی شہزادی اور

شکھو ہندوستان کا ایک ایسا رئیس زادہ جس سے

ایسی محبت

بڑا دل نہیں زادے یہاں بکھرے پڑے ہیں۔
وہ سامنے پرندوں کے غول کو دیکھتی زخم خوردہ سی
سکرا دی۔
”میں کیا جانو تیرہ باز لڑکے! میں نے اس میں کیا دیکھا
تھا، وہ جو ہندوستان کے کسی رئیس کے پاس نہیں تھا۔
تم جان گئے تو شاید صدیوں اپنی جگہ سے ہل نہیں سکو
گئے۔“

”اور کیا تھا وہ؟“

”اما منڈیر سے اٹھی اور جھک کر پیر چنے لگی سپانچ
موتے موتے پیر چن کر وہ سیدھی ہوئی۔“

”یہ دیکھو۔“ اس نے پانچ پیر بھیلی پہ رکھے اور
بھیلی بد کے سامنے کی۔

”مگر میں ان بیروں کو باری باری چاروں اطراف
میں پھینکوں ایسے۔“ اس نے ایک ایک کر کے
چاروں پیر بوری قوت سے شمال، جنوب، مشرق اور
مغرب کی طرف اچھالے، چاروں پیر کمپاس کی سوئیوں
کی طرح دور جا کرے۔

اس نے آخری پیر اوپر آسمان کی جانب اچھالا۔ پیر
تیزی سے ہوا میں اوپر اٹھتا گیا۔ مایا اور بدر گردن اوپر
اٹھائے اسے دیکھتے رہے۔ وہ کافی اوپر جا کر ایک ٹانھے کو
ہوا میں ٹھہرا اور پھر نیچے آن گرا۔

”دیکھا تھا اس بلند ترین پوائنٹ کو جہاں وہ پیر جا کر
ٹھہرا تھا؟“ بدر نے کسی معمول کی طرف سر ہلا دیا۔

”اور وہ چاروں پیر دیکھے تھے جو دور دور جا کرے،
جیسے کسی چوکور کے چار کونے ہوں۔ اب تم ریاضی کی
کسی تصویر کی طرح ان چاروں بیروں کو لکیروں سے
جوڑ دو اور سمجھو کہ ان لکیروں کی جگہ بلند و پواریں ہیں
جو اوپر اس پوائنٹ تک جاتی ہیں جہاں تک آخری وہ
پیر گیا تھا، پھر تم اس چوکور کو اوپر سے نیچے تک سونے،
چاندنی اور جواہرات سے بھر دو، تب بھی یہ تمام قیمتی
جواہرات مل کر بھی اس کو برابر نہیں کر سکتے، جو میں
نے شیکھر میں دیکھا تھا۔“ وہ واپس منڈیر پہنچ گئی۔
”اور آپ کو لگتا ہے کہ شیکھر کو بھی آپ سے
اتنی ہی محبت تھی جس کے آگے دنیا کی تمام دولت کا

ڈھیر پڑتا ہے؟“

”ہاں، بالکل!“ وہ فخر سے مسکرائی۔ اسی میں ایک
تتلی اس کے چہرے کے سامنے سے گزری، مایا چونکی
پھر ہاتھ بڑھا کر تتلی کو تھامنا چاہا، مگر وہ اڑ گئی۔ وہ ایک دم
اس کے پیچھے دوڑنی لگی۔ تتلی بیری کے درخت کے
پیچھے چھپنے لگی، مگر مایا نے کسی معصوم شہزادی جیسی
طرح ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑ لیا۔ پھر ہند کٹھی لے کر بدر
کی طرف آئی۔

”مجھے تتلیاں اچھی لگتی ہیں۔“ وہ جھینپ کر بتا
رہی تھی۔

”اب آپ بہتر لگ رہی ہیں مہارانی جی، ورنہ اتنا تو
میں جان گیا ہوں کہ آپ پریشان ہیں۔“

مایا کے چہرے سے سایہ سا گزر گیا، اس نے مٹھی
سنختی سے پیچھے لی، شاید اسے بھول گیا تھا کہ اندر تتلی
بھی ہے۔

”آپ مجھ سے شیر کر سکتی ہیں۔“

وہ شکست خوردہ سی واپس بیٹھ گئی۔

”آپ کی آنکھیں سرخ ہیں جیسے آپ رات بھر
سوئی نہیں ہیں۔“ مایا نے سر جھکا دیا اس کی آنکھیں بھر
آئی تھیں۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے بہنوں کے لیے

نیم حرارتی کے 3 خوبصورت ناول

ستاروں کا آئین قیمت - 400/- روپے

تو شریک سفر ہا قیمت - 300/- روپے

میرے دل، میرے مسافر قیمت - 250/- روپے

ناول نگار نے کے بی کتاب ڈاک خرچ 45/- روپے

نگار نے کے بی

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37 اردو بازار کراچی

فون نمبر 32216361

”میں خود کو غیر محفوظ تصور کرنے لگی ہوں۔“
 ”ٹھاکروں کی حویلی بہت محفوظ ہے۔ وہ چغہ پوش
 ادھر نہیں پہنچ سکتا۔“
 مایا نے سر اٹھایا اور بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھا۔
 ”میں ٹھاکروں کی حویلی میں خود کو غیر محفوظ سمجھتی
 ہوں، مجھے ساری رات نیند نہیں آئی۔“
 بدر نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”کیوں؟“ پھر جیسے
 اسے خیال آیا۔ ”کیا گویا نے کچھ کہا ہے؟“ اس کے
 ماتھے پر شکنیں ابھر آئی تھیں۔
 ”وہ دو روز پہلے رات کو میرے کمرے میں آگیا،
 بہت مشکل سے میں نے اسے باہر نکالا۔“
 ”اور کل رات پھر وہ آیا تھا؟“

”کل رات؟“ مایا نے سوچتے ہوئے سر اٹھایا۔
 ”کل رات ایک عجیب سی بات ہوئی، میں کمرہ بند کر کے
 بقیات گل کر کے بالکونی میں بیٹھی تھی کہ۔۔۔ وہ
 کنفیو زڈ سی چپ ہو گئی۔“

”بتائیے مایا دیوی۔“
 ”بالکونی سے حویلی کا پچھلا حصہ دکھائی دیتا ہے،
 وہاں کچھ گودام اور جانوروں کے باڑے بنے ہیں۔ کل
 پورے چاند کی رات تھی، مجھے چاندنی میں بس اتنا نظر
 آیا کہ کوئی لمبا سا شخص جسم کے گرد سیاہ چادریا کوئی بڑا
 سا کپڑا لپیٹے احتیاط سے ادھر ادھر دیکھتا اندر داخل ہوا
 اور دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ اتنی رات کو چوروں کی
 طرح کیوں کوئی داخل ہو گا حویلی میں، میں یہ سمجھ نہیں
 سکی۔“

”مگر میں سمجھ گیا ہوں۔ وہ وہی بھوت تھا اور یقیناً
 اس وقت پرانے قبرستان سے واپس آ رہا تھا۔“
 ”مگر وہ حویلی میں کیوں آیا؟“

”اس لیے کہ اس کا تعلق آپ کی حویلی سے ہے۔“

مایا سن سی ہو کر رہ گئی۔ ”کون؟ گویا؟“

بدر خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

”تمہیں۔۔۔ تمہیں منگل سنگھ نے اس بھوت کا

نام بتایا تھا، کیا اس نے گویا کا نام لیا تھا۔ کیا وہ گویا
 ہے؟“

بدر نے آنکلی سے نفی میں سر ہلایا۔

”پھر؟ کون ہے وہ؟“ وہ بے قراری سے بولے۔

”آپ یقین نہیں کریں گی۔“

”تم بتاؤ تو سہی، میں اس جستجس سے بے زار آچکی
 ہوں۔“

”تو پھر سنئے۔ وہ بھوت دراصل ٹھاکر شیکھو ران
 ہے۔“

مایا کی مٹھی کھل گئی، مری ہوئی تھلی نیچے آن کر۔
 وہ ساکت سی اسے دیکھ رہی تھی۔

”شیکھو زندہ ہے؟“

وقت رگ گیا، لمحے ساکن ہو گئے، فضا قہقہہ مچی، وہ
 اسی طرح گم صم اسے دیکھنے لگی۔

”ہاں، جہاں تک میرا قیاس ہے، وہ زندہ ہے۔ وہ
 سامنے آسمان پہ اترتے بادل دیکھ رہا تھا۔“

مایا نے دونوں ہاتھوں سے سر قہام لیا۔ سب کچھ
 جیسے گنڈ ہو رہا تھا۔

منگل سنگھ کے الفاظ شیکھو کا زندہ ہونا۔۔۔ یہی
 راجپوتان کا بھوت کیا سچ تھا، کیا جھوٹ، وہ فیصلہ نہیں

کر پار رہی تھی کہ اس سے صورت حال کیا سمجھے۔
 کتنے بل سرک گئے تو اس نے سر اٹھایا۔

دور نیلے افق پر مسخ بادل بکھرے تھے، بدر ابھی
 تک ان کو دیکھ رہا تھا۔ وقعتاً اس نے گردن موڑ کر

اسے دیکھا۔ اس نے پہلی دفعہ مایا کی اڑی اڑی رنگت
 دیکھی تھی۔ وہ اسے اتنی پریشان اور بے یقین پہلے کبھی

نہیں لگی تھی جتنی ڈوبتی شام کے اس سے لگ رہی
 تھی۔

”مایا۔۔۔! اس نے دھیرے سے اس کا ہاتھ ہلایا۔

اس کی جلد بہت ملائم تھی جیسے موسم کی بنی ہو۔
 وہ اسی طرح بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”مایا۔۔۔! بدر نے پھر اسے دیکھا۔
 پیری کے درخت سے کوئی پرندہ زور سے اڑا،

شاہیں زور سے جھنجھاکر رہ گئیں۔ چند ہیر ٹپ ٹپ ان کے کندھوں میں آن کرے۔

”تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ زندہ ہے؟“ وہ پلکیں جھپکائے بغیر اسے دیکھ رہی تھی۔ بدر کا ہاتھ ابھی تک اس کے ہاتھ پر تھا۔

”تمہیں لگتا ہے کہ وہ مر چکا ہے؟“

”مجھے یقین ہے کہ وہ مر چکا ہے۔“ وہ دہلی دہلی سے پلائی۔

”منگل سنگھ نے مرنے سے پہلے شیکھر کا نام لیا

تھا۔“ بدر نے ہاتھ پیچھے پھینچ لیا۔ ”میں قبرستان کے

زیب سے گھوڑے پہ گزر رہا تھا، مجھے کسی کے چیخنے کی

آواز آئی۔ میں گھوڑے سے اتر کر اندر آیا تو خون کا دریا

تھا اور منگل سنگھ تڑپ رہا تھا۔ میں لپک کر اس کے

پاس گیا۔ اس کا چہرہ ہتھپتھپایا، مگر اس کی آخری سانسیں

نہیں۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”جو بدری تجھے کس نے مارا ہے؟ تو ادھر کیوں آیا

تھا؟“

وہ ہاتھ اٹھا کر بمشکل بولا۔ ”وہ بھوت۔۔۔“

”تجھے بھوت نے مارا ہے؟ کون تھا وہ؟“

منگل سنگھ نفی میں سر ہلانے لگا۔ ”وہ بھوت نہیں

۔۔۔ وہ شیکھر۔۔۔ بس یہی الفاظ میں سمجھ سکا، اس

نے مرنے سے شیکھر کا نام لیا تھا۔

”کیا پتہ منگل سنگھ کو غلط فہمی ہوئی ہو۔۔۔“ وہ یقین

نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔

”مرا آدمی بھوت نہیں بولتا۔“

”مگر تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ شیکھر زندہ ہے؟“

”اور تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ شیکھر مر چکا ہے۔“

”اب سے تم پر آگیا تھا۔“

”بدر! وہ صدمے سے اسے دیکھتی رہی۔“

”کیا تم نے اس کا چہرہ دیکھا تھا؟“

”میں امرتسر میں تھی اور جب تک میں وہاں پہنچی

اس کی چٹا چل چکی تھی۔ وہ مر چکا ہے بدر وہ زندہ نہیں

ہو سکتا۔“

وہ بے چین سی ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر اپنی ہتھیلی کو دیکھا۔ ہتھیلی خالی تھی مگر ہتھیلی کے رنگ اس میں رہ گئے تھے۔

”میں نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا مگر ایک گوانی دل

دیتا ہے اور میرا دل بولتی دیتا ہے کہ وہ مر چکا ہے بالکل

ایسے ہی جیسے میری ہتھیلی میں بند تلی جانے کب مر

گئی۔ میں نے وہ مری ہوئی ہتھیلی نہیں دیکھی، مگر مجھے

اس کے یہ کچھ رنگ بتاتے ہیں کہ وہ مری ہے۔“

مایا نے ادھر ادھر زمین کو دیکھا، مردہ ہتھیلی وہاں نہیں

تھی۔ ہوا کا کوئی جھونکا اسے اڑا کر دور لے گیا تھا۔

”مایا۔۔۔ شیکھر کا مردہ چہرہ تم نے تو کیا گاؤں میں

کسی نے نہیں دیکھا، اس کو اس کی کھڑی سے پہچانا

گیا۔ کیا تمہیں یہ سب بہت زیادہ سادہ لگتا ہے کہ ادھر

اس کی موت ہوئی اور ادھر اس کی پتا جلادی گئی۔“

”تھا کر رگھوناتھ کہہ رہے تھے کہ لاش کی حالت

بہت خراب تھی سو اسی لیے ایسا کرنا پڑا۔“

بدر نے استہزاء سے سر جھٹکا اور منڈیر پر دونوں ہاتھ

رکھے سر جھٹکا کر کنوئیں میں جھانکا۔

”یہ سب اتنا سادہ اور قدرتی نہیں ہے جتنا بتایا گیا

ہے۔ تھا کروں نے پولیس کو تفتیش نہیں کرنے دی۔

آخر کیوں؟“

”مجھے کیا پتا کیوں؟“ وہ کوفت سے کھڑی ہو گئی، مگر

مجھے یقین نہیں ہے کہ وہ زندہ ہو سکتا ہے۔“

بدر اب تک منڈیر پر جھٹکا کنوئیں میں دیکھ رہا تھا۔ مایا

نے بھی اس کی طرح ہاتھ رکھ کر کنوئیں میں جھانکا۔

سیاہ پانی میں سفید آسمان اور دو سائے نظر آرہے

تھے، ایک مرد کا اور ایک عورت کا عورت کے سایہ میں

اس کے کندھے پہ بڑی چوٹی اور شانوں پر پھیلا دوپٹہ

واضح تھا۔

”تم تو کہتی تھیں کہ تم میری بات پر یقین کر لو گی۔“

”میں اب بھی یہی کہتی ہوں۔“

”پھر میری بات پر یقین کیوں نہیں کر رہی؟“

”کیونکہ یہ تمہاری نہیں منگل سنگھ کی ہے۔“

یاد وہ کچال

بولی۔

زار آچکی

کھوراج

آن گری۔

تھم گئی وہ

ہے۔ وہ

سب کچھ

ہونا۔۔۔ بلی

وہ فیصلہ نہیں

کچھ۔

تھے بدر ابھی

لہرون موڑ کر

یا اڑی رنگت

چین پہلے کبھی

سے لگ رہی

کا ہاتھ ہلایا۔

ہو۔

ہی تھی۔

ور سے اڑا

”مرتا آوی جھوٹ نہیں بولتا ایڈی شیکھر!“ وہ سیدھا ہو کر تختی سے بولا۔ بابا پانی کو دیکھ رہی تھی اب وہاں صرف ایک سایہ تھا، جھلی ہوئی عورت اور اس کی کندھے پر پڑی چوٹی۔

”اور میں مرنے والے آدمی کے بچ پر تب تک اعتبار نہیں کروں گی جب تک میں شیکھر کو نہیں دیکھ لیتی، ورنہ میرے لیے وہ مر چکا ہے۔“

عورت کے سایہ کے اوپر سے برندوں کے غول کا سایا اڑ رہا تھا۔ مایا نے گردن اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ وہاں کوئے ایک غول میں شمال کی جانب اڑتے جا رہے تھے۔

”جس دن شیکھر کی موت واقع ہوئی تھی اس دن وہ کہاں تھا؟“

”میں اس روز امرتسر میں تھی مجھے نہیں معلوم۔“

ایک دم ہی وہ تیزی سے بولی اچھڑ ہو گیا۔

بدر اسی طرح سامنے سرخ کناروں والے بادلوں کو دیکھ رہا تھا۔

”سب کیا بتاتے ہیں؟ وہ آخری بار کدھر گیا تھا۔“

”مجھے معلوم نہیں ہے۔“ وہ سینے پہ ہاتھ باندھے کنوئیں سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔

”کسی ملازم نے کچھ تو بتایا ہو گا۔“

”معلوم نہیں۔“ وہ بھی اب سرخ بادلوں کے پیچھے ڈوبتے سورج کو دیکھ رہی تھی۔ ”ہاں روپا نے آخری دفعہ اسے کچے راستے پہ دیکھا تھا، کھوجی نے بھی یہی بتایا تھا کہ وہ مہمان خانے میں جانے سے قبل پرانے قبرستان کی طرف۔“

”ایک دم وہ رک گئی اور بدر کو دیکھا وہ بھی جیسے چونک کر اسے دیکھنے لگا تھا۔“

دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور پھر مایا نے سر جھکا دیا۔ شاید اس نے ہار مان لی تھی۔

”شیکھر مرنے سے پہلے پرانے قبرستان گیا تھا؟“

بدر نے دہرایا۔ اس نے جواب نہیں دیا اسی طرح سر جھکائے قدموں میں بکھرے کچے پیر دیکھتی رہی۔

”کیا تمہیں اب میری بات کا یقین ہے؟“

مایا نے کھٹکے کھٹکے انداز میں سر اٹھایا۔ اس کی سرخی آنکھوں میں سرخی دوڑ رہی تھی۔

”واقعی بدر؟ کیا وہ زندہ ہو سکتا ہے؟“

”اگر وہ ہوا تو ہمیں خوشی ہوگی۔“

اس کے گم صدم سے چہرے پر مغموم سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ وہ غور سے اس کے چہرے پہ اتنی خوشی کی رملق کو جانچ رہا تھا۔

”بہت محبت تھی تمہیں اس سے؟“

”ہے، ابھی تک اتنی ہی ہے۔ اگر وہ زندہ ہے تو کیا تم میرا شوہر ڈھونڈنے میں میری مدد کرو گے؟“

”ہاں کیوں نہیں ضرور۔“ وہ پھیکا سا مسکرایا۔

”مگر یاد رکھنا منگل سنگھ کے قاتل کے ساتھ نہ میری ہمدردی ہوگی اور نہ تمہاری ہونی چاہیے۔“

اس کے سخت لہجے۔ مایا نے ٹھنک کر بغور اس کی آنکھوں میں دیکھا بہت نقاخر سے مسکرائی۔

”تم جلتے ہو شیکھر سے؟“ اٹھی ہوئی گردن بجاتا ہوا مغرورانہ انداز اور وہ بھی ایک ادا لیے ہوئے وہ اتنا مسکورتھا کہ تردید بھی نہ کر سکا۔

وہ اسے ٹھیک کہتا تھا۔ وہ واقعی ملکہ تھی، بیلی راجپوتوں کی ملکہ۔

”تمہیں شیکھر سے کوئی رقابت نہیں ہونی چاہیے۔“ اس نے چوٹی کندھے سے کمر پر پھینک دی۔

”لیکن اگر اس نے کچھ غلط کیا ہے تو اس کی سزا اسے ملے گی لیکن اگر وہ بھوت شیکھر ہے تو مجھے یقین ہے وہ کچھ غلط نہیں کر سکتا۔“

”اس کا فیصلہ وقت کرے گا۔“

مایا نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ سرخ بادل بکھرتے جا رہے تھے۔

”شام ڈوبنے کو ہے، میں چلتی ہوں۔“ پھر جاتے جاتے مڑی، ”سنو مجھے حویلی تک چھوڑ آؤ گے؟ مجھے تمہارے بیلی راجپوتوں کے رستے نہیں آتے۔“

وہ مسکرا کر اس کے ساتھ چل دیا۔

خانا

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

لاہور

ستمبر 2010 کا شمارہ "میرا گھر" شائع ہو گیا ہے

ستمبر 2010 کے شمارے کی ایک جھلک

☆ "کچھ ہل زیت کے" عید کے حوالے سے مصنفین سے سروے

☆ "اے وطن تجھے سلام" ہمشہرہ ناز کا مکمل ناول

☆ "دفا کی راؤ گزر" مدیحہ جیسلم کا مکمل ناول

☆ "رنگ عید ساعتوں کے" شغافل تاش کا مکمل ناول

☆ "وطن کی مٹی غواہ رہا" نازیہ سیاد کا ناول

☆ "راستے محبت کے" شگفتہ بھٹی کا ناول

☆ ان کے علاوہ میرا گھر، تحسین اختر، شازیہ مصطفیٰ اور

کے انسانی

☆ "چرا سادشت" فرحت شوکت کا سلسلے وار ناول

☆ "میرے سحر سے کو" امیریم کا سلسلے وار ناول

☆

☆

پیارے مجھے کی باتیں، انا کا نام، رات و بھر، شہر
کی دنیا کی دلچسپ معلومات کے علاوہ
کے سبھی مستقل سلسلے شامل ہیں

ستمبر 2010 کا شمارہ

آئیے اپنے گھر میں ایک انسانی سے طلب کریں

"راستے نہیں آتے تو یہاں تک کیسے پہنچی تھیں؟"

وہ جھپٹ کر ہنس دی "میں تو راستہ بھٹک کر اوڑھ بڑھ
کی تلاش میں بیٹھی تھی ورنہ تمہیں لگتا ہے راجپوت
اپنی ہوسیلی سے پانی بھروا میں گئے؟"
وہ ساتھ ساتھ چلتے رہے یہاں تک کہ کھیت
سامنے آگئے۔

وہ وہیں رُک گیا۔

"لیجی لیڈی شکھڑ" آپ کی حویلی سامنے ہے۔"

"اندروں تک نہیں آؤ گے؟"

وہ کھیتوں کے ساتھ کھڑے مسکرا کر باتیں کر رہے
تھے اور یہ منظر اپنے کمرے کی کھڑکی سے ٹھاکر گوپال
راج نے بہت غور سے دیکھا تھا۔ وہ جگہ وہاں سے اتنی
دور نہ تھی۔

"اندروں آئے کا فائدہ۔"

"راجپوتوں کی مہمان نوازی کا لطف نہیں لو گے؟"
وہ تنہائی سے مسکرا دیا۔ کچھ بولا نہیں۔ مایا نے اس
کے پیچھے کھیتوں کے اس پار کچے راستوں کو دیکھا جو دور
تک جاتا تھا۔ وہاں سے برائے فہرستان نظر نہیں آتا تھا
مگر قبرستان کی عجیب خوفناک اور پراسرار فضا کو رے
کچے راستے کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھی جیسے
دھول مٹی کی اس پگڈنڈی پہ ان دیکھی روہیں سفید
لباؤں میں اڑتی پھر رہی ہوں۔

مایا نے ایک جھرجھری لی اور واپس تیزی سے حویلی
کی طرف بڑھنے لگی۔ بڑے گیٹ کے سامنے حویلی کی
واحد موٹر کھڑی تھی۔ اس نے رُک کر معنی خیز
مسکراہٹ سے جیب کو دیکھا اور پھر سر جھٹک کر آگے
بڑھ گئی۔

وہ جو کچھ ٹھاکر گوپال راج کو دکھانا چاہتی تھی، دکھا
چکی تھی۔

☆☆☆

گوپال سے اس کا سامنا کھانے کی میز پر ہوا۔
حویلی میں پہلے جانے کھانے کا کیا طریقہ کار تھا، مگر

یقین ہے؟"

بل سر اٹھایا۔ اس کی

تھی۔

ہے؟"

مغموم سی مسکراہٹ

ہے پر اترتی خوشی کی

ہے؟"

اگر وہ زندہ ہے تو کیا

کر دے گے۔

بیکیا سا مسکرایا۔

قاتل کے ساتھ نہ

دینی چاہیے۔

ٹھٹھک کر غور اس کی

مسکرائی۔

مٹی ہوئی گردن بجاتا

والے ہوئے وہ اتنا

قہقہہ ملکہ تھی، بیلی

رقابت نہیں ہونی

سے کمر پھینک دی۔

ہے تو اس کی سزا سے

ہے تو مجھے یقین ہے

سرخ ہاتھ بکھرتے

ہوں۔" پھر جاتے

بھوڑ آؤ گے؟ مجھے

میں آتے۔"

جب سے ملایا آئی تھی اس نے کھانا ہمیشہ ڈانگنگ ہال میں لکڑی کی قیمتی ڈانگنگ میبل پر لگتے دیکھا تھا۔ شاید وہ ڈانگنگ ہال محض انگریز و شہری مہمانوں کے لیے آراستہ کیا گیا تھا۔

وہ خاموشی سے رکابی پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔
ٹھاکر گھونٹا تھا اور گوپال آگے پیچھے داخل ہوئے۔
”نہمکار مایا دیوی!“ ٹھاکر گھونٹا تھا نے کرسی کھینچتے ہوئے سادہ انداز میں کہا۔ مایا نے سر اٹھایا۔

”گڈ اوننگ۔“ اور سر جھکا کر پھر سے کھانے لگی۔
حوالی میں کوئی کسی کا کھانے پر انتظار نہیں کرتا تھا۔
ٹھاکر گھونٹا تھا نے اسے کہہ رکھا تھا کہ وہ انتظار کیا بھی نہ کرے، وہ نہ بھی کہتے تو بھی وہ راجپوتوں کا انتظار کرنے والی عورت نہیں تھی۔ وہ اپنے سب کام وقت پر کرتی تھی بنا کسی کی مداخلت یا انتظار کے۔

گوپال خاموشی سے کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔
مایا آرام سے پلیٹ میں موجود چاول ختم کرتی رہی۔
”کل پٹواری آئے گا“ نہروالی زمین کا سووا ہو گیا ہے مناسب دام مل رہے ہیں اس سے زیادہ آپ سے اس علاقے میں کوئی زمین نہیں خریدے گا۔“ وہ مصروف سے انداز میں بتا رہے تھے۔
”بہت بہتر۔“ وہ رکابی کھسکا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور نزاکت سے چہرے پر آئے بال ہٹائے۔ ”کون خرید رہا ہے وہ زمین۔“

”میں!“ گوپال نے سر اٹھا کر فاتحانہ نگاہ سے اسے دیکھا۔ ٹھاکر گھونٹا تھا مصروف سے انداز میں کھانا کھا رہے تھے۔

وہ اٹھتے اٹھتے بیٹھ گئی۔

”آپ؟ مگر کیوں؟“ اس کے چاروں طرف خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔

”آپ کو وہ زمین تو بیچنی ہے نا!“

”مگر آپ کو نہیں بیچنی۔“

”کیا فرق پڑتا ہے کہ کس کو بیچنی ہے۔ دام تو آپ کو ایک سی ملیں گے۔“ وہ لا پرواہی سے کھا رہا تھا۔

”اور مجھے یہ کون بتائے گا کہ بہترین دام کون سے

ہیں؟“ وہ سخت لگا ہوں سے ایک ٹک گوپال کو دیکھ رہی تھی۔

”آپ کو بتائی ہے اعتبار ہونا چاہیے۔“

مایا نے ٹھاکر کو دیکھا وہ ابھی تک اٹھناک سے کھانا کھا رہے تھے۔ وہ مضطرب سی ہو کر کھڑی ہوئی۔

”مگر میں وہ زمین آپ کو نہیں بیچنا چاہتی تھی۔“

ٹھاکر صاحب اس کی آواز میں غصہ اتر رہا تھا۔

گوپال نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے مگر ٹھاکر گھونٹا تھا نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کرا دیا۔

”آرام سے ملایا بیٹیا!“ ان کے بچے کی شفقت میں مصنوعی پن تھا۔ ”اگر آپ نہیں بیچنا چاہتیں تو ٹھیک ہے، ہم کسی اور پارٹی سے بات کریں گے۔ آپ اپنی ڈیمانڈ بتادیں۔“

”میں مشورے کے بعد بتاؤں گی۔“

”ہاں آپ پٹواری سے مشورہ۔“

”میں اپنے شوہر سے مشورے کے بعد بتاؤں گی۔“

ٹھاکر گھونٹا تھا کے ہاتھ سے نوالہ گر گیا۔

پورے ڈانگنگ ہال میں سناٹا چھا گیا۔

وہ تیز تیز چلتی ہوئی دروازے تک آئی۔

”آپ شادی کر رہی ہیں۔“ دونوں باب بیٹا ہکا بکا اسے دیکھ رہے تھے، بمشکل ٹھاکر گھونٹا تھا کے منہ سے نکلا۔



زہرہ تعال میں چاول لیے مگن سی گنگناتی ہوئی بالائی منزل کے بڑے سے برآمدے سے گزر رہی تھی ایک دم ٹھنک کر رک گئی۔

نیچے بڑے سے والان کے کونے میں پیپل کے گٹے درخت کے ساتھ جھولا بندھا تھا اور بدر اس جھولے کے ساتھ کھڑا تھا۔

اسے لگا جھولے پہ کوئی بیٹھا ہے۔ وہ چند قدم آگے آئی اور ریٹک سے نیچے جھانکا۔ نیچے کا منظر دیکھ کر اسے حیرت کا جھکا لگا۔

ایک ننگ گویاں کو دیکھ رہی

اچھا ہے۔

ننگ اٹھا کر کھانا

ہو کر کھڑی ہوئی۔

میں بیٹنا چاہتی تھی

نقصاں تر رہا تھا۔

لب کھولے مگر ٹھاکر

موش کر دیا۔

لے لے لے کی شفقت میں

بیٹنا چاہتیں تو ٹھیک

ریں گے آپ اپنی

لی۔

لی۔

کے بعد بتاؤں گی۔

مگر کیا۔

کیا۔

آئی۔

نوں باپ بیٹا ہکا بکا

رگھو ناتھ کے منہ

ننگا تائی ہوئی بالائی

رہی تھی ایک

س پیل کے گتے

در اس جھولے

وہ چند قدم آگے

کا منظر دیکھ کر

وہ کیا تھی میم صاحب۔

تھیں اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ سانس روکے

اسد کھ رہی تھی۔

بہت شہانہ مطمئن سے انداز میں جھولے پہ

بٹنی تھی بھولا ہولے ہولے جھول رہا تھا۔

اس نے سفید اسکرٹ سفید بلاؤز جس کی آستین

کائی تک آتی تھی، پہن رکھا تھا۔ اس زمانے میں

اگر شرفاء کی عورتوں میں خود کو مکمل طور پر ڈھانپنے کو

شرافت اور خاندانی پن کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ ابھی

دسری جنگ عظیم نہیں ہوئی تھی اور جلد ظاہر کرنے کا

رداء نہیں پڑا تھا۔

اس کی گود میں سفید رنگ کا ہیٹ پڑا تھا وہ ہیٹ گود

میں رہے ہوئے ہوئے جھولے لے رہی تھی۔

سنہری بال شاٹوں پہ بکھرے تھے موتوں کی لڑی

ماننے کو بھی اور وہ خود گردن اٹھائے مقابل کھڑے بدر

سے ہٹے ہوئے کوئی بات کر رہی تھی۔

بدر کی زہرہ کی جانب پشت تھی وہ بھی گرد پیش

سے بے خبر اس کی جانب متوجہ تھا۔

وہ دست قدموں سے چلتی ہوئی برآمدے تک آئی

بہن چاچی اس کا انتظار کر رہی تھیں۔

”بہن دیر کر دی زہرہ!“

اس نے بتا جواب دے تھیں چاچی کو تمہاری اور خود

دوار سے ٹیک لگا کر جھولے کا منظر دیکھنے لگی۔

برآمدے کے کونے پہ نیچے لگے پیر کا سراپا تھا اور

سایہ تھا بچوں سے لدی شاہیں برآمدے میں جھک کر

آری تھیں۔ وہاں سے مایا بدر اور پیل کے درخت

کے ساتھ بندھا جھولا شاخوں کے نیچے جھوکوں سے نظر

آ رہا تھا۔ زہرہ اسی طرح بدر کو دیکھنے لگی۔ اس نے

”میان سے پتے نہیں ہٹائے“ درمیان میں بہت کچھ آ

گیا تھا وہ کیا کہنا تھی؟

”اگر کیا دیکھ رہی ہے زہرہ؟“ چاچی جاوڑ صاف

کئی سر جھکائے ہوئی تو اس نے گردن پھیر کر چاچی کو

دیکھا پھر کچھ بیٹانے کے لیے لب کھولے مگر رک گئی۔

چاچی سر جھکائے بیٹھی تھیں اور والان کو نہیں دیکھ رہی

تھیں۔ وہ یہ منظر پہلے ہی دیکھ چکی تھیں۔

”کب آئی یہ؟“

”ابھی تھوڑی دیر ہوئی ہے۔“ چاچی عام سے لہجے

میں کہہ کر جاوڑ سے ٹکڑ چنتی رہیں۔

”اور کیوں آئی ہے یہ اور؟“

وہ ریٹنگ کی جانب سے رخ موڑ کر چاچی کی طرف

چہرہ کر کے کھڑی ہو گئی۔ چاچی نے سر جھکایا۔ اب زہرہ

کی پشت پہ چاچی کو صرف جھلی شاخیں دکھائی دے

رہی تھیں۔ مایا بدر اور جھولا چھپ گئے تھے۔

”کوئی کام ہو گا اسے بدر سے۔“ بہت دیر بعد چاچی

بولیں۔

”بدر کب سے راجپوتوں کے کام کرنے لگ گیا؟“

وہ چمک کر بولی۔

”وہ راجپوت نہیں ہے میری دھی! وہ فرنگی ہے۔“

”بدر کو تو فرنگی بھی اچھے نہیں لگے، خود تو کہتا تھا یہ

فرنگی، ہمہ عاصم ہیں اور ہم ان کے غلام۔“

”اس میں میم صاحب کا کیا قصور؟“

”قصور ہے۔“ غصے سے بولتے بولتے زہرہ کا گلا

رندھ گیا۔ ”وہ بدر کو اپنی طرف مائل کر رہی ہے۔“

”وہ بچہ جو مائل ہو جائے گا؟“

”بچے مائل نہیں ہوتے چاچی! جوان مرد ہو جاتے

ہیں۔“

”نی جھلی! تو اس کو نظر انداز کر، وہ کون سا پیشہ کے

لیے یہاں آئی ہے۔“ چاچی نے پُرسکون سی ٹکڑ چن کر

ایک طرف کر رہی تھیں۔ ”وہ جلد ہی انگلستان واپس

چلی جائے گی۔“

”نہیں چاچی! وہ بدر کو لے کر ہی انگلستان جائے گی۔“

”کیا انگلستان میں مرد ختم ہو گئے ہیں جو وہ ہندوستانی

ساتھ لے جائے گی۔“

”شمیکھو بھی تو ہندوستانی مرد تھا۔“ زہرہ کے پاس

ہر بات کا جواب تھا۔

”شمیکھو ہی اور بات تھی دھی! وہ ہندو تھا اور بدر

مسلمان ہے۔ یہ لڑی ہندو ہے۔“

”نہیں یہ عیسائی ہے مجھے بدر نے خود بتایا تھا۔“
 ”جانے دے زہرہ تو بھی کس کا غم کرتی ہے یہ گھر
 بسانے والی عورت نہیں ہے یہ اور طرح کی عورت
 ہے تیری چاچی نے بھی دنیا دیکھ رکھی ہے اس کے
 ناز و انداز غور سے دیکھ یہ محبت و حبت کے چکر میں
 پڑنے والی نہیں۔“
 زہرہ نے پلٹ کر نیچے والان کو دیکھا۔

پہیل کے ساتھ بندھا ہوا ہلے ہلے جھولا خالی
 رہا تھا۔ بدر اکیلا اس کے ساتھ کھڑا جیسے کچھ سوچ رہا
 تھا۔

”وہ چلی گئی چاچی!“ زہرہ نے اطمینان سے گہری
 سانس خارج کی دل کو جیسے ڈھیروں سکون ملا تھا اور پھر
 اس سکون کے ساتھ وہ واپس چاچی کی طرف مڑی اور
 تب اس نے دیکھا مایا سامنے چوکھٹ میں کھڑی تھی۔
 زہرہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ کیا اور کتنا سچی
 تھی۔ اس نے شرمندہ سی نظر مایا پر ڈالی۔ اس کا چہرہ
 ہمیشہ کی طرح سا مسکراتا تھا زہرہ کچھ انداز نہ کر
 پائی۔

چاچی بھی اسی قدر شرمندگی سے مایا کو دیکھ رہی تھی۔
 چاولوں کا تھال اس نے کب کا نیچے رکھ دیا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتی زہرہ کے قریب آئی اور اس
 کے بالکل مقابل رک گئی۔ دونوں خاموشی سے ایک
 دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھیں۔

نیچے جھولے کے ساتھ کھڑے بدر نے اوپر گردن
 اٹھا کر دیکھا۔ پہیل کے پیڑ کی اوپری شاخوں کے پار
 اسے ریٹنگ دکھائی دے رہی تھی۔ وہاں پر آمدے میں
 دو لڑکیاں کھڑی تھیں۔ ایک سیاہ شلوار قمیض اور اور
 رنگ دار پراندے والی زہرہ بتول اور اس کے سامنے
 سفید اسکرٹ بلاؤز اور سنہری بالوں والی مایا فرنیڈس
 سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اس نے ان دو کے چہروں کا
 موازنہ کیا۔ تیل لکے بالوں کا پراندہ بنائے چہرے یہ چند
 جھولتی لٹوں والا گندی۔ چہرہ اور سیاہ دوسرا سنہری
 آنکھوں والا چہرہ جس پہ ہیٹ کے چھجے سے جالی دار
 نقاب گر رہا تھا۔

یہ سامنے کی بات تھی کہ زہرہ زیادہ خوب صورت
 تھی۔ اور یہ بھی سامنے کی بات تھی کہ اس فرنیڈس
 میں کوئی ایسا ظلم ضرور تھا جس کے سامنے پہیل
 راجپوتانہ کی سب سے سندر لڑکی دکھائی نہیں دیتا تھی
 جب وہ کسی جگہ ہوتی تو بس وہی وہاں ہوتی تھی۔ بالی
 ہر فرد ہر ذی نفس پس منظر میں چلا جاتا تھا۔ وہ راج
 کرنے کے لیے پیدا ہوئی تھی اسے دیکھ کر یہی لگتا
 تھا۔

بدر کو مایا کے ہلے ہلے لب دکھائی دے کر اتنی
 دور سے وہ الفاظ نہیں سن سکتا تھا۔ سن بھی لیتا تو سمجھ
 نہ پاتا۔ انہیں سمجھنے کے لیے ابھی اسے بہت وقت اور
 تجربہ درکار تھا۔

”تم بھی کس کا غم کرتی ہو زہرہ! تمہاری چاچی ٹھیک
 کرتی ہے۔“ وہ سنہری آنکھوں سے زہرہ کی آنکھوں
 میں دیکھ رہی تھی، لیوں پہ وہی معصوم خوب صورت
 مسکراہٹ تھی۔ ”مایا گھر بسانے والی عورت نہیں ہے۔
 مایا تو بہت مختلف عورت ہے اس کی دنیا بہت الگ
 ہے تم سب سے بہت الگ۔“

زہرہ پلک جھپکے بغیر اس کی سنہری آنکھوں میں دیکھ
 گئی۔

”مایا کسی کو اپنی طرف مائل نہیں کرتی متوجہ نہیں
 کرتی، گھینچتی نہیں ہے۔ لوگ خود ہی گھینچے چلے آتے
 ہیں۔ وہ مایا کے ساتھ چلنا چاہتے ہیں مایا کا ہاتھ تھامنا
 چاہتے ہیں۔ مایا انہیں اپنے ساتھ چلنے دیتی ہے مگر ان کا
 ہاتھ کبھی نہیں تھامتھی۔ ہاتھ تھامنے کی توجہ کچھڑیں
 گے تو ان کا دل ٹوٹ جائے گا اور مایا دل توڑنے
 ہندوستان نہیں آئی۔ وہ لوگوں کو اپنے ساتھ اپنے
 راستے پہ چلنے دیتی ہے۔ تم برا مت مانو آخر کتنی دور وہ
 اس انجان راستے پہ چلتے رہیں گے؟ کب تک اس کے
 قدم سے قدم ملائے رہیں گے؟ مایا کا راستہ تو بہت الگ
 بہت جدا ہے بہت جدا ہے وہ جتنی ہی دور اس کے
 ساتھ کیوں نہ چل لیں کیا فرق پڑ جائے گا؟ مایا تو ایک
 دن اس راستے پہ چلتے چلتے اڑنے لگے گی تب وہ کیا
 کریں گے؟ اڑنے کے لیے پر کہاں سے لائیں گے؟

ہائے جب ہاتھ نہیں تھا تو پھر کیسے دے گی؟
 زہرہ چپ چاپ اسے سننے لگی۔ اس کے پاس کہنے
 کو کچھ نہیں تھا وہ ٹھیک کہتی تھی وہ کسی کو مائل نہیں
 کرتی، لوگ خود ہی کچی ڈوری سے کھینچے چلے آتے

اب آج بہت دنوں بعد زہرہ کو مایا بری نہیں لگی تھی،
 اس کو اس سے نفرت، رقابت اور حسد محسوس نہیں
 ہوا تھا، آج پہلی دفعہ اسے وہ بے ضرر لگی تھی۔ وہ اسی
 طرح گم صم صی سفید جالی کے پیچھے موجود مووی چہرے کو
 دیکھنے لگی۔ پر کیا فرق پڑا تھا اگر وہ زہرہ سے زیادہ حسین
 نہیں تھی تو؟ وہ تو ساحرہ تھی اور زہرہ کو سحر کرنا کہاں آتا
 تھا؟

”تم بھی کس کا غم کرتی ہو زہرہ؟“ وہ مسکرائی اور پھر
 ہٹ کر واپس بیڑھیاں اتر گئی۔ اس کی لمبی اسکرٹ
 زنبوں پر اس کے پیچھے پھسلتی گئی۔ زہرہ پتھر کا بت بنی گم
 سی بیڑھیوں کے کنارے پہ پڑے پروے کو ہلتا
 دیکھتی رہی۔

وہ نیچے آئی تو بدر اس کے انتظار میں کھڑا تھا۔
 وہ بے نیاز سے انداز میں جھولے پہ بیٹھ گئی۔ جھولا
 آگے پیچھے ہولے ہولے جھولنے لگا۔
 ”مایا! بدر نے اسے پکارا، وہ مڑے بنا
 بے نیازی سے کیاریوں کو دیکھتی رہی۔

”ملی زہرہ سے؟“
 اس نے جواب نہیں دیا، بس یونہی پھولوں کو دیکھے
 گئی۔ وہ اسی طرح خطرناک جھولے کی رسی تھامے کھڑا
 رہا۔

پیش کی اوپری شاخوں کے اس پار کھڑی زہرہ اسی
 طرح کھولی کھولی سی دونوں کو دیکھ رہی تھی۔
 ”ہمارا آگنی ہے، پھول بہت خوشنما لگتے ہیں
 تمہارے بلی راجپوتان میں۔“ پھر اس نے چہرہ موڑا۔
 ”تمہاری کزن۔۔۔“

”زہرہ؟“ بدر نے سوالیہ نگاہ سے اسے دیکھا۔
 ”شی ازائن لوو یو، ہوں؟“ وہ مسکراتی نگاہ کے ساتھ
 پوچھ رہی تھی۔

”معلوم نہیں۔“ وہ شانے اچکا تا، انجان بن گیا۔
 مایا ہنس پڑی۔

”اداکاری مت کرو۔“
 ”کیا؟“ اس نے پھر بے خبری دکھائی۔

وہ جھولے سے اٹھ کھڑی ہوئی اور چہرہ اس کے
 بالکل سامنے لے آئی۔

”کم از کم میرے سامنے اداکاری نہ کرو۔ میں تو
 لندن۔۔۔“ ایک دم بولتے ہوئے وہ خاموش ہو گئی۔

بدر نے ادھورے فقرے پہ دھیان نہیں دیا۔
 ”صحیح!“ وہ گہری سانس لے کر رہ گیا۔ ”خیر میں
 کچھ کہہ رہا تھا؟“

”کب؟“

”اب تم انجان بن رہی ہو۔“

”تم بہت کچھ کہتے ہو، میں کس کس کا حساب
 رکھوں؟“

بدر نے کچھ کہنا چاہا، پھر جیسے ارادہ بدل کر بولا: ”ابھی
 زہرہ کو دیکھ کر ملنے چلے جانے سے پہلے میں تم سے
 پوچھ رہا تھا تم اس روز رات کو شیکھر میرا مطلب
 ہے؟“ سنبھل کر وہ وضاحت کرنے لگا تھا مگر وہ برا
 مان گئی تھی۔

”تم کیوں سمجھتے ہو شیکھر ایسا کر سکتا ہے؟ وہ کوئی
 بھی ہو سکتا ہے۔ جب تک میں اس چنچر پوش کو اپنے
 سامنے نہیں دیکھ لیتی، مجھے یقین نہیں آئے گا کہ وہ
 شیکھر ہی ہے۔“

”تم نے اس روز اسے اپنے سامنے دیکھا تھا۔“

”میں وثوق سے نہیں کہہ سکتی کہ وہ چنچر پوش ہی
 تھا، ہو سکتا ہے وہ کوئی ملازم وغیرہ ہو، عورت کو کسی کام
 سے گودام کی طرف جا رہا ہو۔“

”آدھی رات میں ملازم کا گودام میں کیا کام؟ شام
 کے بعد نوکر وغیرہ اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں،
 اتنی رات گئے کوئی جوہلی کا فرد ہی۔“

”بہر حال جب تک ثابت نہیں ہو جاتا کہ وہ کون
 ہے، تب تک تم اسے شیکھر نہیں کہو گے۔“ مایا کا
 لہجہ ٹھوس اور حتمی تھا۔ بدر بے ساختہ زخمی سا مسکرا

خوب صورت
 اس فرنگی لڑکی
 سامنے بیٹھا
 نہیں دیتی تھی۔
 دلی تھی۔ باقی
 تھا۔ وہ راج
 لہ کر رہی لگتا
 بے گرا تھی
 ی لیتا تو سمجھ
 ت وقت اور
 چاچی ٹھیک
 کی آنکھوں
 ب صورت
 ت نہیں ہے۔
 یا بہت الگ
 اس میں دیکھے
 متوجہ نہیں
 چلے آتے
 کا ہاتھ تھامنا
 ہے مگر ان کا
 نب پچھڑیں
 دل توڑنے
 ساتھ اپنے
 خرتی دروہ
 تک اس کے
 تو بہت الگ
 دور اس کے
 کا مایا تو ایک
 تب وہ کیا
 لائیں گے؟

دیا۔

”تجی محبت ہے تمہیں اس سے؟“

وہ میرے سے مسکرا دی۔

”تم کیوں جلتے ہو؟“

”میں کیوں جلوں گا؟“ وہ پھر سے انجان بن گیا۔

”جیسے میں نہیں جانتی؟“

”کیا؟“ وہ چونکا۔

”بھرم رہنے دو“ اسے مت توڑنا۔ ”وہ مبہم سا

مسکرائی ”پھر کچھ سوچ کر بولی۔ ”وہ اس رات گودام گیا

تھا“ اوپل کر گودام دیکھ آتے ہیں۔

”کیا مطلب؟“ وہ واقعی نہیں سمجھا تھا۔

”میرے ساتھ حویلی چلو دیکھتے ہیں کہ گودام میں کیا

ہے، جگہ دیکھ کر ہی غم ہو جائے گا کہ آج کل وہ کس

طرح ہستعل ہو رہا ہے۔“

”مسکریں راجپوتوں کی حویلی نہیں جاتا۔“

”آج تم جاؤ گے۔“ وہ جواب سے بغیر حکم صادر کر

چکی تھی اور پھر در کو اس کے ساتھ چلنا پڑا۔

پہل کی جھکی شاخوں کے اس پار سے زہونے

دیکھا، وہ دونوں ہنستے، مسکراتے، باتیں کرتے، مطمئن

سے ساتھ ساتھ روش پہ چلتے ہوئے دور ہوتے جا رہے

تھے۔

اور پھر زہونے کی مایا نے بدر کا ہاتھ نہیں تھام رکھا

تھا۔ آہستہ آہستہ اسے مایا کی باتیں سمجھ میں آنے لگی

تھیں۔

دروازے تک پہنچ کر بدر نے معذرت کر لی۔

”ابھی میرے لیے راجپوتوں کی حویلی جانا ممکن

نہیں، لیکن میں آپ کی اس چغہ پوش کو ڈھونڈنے

میں مدد ضرور کروں گا۔“

”اپنی کزن کا خیال رکھنا۔“ جاتے سے کہے گئے

اس کے الفاظ پہ وہ بعد میں کافی دیر غور کرتا رہا تھا۔

وہ اپنے کمرے میں ادھر ادھر ٹہل رہی تھی۔ وہ نوں

ہاتھ سینے پہ بندھے تھے، بال چولی میں مقید تھے اور

چہرے پہ سوچوں کا جال بچھا تھا۔ وہ کافی دیر سے ایسی

طرح ٹہکتے ہوئے کچھ سوچے جا رہی تھی پھر تھک

پٹنگ پہ بیٹھ گئی۔

مہاراجہ پٹنگ بھاری آنسو کی لکڑی کا بیٹھا تھا، بڑے

بڑے مولے پائے شیشم کے بنے تھے۔ چاروں کونوں

پہ لگے آنسو کی ڈنڈوں پہ پٹیل کا کام نقش تھا اور ڈنڈوں

سے جڑی بیٹوں پہ گلابی پوت کے پردے کر رہے تھے۔

”روپا! کچھ سوچ کر اس نے آواز دی، جانتی تھی کہ

روپا اس پاس ہی ہوگی اور بوتل کے جن کی طرح وہ

واقعی اگلے ہی لمحے دروازے پہ تھی۔

”جی میم صاحب!“

”مجھے قلم دو! بلکہ صرف کاغذ لا دو اور ایک خط کا

لفافہ بھی۔“ کہہ کر وہ اپنی رائٹنگ ٹیبل تک آئی اور

دراڑ کھول کر چیزیں الٹ پلٹ کرنے لگی۔

جب تک اس نے قلم ڈھونڈا، روپا کاغذ اور لفافہ

لے کر حاضر ہو چکی تھی۔

”ایک رقعہ لکھ رہی ہوں، احتیاط سے بدر کا خزان

تک پہنچانا ہے۔“ وہ کاغذ میز پہ رکھے تیزی سے

انگریزی میں کچھ لکھ رہی۔

”مگر دھیان رہے، کوئی پڑھے نا احتیاط سے چھپا کر

لے کر جاتا۔“

رقعہ لکھ کر اس نے کاغذ کی دو تہیں لگائیں، اسے

لفافے میں ڈالا اور لاکھ سے سر بھر کر دیا۔

روپا لفافہ لے کر باہر نکل گئی۔ وہ سوچتی نگاہوں سے

قلم کو جھنکی رہی، پھر گہری سانس لے کر سر میز پہ رکھ دیا۔

روپا ساڑھی سنبھالتی، لفافہ ہاتھ میں دابے، زینہ اتر

کر آئی تو دیوان خانے میں پہلا سامنا گوپال سے ہوا۔

”کدھر جا رہی ہو؟“ ابھی اس کی نگاہوں میں لفافہ

نہیں آیا تھا، مگر روپا نے خود سے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

”میم صاحب نے یہ بدر کا خزان کے لیے دیا ہے۔“

گوپال کے لب پہچ گئے، اس نے لفافہ اس کے

ہاتھ سے لیا، ”اور اندر آؤ“ کتنا تیز ڈگ بھرتا اپنے

کمرے میں چلا آیا۔

نہایت بے رحمی سے لفافہ

کھلا، چھوٹا سا بیغام تھا۔

”تم نے وعدہ کیا تھا کہ تم

میں ایک منصوبہ ہے

چند روز کے لیے شہر سے باہر

کی اور میانی شب میں پرانے

کونوں کی اس جھوت کو

اگر شب بیتی ادھر کرنی پڑے

رہنا۔

گوپال کے لبوں پہ

اس نے نہایت نفاس

اور روپا کے ہاتھ میں تو

روپا خاموشی سے

گئی۔

”یہ راستے میں

رقعہ پڑھ کر قدر

پوچھی تھی۔

”ایسی جرات

رقعہ پڑھے؟“

وہ مطمئن ہو کر

دے کر اسے رقعہ

روپا نے جد

اس کا متھر تھا۔

”کیا کہا اس

تھا۔

”یہی کہ جو

”بہت خوب

سی بہا

میں آؤ

وہ

روپا

تھی۔ اسے

لفی دیر سے اسی
ی پھر تھک کر

باہر تھا بڑے
چاروں کونوں
تھا اور ڈنڈوں
کر رہے تھے۔

جانتی تھی کہ
کی طرح وہ

ایک خط کا
آئی اور

اور لفافہ

رعازان
ی سے

چھپا کر

اے

سے

رکھ دیا۔

بند اثر

لفافہ

کے

اپنے

کمرے میں چلا آیا۔
نہایت بے رحمی سے لفافہ چاک کیا، اندر صاف

لکھا چھوٹا سا بیغام تھا۔
”تم نے وعدہ کیا تھا کہ تم میری مدد کرو گے۔ میرے
دانتوں میں ایک منصوبہ ہے۔ اس بدھ وار گویال شکار پہ
دندروں کے لیے شہر سے باہر چار ہا ہے بدھ اور جمہرات
کی درمیانی شب میں رات نے قبرستان میں تمہارا انتظار
کروں گی۔ اس بھوت گورنگے ہاتھوں پکڑنے کے لیے
اگر شب باشی اوجھر کرنی پڑی تو کوئی مضائقہ نہیں تم تیار
رہنا۔“

فقط مایا فرزندس
گویال کے لبوں پہ استہزائیہ مسکراہٹ بکھرنی۔
اس نے نہایت نفاست سے لفافے کو دوبارہ سر بہر کیا
اور دپاکے ہاتھ میں تھام دیا اور ساتھ پانچ روپے بھی۔
روپا خاموشی سے دونوں اشیاء سنبھالے باہر نکل
گئی۔

”یہ راستے میں کسی نے پڑھا تو نہیں؟“ بدر نے
رفقہ بیڑھ کر قدرے فکر مندی سے پہلی بات یہی
پوچھی تھی۔
”ایسی جرات ہے کسی کی مہاراج، کہ وہ آپ کا
راہہ پڑھے؟“

وہ غطیش ہو گیا اور جواب میں مثبت اشارہ اور انعام
دے کر اسے رخصت کر دیا۔

روپا نے جب واپس حویلی میں قدم رکھے تو گویال
اس کا منتظر تھا۔

”کیا کہا اس نے؟“ لہجہ نفرت و جھین سے بھرپور
تھا۔

”یہی کہ جواب مثبت ہے۔“

”بہت خوب اب جا کر تمہیں صاحب سے بولو کہ ڈی
کی بہادر ان سے ملنے آئے ہیں۔ وہ نیچے ڈرائنگ روم
میں آجائیں۔“

وہ کہہ کر خود بھی اس طرف چلا گیا۔

روپا اس تک آئی تو وہ ابھی تک منتظر ہی مثل رہی
تک اسے دیکھ کر چہرے پہ خوشی کی رمت آئی۔

”بہت دیر کر دی روپا دیوی، کیا کہا اس نے؟“
”وہ کہہ رہے ہیں کہ ان کا جواب مثبت ہے۔ مجھے

دس روپے بھی بطور انعام دیے ہیں اور ہاں بٹھا کر گویال
نے کہلا بھیجا ہے کہ ڈی کی صاحب آپ سے ملنے کے
واسطے آئے ہیں، نیچے آجائیں۔ وہ ڈرائنگ روم میں
بیٹھے ہیں۔“

”گویال حویلی میں ہے؟“ مایا کے چہرے پہ تفرابھرا۔
”اس نے رفع کی بابت کوئی سوال تو نہیں کیا؟“
”ہرگز نہیں، نہیں تو علم بھی نہیں۔“

”بہت بہتر تم جاؤ میں ذرا ٹھہر کر آتی ہوں۔“

وہ سنگھار میز کے سامنے کھڑی بالوں میں کنگھا
کرنے لگی، پھر آنکھوں میں کاجل گہرا کیا اور ساڑھی کا
پلو سنبھالتی باہر چلی آئی۔

زینے اتر کر وہ نیچے آئی تو گویال اور جان کارلس اس
کے منتظر تھے۔

”شام بخیر لڈی فرزندس!“ جان کارلس اٹھ کھڑا
ہوا، وہ سر کے اشارے سے سلام کا جواب دیتی اس کے
سامنے بیٹھ گئی۔ دائیں ٹانگ بائیں پہ رکھ لی، آج پھر
مقابل اس کی جوتی کی نوک پہ تھے۔

”فرمائیے ڈی سی بہادر کیوں زحمت کی؟“ اس کا لہجہ
خاصا روکھا تھا۔

”اس روز انسپکٹر شاہ نے مجھ سے ذکر کیا تھا کہ آپ
نے شیکھو راج کے قتل کے کیس کی تحقیقات کے
سلسلے میں آپ ڈینڈر ہنے کی درخواست کی تھی پولیس
تحقیق کر رہی ہے کہ شیکھو کی کسی کے ساتھ دشمنی
ہو سکتی ہے۔ اس سلسلے میں چند تنازعات سامنے آئے
ہیں۔ انسپکٹر شاہ نے تو ان کو شاید اتنی اہمیت نہیں دی
تھوٹھا کر گویال کا خیال تھا کہ ان میں سے ایک تنازعہ
آپ کی نظر میں ضرور آنا چاہیے۔“

مایا نے ایک کھلی نگاہ گویال پہ ڈالی۔ وہ زہر میں
بجھی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے
انداز میں فحش کارنگ غالب تھا۔ جانے ایسا کیا کہا تھا وہ
قدرے بے چین ہوئی۔
”کون سے تنازعات؟“

جان کارلس نے کوٹ کی شکن درست کی اور ایک فائل اس کے آگے کی۔

”یہ تفصیل ہے۔“

”آپ مجھے زبانی بتا دیجیے۔“

”بہتر لیڈی فرینڈس!“ وہ فائل خود ہاتھ میں لے کر اس پر نگاہ دوڑاتا کہنے لگا۔ ”یہ نہر کے پار والی زمین کا کیس ہے۔ شیکھر کا ایک مقامی زمین دار سے اس کی ملکیت کا مقدمہ آج کل عدالت میں ہے۔ کیا آپ کو معلوم ہے؟“ رک کر فائل سے نظر ہٹا کر کارلس نے پوچھا۔

”نہیں۔“ اس نے بے چین و مضطرب ہو کر پہلو بدلا۔ ”کیسا مقدمہ ہے یہ؟“

”شیکھر کی لائحوں کی ملکیت کی اراضی پہ ایک زمین دار نے قبضہ کر رکھا ہے۔ اس پہ ایک دفعہ خون خرابہ اور متعدد بار جھگڑا ہو چکا ہے۔ زمین شیکھر کی ہے مگر زمین دار کا کہنا ہے کہ وہ زمین وہ شیکھر سے خرید چکا ہے۔ شیکھر یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھا اور پھر شیکھر مارا گیا۔“

”کون ہے وہ مقامی زمین دار؟“

جان کارلس نے فائل بند کر کے سامنے رکھی۔

”ملک بدر عازان۔“

مایا ایک دم کھڑی ہو گئی، گوپال کے لبوں پہ زہر آلود تبسم گہرا ہوتا چلا گیا تھا۔

”معاف کیجیے گا؟“ وہ کہہ کر تیزی سے زینے پر چڑھتے اوپر چلی گئی۔

”کیا ہوا؟“ جان کارلس حیرت سے اسے جاتا دیکھتا رہا، گوپال نے طنزیہ نگاہ اس پر ڈالی۔

”صد مہ لگا ہے“ اور کچھ نہیں“ اور پھر فائل ہاتھ میں لیے صفحے پلٹنے لگا۔



اور وہ سارا دن اسی سوچ میں غلطاں رہی کہ آخر یہ تنازعہ پہلے کیوں اس کے سامنے نہیں آیا تھا۔ نہ ان چھ ماہ میں شیکھر نے کوئی ذکر کیا، نہ بدر نے۔ وہ شیکھر

کا ذکر شروع شروع میں اچھے الفاظ میں کرتا تھا بعد میں اس نے شیکھر کو چند پوش ہٹا ڈالا تو وجہ تبدیل ہو گیا۔

”خون خرابہ۔۔۔ مقدمہ عدالت میں۔“

جان کارلس کے الفاظ اس کے ذہن میں گونجنے لگے۔ وہ پریشان سی کمرے میں ابھر اُدھر پھرنے لگی۔

”یہ خبیث بڑھا کارلس بھی جانے کیوں۔۔۔“ وہ زیر لب کچھ بڑبڑاتے جارہی تھی، پھر تھک کر باہر چلی آئی۔

اس کو اس وقت کسی نہ کسی سے اس تنازعے کی تفصیلات پوچھنی تھیں اور روپا سے بہتر اسے کوئی نہیں بتا سکتا تھا۔

”رتن بوا۔“ رسوئی کی چوکھٹ سے اس نے اندر جھانکا۔ ”روپوٹی کہاں ہے؟“

”وہ گھر گئی ہے ٹھاکرائن! اس کی بہن کا بچہ شدید بیمار ہے“ اس کی ماں اسے بلانے آئی تھی۔ کوئی کام ہے تو مجھے کہیے۔“ وہ گیلے ہاتھ ساڑھی کے پلو سے پوچھتی فوراً حاضر ہوئی۔

”مجھے اس کے گھر چھوڑ آؤ۔“

”آسمہ اچھا،“ حکم قدرے حیران کن تھا، مگر رتن بوا کو اب ٹھاکرائن حیران نہیں کرتی تھی۔ حویلی کے لوگ اب غالباً اس کے عادی ہوتے جا رہے تھے۔

”نانکی تیار ہے ٹھاکرائن! آپ تشریف لے آئیے۔“

چند ساعتیں گزری تھیں کہ اس نے وہیں چوکھٹ سے لگی منتظر مایا کو مطلع کیا۔

روپا کا گھر قریب ہی تھا، کیا سا ایک کمرے کا مکان، سامنے بڑا سا صحن، ایک طرف رسوئی، اس میں مٹی کا چولہا۔

صحن میں دو چار پائیاں بچھی تھیں، ایک پہ ایک پر لینا مسلسل رو رہا تھا، ساتھ اس کی ماں بیٹھی اسے چپ کرانے کی کوشش میں لگی تھی۔

دوسری چارپائی خالی تھی۔ روپا رسوئی میں بیٹھی چولہے میں لکڑیاں جھونک رہی تھی۔ مایا کو دیکھ کر حیران سی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”تھیں۔“ مگر ہے جی۔“ ماں گھبرا کر اسے کندھے سے لگا کر
چھیننے لگی مگر وہ رو رو کر بھگان ہوا جا رہا تھا۔

”مگر اتنا کیوں رو رہا ہے؟“ مایا کو بچوں میں دلچسپی
کہاں تھی بس برائے بات پوچھ لیا۔

”اس پر جاؤ ہو گیا ہے جی میو کی ساس کی بہن نے
ٹوٹا کر دیا ہے۔“

روپا کی — بات پر وہ جیسے تھک کر بولی۔ ”اور یہ
کس نے کہا ہے؟“

”شیکھر بابا نے خود کہا ہے جی۔“

مایا نے گردن اتنی تیزی سے اس کی جانب موڑی
کہ ہڈی چننے کی آواز سنائی دی۔

”شیکھر نے ایسا کہا تھا؟ کب؟“

”ہاں جی۔۔۔ نہیں جی۔“ روپا صبح کرنے لگی۔

”آپ کے ٹھاکر شیکھر نہیں یہ بابا شیکھر کی بات کر
رہی ہے۔“

”بابا شیکھر کون؟“ وہ سانس روکے منتظر تھی۔

”بیلی میں ایک جوگی بابا رہتا ہے، عمل بھی کرتا ہے،
توڑ بھی کرتا ہے اس کا نام بھی شیکھر ہے۔“

وہ ایک دم کھڑی ہوئی۔ ذہن میں جھگڑے چلنے
لگے تھے۔

”رتن بوا۔۔۔ نالگی تیار ہے؟ مجھے ملکوں کی حویلی جانا
ہے۔ جلدی چلو۔“

روپا حیران پریشان اسے روکتی رہ گئی مگر وہ نہیں
رکی۔ اسے بدر سے ملنا تھا ابھی اور اسی وقت۔

نالگی کب روپا کے گھر سے چلی اور کب ملکوں کی
حویلی کے سامنے رکی اسے علم نہ تھا۔ وہ بس اپنے دل

دل میں ایک ہی فقرے کی تکرار سن رہی تھی۔

”منگل سنگھ نے مرنے سے پہلے شیکھر کا نام لیا
تھا۔“

جب وہ نالگی سے اتری تو اس کی ہتھیلیاں بھیجی
ہوئی تھیں اور چہرہ غصے کی تمازت سے دھک رہا تھا۔

اس نے بڑا دروازہ پار کیا، سامنے طویل روش تھی
اس کے اکتھام پر برآمدہ تھا۔ برآمدے کے سرے پر

اسے بدر کھڑا نظر آیا۔

”میم صاحب! آپ؟ زحمت کیوں کی؟ مجھے بلا بھیجا
تھا۔“ وہ ہاتھ صاف کر کے اس تک آئی۔

”کچھ پوچھنا تھا، ذرا جلدی ہے مجھے۔“ لہجے میں
نہایت در آئی تھی، کچھ تکلف اور کروفر سے وہ چارپائی پر

بٹھ گئی۔

”حکم کریں میم صاحب۔“ روپا ابھی بھی حیران سی

اس کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ بچہ ابھی تک روئے جا رہا

تھا۔

”بدر اور شیکھر کا آپس میں زمین کے معاملے پر
کوئی جھگڑا تھا؟“ روپا چند ساعتیں خاموش رہ کر بولی۔

بابا جی تھا تو سہی۔

”کمال ہے، تم نے مجھے کبھی آگاہ نہیں کیا۔“ مایا کا

مرد بگڑا تھا۔ ”خیر معاملہ کیا تھا؟“

”چھوٹے ٹھاکر کی سرہولی زمین پر ملک بدر غازان کا
نقصہ ہے اسے دعو تھا کہ زمین ٹھاکر نے اس کے ہاتھ

فروخت کر دی تھی مگر ٹھاکر۔۔۔“

”یہ مجھے پتہ ہے۔“ اس نے ورشتی سے بات کالی۔

”خون خرابے کا کیا قصہ ہے؟“

بچہ اب گلا پھاڑ کر رونے لگا تھا۔

”ایک دفعہ زمین پر جھگڑا ہو گیا تھا، ٹھاکر کے ایک
بندے نے چھوٹے ملک کے ایک مزارعے کو برچھیں

بار دی تھی وہ مر گیا تھا، چھوٹے ملک نے مقدمہ کر دیا
بعد میں صلہ ہو گئی تھی۔“

بچہ اب ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ملک رہا تھا۔

”صلح کب ہوئی؟“

”چار سال کی بات ہے۔“

بچہ اب اپنا سر ہاتھ کے گھٹنے سے مارنے لگا تھا، ماں

سلسل اسے سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”صلح کے بعد دوبارہ کوئی لڑائی ہوئی تھی؟“

”چند ماہ قبل زبانی کلامی ایک جھگڑا۔۔۔“

”یہ بچہ کیوں رو رہا ہے روپا؟ اسے پہلے چپ کراؤ۔“

بے زار سی ہو کر وہ کہنے لگی۔ بچے کا روننا اسے

سلسل تنگ کر رہا تھا، کوئی بات ٹھیک سے کہی نہیں
پاری تھی۔

وہ تیز تیز قدموں سے چلتی قریباً دوڑتی ہوئی اس تک آئی تھی۔

چھت کے برآمدے میں گملے کو پانی لگاتی زہرہ کے ہاتھ ایک لمحے کو پتھر ہو گئے تھے۔

”مایا! ایک حیرت آمیز بڑبڑاہٹ برآمدے میں کھڑے بدر کے لبوں سے پھسکی تھی وہ چند قدم آگے دوڑا۔ اکیلا اتنے میں وہ اس تک پہنچ چکی تھی اس سے قبل کہ وہ کچھ کہتا مایا نے ایک زوردار پھپھر اس کے منہ پر مارا تھا۔

”کاش میں اتنی عقل مند ہوتی کہ تمہارا اصل چہرہ اس روز پہچان لیتی جب تم نے ڈھانٹے میں چہرہ چھپائے میرا راستہ روکا تھا۔ میں جانتی تھی کہ بلی کے ڈالو کون ہیں مگر میں نے کسی سے ذکر نہیں کیا میں نے پولیس میں رپورٹ نہیں کی میں نے یہ بھی نہیں بتایا کہ میں نے تمہاری جان بچائی تھی مگر تم۔ تم آئین میں چھپے وہ سانس تھے جو مجھے ڈستے رہے۔ غم وغصے سے اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

”مایا! کیا ہوا؟“ وہ ششدر سا کھڑا تھا اتنا ششدر کہ چہرے کو چھونے کو ہاتھ بھی اٹھا سکا تھا۔

”مت نام لو میرا۔ مجھے تمہاری صورت سے بھی نفرت ہے۔“ وہ زور سے چلائی تھی۔ ”تم نے کیا سوچ کر شیکھر کا نام لیا اسے بھوت کہا اس پر الزام لگایا ہاں؟ کیوں نام لیا تم نے میری جی کا؟ کیا پورے گاؤں میں صرف ایک شیکھر تھا؟ کیا تم نہیں جانتے تھے برسوں اوھر رہنے کے باوجود کہ ایک جوگی بھی اسی نام کا اس گاؤں میں رہائش پذیر ہے۔ پھر بھی تم نے میرے شیکھر پر الزام لگایا۔“

وہ ہڈیانی انداز میں چیخ رہی تھی چلا رہی تھی اور وہ بت بنا خاموشی سے سنے جا رہا تھا۔

”آج کے بعد تم مجھے اپنی صورت بھی مت دکھانا۔“ میں کسی بدر کو جاتی ہوں نہ میرا کسی بدر سے کوئی تعلق ہے۔“ وہ مڑکر تیز تیز چلتی باہر نکل گئی اور وہ اسی طرح ساکت سا وہیں کھڑا رہا۔

زہرہ کے چلتے دل ٹھنڈی پھوار پڑنے لگی ایک خوب صورت مکان اس کے لبوں کو چھو گئی۔ بدر کو چھو گئی تھی۔

نالکی میں بیٹھتے ہی ”تھانے چلو“ کے الفاظ اس کے لبوں سے ادا ہوئے تھے اور جب نالکی نے اسے تھانے کے سامنے اتارا تب بھی اس کا سندرچرا سرخ انگارہ ہو رہا تھا۔

کھٹ کھٹ کرتی کسی کے رکنے کے بغیر وہ اندر آگئی۔ انسپکٹر شاہ قلم سنبھالے ایک کانڈہ کچھ لکھ رہا تھا آہٹ پر سر اٹھایا اور اسے دیکھ کر چونکا۔

”میم صاحب! آپ؟“ وہ کانڈہ قلم رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ”تشریف رکھیے۔ خیریت؟“

”خیریت نہیں ہے۔“ وہ بیٹھی نہیں اسی طرح کھڑی رہی۔

”کیسے کیا ہوا ہے؟“ انسپکٹر بیٹھ گیا اور ایک نیا کانڈہ نکال لیا۔

”ایف آئی آر کاٹو۔“

”کس کے خلاف؟“

”بیلی راجپوتان کے بھوتوں کے خلاف۔“ وہ دانت پر دانت جما کر بولی۔

”بیلی میں بھوت ہیں کیا؟“

”میں نے دیکھے ہیں۔“

”کب؟ کدھر؟“ انسپکٹر شاہ کا جرح کرتا

پے در پے سوال کرتا چلیج کرتا انداز ایسا تھا کہ وہ جو کچھ کہنے والی تھی بیکھت رک گئی۔

سوال کا جواب نہ پا کر انسپکٹر نے سر اٹھا کر اسے دیکھا جو بہت غور سے اسے دیکھ رہی تھی۔

یہ جرح کرتا انداز۔ اور اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں۔ مایا کو ایک دم کچھ یاد آیا۔

اندھیرا جنگل۔ ساکن بکھی۔ راجن اور وہ

آواز اسے جانے دو تاور یہ بلی راجپوتان کی ملکہ ہے۔

اس کے کان سانس سانس کرنے لگے اس کی

نگاہیں بے اختیار انسپکٹر کے نام کی خنثی پہ جھک گئیں

”انسپکٹر شاہ۔“

”بلی کے سارے کھڑے“

”بلی کے گلی۔“

”ہمیں سانس لے کر مینچ“

”چو کاوا انسپکٹر شاہ اور“

”انسپکٹر اس میں لکھو۔“

”وہ تھا“

”لکھو بلی کے ان سے“

”بھانے باندھ کے شرفاء کی“

”میں معزین بن جا“

”دستان کو کھوتے ہیں اور“

”تم سب ایک ساتھ“

”کر شیکھر کو مارا ہے“

”رکھو ہاتھ پر۔“

”نادر شاہ سر جھکائے“

”اور لکھو ٹھاکر“

”اور؟“ مصروف

”استفسار کیا۔“

”اور بدر غازی“

”نادر شاہ نے جھج“

”بے یقینی تھی۔“

”بدر غازی؟“

”سارے نہیں“

”مینچ جھجک ہاتھ“

”آپ ایک“

”آپ ش“

”آپ“

”آپ“

”آپ“

”آپ“

”آپ“

”آپ“

”آپ“

”آپ“

”آپ“

”آپ“

”آپ“

”آپ“

”آپ“

”آپ“

”آپ“

”آپ“

”آپ“

اور بڑے لگی۔ ایک
کو چھو گئی۔ بالآخر وہ
کے الفاظ اس کے
نے اسے تھلے
رچہ اس رخ انگارہ
ر کے بغیر وہ اندر
تھلے پہ کچھ لکھ رہا
نک۔
رکھ کر اٹھ کھڑا
ہیں اسی طرح
ور ایک نیا کانٹہ
... وہ دانت
ج کرتا
... جو کچھ کہنے
اٹھا کر اسے
بھولی چھوٹی
... اور وہ
کی ملکہ ہے
... اس کی
جھک گئیں

”نیکٹر نادر شاہ۔“
ریل کے سارے کلرے جڑنے لگے، تصویر
ہانے آنے لگی۔
وہ مری سانس لے کر میز پر جھکی۔
”پرچہ کا نو نیکٹر نادر شاہ اور میرے نامزد مشتبہ افراد
کی فہرست اس میں لکھو۔“
”لکھو ایسے ماہ۔“ وہ قلم ہاتھ میں لیے منتظر تھا۔
”لکھو بیل کے ان سب بھوتوں کا نام جو راتوں کو
بھانے باندھ کے شرفاء کی عورتوں کو لوٹنے ہیں اور دن
بڑے معززین بن جاتے ہیں۔ اندھیرے میں
فرستان کو کھودتے ہیں اور دن میں خود دویا کرتے ہیں۔
تم سب ایک ساتھ ملے ہوئے ہو، اور سب نے مل
کر شیکھر کو مارا ہے۔ لکھو، مجھے شک ہے ٹھاکر
رکھتا ہے۔“
نادر شاہ سر تھکائے تیزی سے لکھتا جا رہا تھا۔
”اور لکھو، ٹھاکر گوپال راج۔ اور...“
”اور؟“ مصروف سے منتظر انداز میں نادر شاہ نے
استفسار کیا۔
”اور بدرعازان!“
نادر شاہ نے جھٹکے سے سر اٹھایا اس کی آنکھوں میں
بے یقینی تھی۔
”بدرعازان؟ آپ ہوش میں تو ہیں میم صاحب!“
”ہلے نہیں تھی، مگر اب آگئی ہوں۔“ وہ اسی طرح
میز پر جھکی ہاتھ رکھے طنز سے بولی۔
”آپ ایک شریف آدمی کو مشتبہ نامزد کر رہی ہیں۔“
”آپ شریف کسے کہتے ہیں؟“
”آپ کسے کہتی ہیں؟“
”کم از کم اسے نہیں جو تمہارا دوست ہے۔“
”دیکھیں میم صاحب۔“ وہ ہاتھ اٹھا کر سختی سے بولا۔
”جب میں اس وردی میں ہوتا ہوں تو مجھے کوئی پروا

نہیں ہوتی کہ میرے کسی سے کیسے ذاتی تعلقات ہیں
میں اصول پر سمجھوتہ نہیں کرتا۔ صرف یہ پوچھا ہے
کہ بغیر ثبوت کے کسی کو مشتبہ نامزد کرنے کی وجہ؟“
”تم بھی جانتے ہو اور میں بھی جانتی ہوں کہ شہنشاہ
برطانیہ کے قانون میں مجھے کسی کو مشتبہ نامزد کرنے کے
لیے ثبوت درکار نہیں ہے۔“
”ہاں۔“ وہ قدرے سنبھلا۔ ”مگر اخلاقی طور پر آپ کو
ثبوت کی ضرورت ہے۔“
”تو اب بیل کے راہزن مجھے اخلاقیات پر دھامیں
دے گے؟“
”آپ میری توہین کر رہی ہیں۔“ نادر کا چہرہ سرخ پڑ
گیا۔
”شکر کیجیے میں راہزنی کی اس واردات کا پرچہ نہیں
کنوا رہی، جو چند روز پہلے بیل کے جنگل نے دیکھی
تھی۔“
وہ تنہی سے مسکرایا۔ ”بہی تو بات ہے میم صاحب!
میں نے سنا ہے اس واردات میں ڈاکوؤں نے بہت
احسان کیا تھا آپ پر، آپ کو جانے دیا تھا، شاید ان کے
سرغنہ نے ایسا کہا تھا اور بعد میں دیگر ڈاکوؤں نے اس
سے اس بات پر ناراض ہو کر گروہ توڑ دیا کہ ان کے
اصولوں کی کتاب میں یہ نہیں لکھا تھا کہ اگر فرنگی کوئی
محسن ہو تو اسے نہیں لوٹنا۔“
وہ چونکی، مگر غماز نہیں ہونے دیا، بہر حال معلومات
اس کے لیے نئی تھیں۔
”دیگر ڈاکوؤں سے آپ کی مراد آپ خود ہیں؟“
”میں؟“ وہ جیسے جھٹکا کھا کر رہ گیا۔ ”آپ تو الزام اور
الزام لگائے جا رہی ہیں۔“ وہ شاید بہت اچھا اداکار تھا۔
”مجھے علم تھا تم مگر جاؤ گے، مگر خیر، پرچہ چاک کرو۔“
”بدرعازان کے خلاف؟“ اس نے قلم اٹھالیا۔
”بے شک شکٹ لیتا ہوں، مگر آپ پھر سوچ لیں کہ آپ
کو واقعی اس شخص کا نام لکھوانا چاہتی ہیں جس کے
بارے میں آپ کو یہ غلط فہمی ہے کہ وہ میرا دوست ہے؟“

”میں تو ٹھاکروں کے نام بھی لکھواتا چاہتی ہوں“
 آپ نے ان سے اعتراض کیوں نہیں کیا؟
 ”اس لیے کہ ان کا اس معاملے سے تعلق ہے،
 شہکھو ان کا رشتہ دار تھا، وہ ایسا کر سکتے ہیں سمجھ رہے۔
 خیر میں پرچہ کاٹے دیتا ہوں، تاکہ آپ کو یہ خیال نہ
 رہے کہ بدر میرا دوست ہے۔“ پھر مسکرا کر میز پر
 قدرے آگے کو جھکا مگر ایک بات یاد رکھیے گا میم
 صاحب! پہلی کے ایک شخص نے بھی آج تک مجھے یا
 بدر کو راہنی کی کسی واردات میں نامزد نہیں کیا۔
 وہ سب یہ یا زباندھے سیدھی کٹری ہوئی۔

”اسپیکٹر صاحب! اس نے چرے پہ آئے بال پیچھے
 ہٹائے، میں نے راہنی کی واردات میں بدر کا نام تو لیا
 ہی نہیں، صرف آپ کی بات کی تھی۔“
 نادر شاہ گڑبڑایا مگر جلد سنبھل گیا۔

”معذرت۔“ پھر پرچہ کاٹ کر کانڈی کارروائی
 مکمل کی۔

”مجھے امید ہے آپ شہکھو کے قتل کی تفتیش
 کے سلسلے میں ان تینوں افراد کو تھانے بلوا کر پوچھ گچھ
 کریں گے۔“

”آپ بے فکر رہیے، میرے ان تینوں افراد سے
 برابر کے تعلقات ہیں۔“

”نتیجہ آپ کی مرضی کے مطابق ہوں یا نہ ہوں،
 مگر تفتیش ضرور ہوگی۔“ اس کے انداز میں ہلکا سا طنز
 تھا، وہ استہزائیہ سر جھٹک کر منہ میں انگریزی میں کچھ
 بددلتی والی باتیں مڑی ہی تھی، جب اس نے نادر شاہ کو
 کہتے سنا تھا۔

”بدر میرا دوست نہیں ہے۔“

اور یا ہر نکتے ہوئے مایا کو لگا تھا، وہ سچ کہہ رہا ہے۔
 شاید راہنی کی اس ادھوری واردات نے وہ دوستی ختم کر
 دی تھی۔



وہ صبح خزاں آلودھی پھوٹ رہی تھی۔
 راجپوتوں کی حویلی کے پچھواڑے کلاو کی اونچی

فصل کے پار الگ سالٹاس کا ایک اونچا درخت کھڑا
 تھا۔ تین عمر رسیدہ اور نئے موتے تھے۔ سانس کے
 زمین صاف اور مٹی برابر تھی۔ شام چھ بجے وہاں کھڑے
 کے پاسیوں کی بیٹھک لگا کر بیٹھ گئے تھے۔ شام چھ بجے وہاں کھڑے
 چھڑکاؤ ہوتا، چارپائیاں بچھے جاتیں اور کچھ پھل پھل
 سوندھی خوشبو میں حقوں کی گڑبڑاوت کو بخار لاتی تھی۔
 اس زردی صبح سالٹاس کا درخت خلی خلی سا رہتا تھا۔
 دور دور تک کوئی چلتا پھرتا دکھائی نہ دیتا تھا، پھر جانے
 کس سمت سے آکر وہ ایک نئے سے بندھے رہتی کے
 جھولے پہ آہستہ سے بیٹھ گئی درخت کو پتائی نہ چلا۔
 اس نے سرری سے نکا دیا۔ ہوا سے جھولا آگے
 پیچھے دھیمادھیماسا جھولنے لگا۔ وہ کھیتوں سے اور فضا
 میں جانے کھوجتی نگاہوں سے کیا تلاش کر رہی تھی۔
 چہرہ بے رونق، بالی چوٹی میں مقید اور ہار کھٹارنا پید تھا۔
 تنگ پاجامہ، کلائی تک پھٹی چوڑی درستیہیں اور
 یہ بڑا سا دپٹہ جو گردن سے لپٹا نیچے پچی مٹی کو چھو رہا
 تھا۔

ہوا کا تیز جھونکا آیا، سالٹاس کا سرو قد درخت جیسے
 نیند سے جاگا، فضا میں بکھری اس کی خوشبو محسوس کی
 اور بہت سے پتے اس کے قدموں میں گرا ڈالے۔

اسی بل آہستہ سے کسی نے جھولے کی دونوں
 رسیاں اپنے ہاتھوں میں لی تھیں۔ ہولے ہولے
 حرکت کرتا جھولا سا کھن ہوا تو وہ جو رسی سے سر نکائے
 سوچ میں گم تھی، چونک کر ”کون“ کہتے کہتے گردن
 موڑی تو باقی الفاظ بول نہ ہی پونے دو توڑ گئے۔

وہ بالکل اس کے پیچھے کھڑا سنجیدگی سے اسے دیکھ رہا
 تھا۔

”میں ہوں بدر۔“

”میں کب بدر کو نہیں جانتی۔“ وہ ایک دم اٹھی اور
 آگے بڑھنے لگی۔

”میری بات تو سنو مایا!“

وہ جھٹکے سے پلٹی۔

”تمہیں لگتا ہے مجھے تمہاری بات سنی چاہیے؟“

”اگر لازم سمجھتی ہو تو صفائی کا موقع تو دو۔“

”مذہب نہیں، مجرم ہو تم میرے۔ تم سب میرے مجرم ہو۔ تم وہ تمہارا اٹھانے وار دوست۔“ تم کو غصے کی شدت سے اس کی آواز پھٹنے لگی۔ ”اور یہ تھا کہ تم نے مل کر میرے شوہر کا خون کیا ہے۔ مجھے تو اسی دن تمہاری اصلیت سمجھ جانی چاہیے تھی جس دن تم نے جنگل میں میرا راستہ روکا تھا۔ بتائی کے وہ ڈاکو جن کا ذکر یہاں کوئی نہیں کرتا میں جانتی ہوں وہ کون ہیں۔ وہ تم ہو۔ وہ تم ہی تھے جو اس روز گھوڑے پہ بیٹھے تھے اور وہ میرے ساتھ پٹر پٹر بولتے والا ناؤر شاہ تھا تم لوگوں نے پہلے میرا راستہ روک کر لوٹنے کی کوشش کی، اور اب کیا کیا؟ میرے مرے ہوئے شوہر پر الزام لگاؤ اس کہانی کا، جو تمہاری خود ساختہ ہے، جسے اپنی عیاری اور سفارتکاری سے تمہارے گروہ نے بیلے کے ہر شخص کے دل میں خوف کی طرح بٹھا دیا ہے۔“

وہ خاموشی سے لب بٹھپچھپکھڑا تھا، رسی ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی۔

”قبرستان کا بھوت، منگل سنگھ کا قاتل، جنگل کے ڈاکو، وہ سب تم لوگ ہو۔ تم لوگوں نے ہمیں بدل بدل کر پورے گاؤں کو دہشت زدہ کر رکھا ہے۔ جانتے ہو میں نے تمہارے اس دو غلے پن کے خلاف آواز کیوں نہیں اٹھائی؟ کیونکہ میں تمہاری راہزنیوں کو خود سے دلیلیں دے کر صحیح ثابت کرتی رہی کہ آخر فرنگی ناجائز غاصب ہیں تو ان سے تمہارے بدلے کا یہی ایک راستہ ہے، مگر جانتے ہو مجھے غصہ کس بات کا ہے؟ تم نے مجھے اپنے اور شیکھر کے تنازعے کا بتایا، نہ ہی اس جوگی کا جس کا نام شیکھر ہے۔ صرف یہ کہہ دیا کہ منگل سنگھ نے شیکھر کا نام لیا تھا کب گاؤں میں کوئی دوسرا شخص اس نام کا نہیں ہو سکتا تھا؟ تم نے میرے شوہر سے ہی کیوں دشمنی نکالی۔“

”میری شیکھر سے کوئی۔۔۔“

”مجھے صفائیاں مت دو،“ انہیں عدالت کے لیے سنبھال رکھو۔“

وہ زخمی سا مسکرایا۔ ”تمہاری عدالت کے لیے۔“

شاید وہ سمجھا نہیں تھا۔

”قانون کی عدالت کے لیے۔“

اس کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ ”کیا مطلب؟“

”مت کہنا کہ تمہارے تھانے وار دوست نے تمہیں ایف آئی آر کے متعلق نہیں بتایا۔“

”میں واقعی لاعلم ہوں۔“ اس کے چہرے پر برہمی آ گئی۔ بل بھر میں وہ ہندوستانی مرد بن گیا تھا، جھولے کی رسی کب کی اس نے چھوڑ دی تھی۔

”تو جا کر اس ذکیت سے پوچھو جو تھانے وار بادشاہ بن کر انگریز سرکار کی آنکھوں میں دھول جھونکتا ہے۔“

وہ جو کچھ کہنے لگا تھا، سختی و ناگواری سے لب بٹھپچھپ تیزی سے واپس مڑ گیا۔

چند لمحوں بعد وہ اس کی نگاہوں سے اوچھل ہو گیا تھا مگر وہ دیکھ چکی تھی کہ وہ تھانے وار تھا۔

خالی جھولا ہولے ہولے ہلتا ٹھمرنے کو تھا۔ مایا نے دیکھا، جھولے کے پیچھے کچی زمین پر بدر کے جوتوں کے نشان رہ گئے تھے۔ اتنے تازہ اور صاف نشان جیسے ہاتھ سے منقش کیے گئے ہوں۔

وہ جیسے خواب سے چوٹی۔

ایک خیال سرعت سے اس کے ذہن میں سر اٹھانے لگا۔ وہ ایک دم مڑی اور حویلی کی طرف بھاگی، لمبا دوپٹہ کا دھڑے سے لگا مٹی پہ بھاڑ دوڑا گیا۔

”رام ناتھ!“ کو جوان رام ناتھ حویلی کے دروازے پہ ہی اسے مل گیا۔ وہ بہلی، رتھ، بھٹی، اور انگریزی گھوڑا گاڑی، سب چلا آتا تھا اور ہندوستانی ایسے شخص کو محض ”بہل پان“ کہہ دیا کرتے تھے، مگر وہ اسے کو جوان ہی مانتی تھی۔

”جی ہاں، لکن! وہ ہاتھ باندھے کام جموڑ کر حاضر ہوا۔“

”تمہیں فضل الہی کے گھر کپتہ ہے؟“

”کون جی؟“

”وہ جو کھوٹی ہے۔“

”پولیس کا کھوٹی فضل الہی؟ ہاں جی، سہم ہے۔“

”جاؤ، اسے بلا لاؤ، کو میم صاحب نے بلا بھیجا ہے۔“

رام ناتھ اٹے قدموں مڑ گیا اور تھوڑی دیر بعد فضل الہی کے ساتھ اس کی واپسی ہوئی۔

”رام ناتھ! تم جاؤ اب اپنا کام کرو اور آپ میرے ساتھ آئیے۔“

جب وہ کھوجی کے آگے چلتی الماس کے اواس درخت کے پاس واپس آئی تو سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ سنہری چمکیلی کرنیں اس کے چہرے سے لپٹنے لگی تھیں۔

جھولا ابھی تک ہوا سے ہولے ہولے ہل رہا تھا۔ اس نے احتیاط سے وہاں قدم رکھتے ہوئے رسی تھام لی۔ جھولا رک گیا۔

”آپ کو وہ کھرایاد ہے جو کچے راستے پہ تھا، اس شخص کا جو آخری دفعہ شیکھو سے ملا تھا۔“

”یاد ہے۔“

”تھیک سے یاد ہے نا؟“

کھوجی فضل الہی دھیرے سے مسکرایا۔

”میم صاب! مجھے دس برس پرانے کھرے بھی یاد ہیں، آپ پوچھے کیا پوچھنا ہے۔“

”اچھا یہ کھرا دیکھ کر بتائیے، کیا وہی کھرا ہے؟“ اس نے جھولے کے عقب میں ثبت کھروں کی جانب اشارہ کیا۔

کھوجی آگے بڑھا، پہلے جھکا، پھر پنچوں کے بل زمین پہ بیٹھ کر غور سے مٹی کو دیکھنے لگا۔

”یہ کھرا؟“

”ہاں ہئی۔“ وہ بے صبری سے بولی۔

چند لمحوں بعد وہ ہاتھ جھاڑا کھڑا ہوا۔

”یہ وہ کھرا نہیں ہے۔“

”ہیں؟“ وہ پریشان سی پیچھے ہٹی۔

”جی میم صاب! یہ وہ کھرا نہیں ہے۔“

اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا اور آنکھیں تھک کر میچ کر کھولیں۔

”ہو سکتا ہے اس نے کوئی اور جوتی پہن رکھی ہو۔“

”نہیں میم صاب! مٹی جھوٹ نہیں بولتی، دھوکہ

نہیں دیتی۔ یہ کھرا کسی لمبے قدم کے مناسب جوتوں کے آدے کا ہے جس نے کسی چمچہ کو سے۔“ کھوجی نے ہاتھ

اودھر دیکھا، پھر نگاہ جھولے پہ گھسائی، ”تھاپا اس جھولے کی رسی کو تھام رکھا ہے۔“ وہ دوسرا کھرا

مختلف ڈیل ڈول کے آدے کا تھا۔“

”مختلف ڈیل ڈول؟“ وہ بڑبڑوہا سا مسکرائی، ”نہیں“

چند لکیریں دیکھ کر آپ قد کاٹھ اور ڈیل ڈول کا حساب کیسے کر لیتے ہیں؟“

”مٹی کی زبان پڑھنا کیا مشکل ہے میم صاب؟“

بولتا تو اس کے انداز میں ہلا کی سادگی تھی۔

”مجھے جو چند ٹیڑھی میڑھی اشکال نظر آتی ہیں، آپ انہیں زبان کہہ کر انہیں پڑھ اور سمجھ کر مطلب کیسے اخذ کر لیتے ہیں؟“

فضل الہی نے اسی سادگی سے دریافت کیا تھا کہ ان کے کتب خانے میں جو انگریزی کی موٹی موٹی کتابیں رکھی ہیں، کیا وہ آپ سے پڑھی جاتی ہیں؟“

”ارے انگریزی پڑھنا کون سا مشکل ہے۔“

”جبکہ مجھے آپ کے انگریزی الفاظ ٹیڑھی میڑھی اشکال نظر آتے ہیں۔“

وہ بے ساختہ ہنس دی تو رسی ہاتھ سے پھسل گئی، جھولا ہوا میں جھول کر رہ گیا۔

”شکریہ۔“ وہ اپنے ساتھ لیے حویل کی جانب بڑھ گئی۔ ”اگر وہ کچے راستے والا کھرا کہیں آپ کو دکھائی دے تو۔۔۔“

وہ دونوں چلتے چلتے دور ہوتے گئے، ملیا کی آواز مدھم پڑتی گئی۔

الماس کا اواس درخت اور جھولا پھر سے ویران ہو گئے۔



وہ برآمدے کی دوسری میڑھی۔ بیٹھی تھی، پاؤں گھاس پہ اور کہنی گھٹنے پہ ٹکائے، اچھا تھوڑی تلے

رکھے وہ سر جھکائے کتب پڑھ رہی تھی، جب ٹھاکر رکھو ناتھ اور گپال آگے پیچھے گھاس قدموں تلے

ز کے مناسب بدن کے
کھوجی نے ادھر
ٹھہر گئی "تالیا" اس
- ۵۵ - سرا کھرا بہت

ہا سا مسکرائی زشتن پہ
روڈیل ڈول کا حساب

یہ میم صاب ہے؟ وہ

کال نظر آتی ہیں
اور سمجھ کر مطلب

یافت کیا تھا کروں

سوئی مونی کتابیں

ن ہے۔

ٹھہر گئی میڑھی

سے پھل گئی

حویلی کی جانب

کہیں آپ کو

کی آواز نہ ہم

سے ویران ہو

تھی پاؤں

سوڑی تلے

جب ٹھاکر

میں تلے

دندے باغیچے میں داخل ہوئے اور اس کے قریب
ان کے۔

"مایا دیوی! ٹھاکر گھوٹا تھہ نے اسے پکارا۔

اس نے ذرا سی نگاہ بلند کی۔ ان کے چہرے ضبط

اور دبا دبا تھا۔ صبح انہیں تھانے بلوایا گیا تھا یقیناً

وہیں سے آرہے تھے۔

"آپ نے ہمارے خلاف ایف آئی آر کونوائی ہے؟"

"جی! اس کے اطمینان کا وہی عالم تھا۔

گوپال تلملا کر بولا "آپ کو لگتا ہے ہم شیکھر کا

ذمن کر سکتے ہیں؟"

اس نے نگاہ کا رخ گوپال کی جانب موڑا اور اس پر

سر سے پاؤں تک ایک گہری نظر ڈالی۔

"کر سکتے ہیں۔"

"کیوں کر س گے ہم ایسا؟"

"شیکھر کی دولت کے لیے۔"

"مگر اس نے تو پائی پائی آپ کے نام کر دی تھی

ہمارے لیے ایک وٹری "ایک چھدا ام بھی نہ چھوڑا۔"

"آپ جانتے تھے ٹھاکر صاحب کہ اس کی موت کی

صورت میں میں واپس انگلستان چلی جاؤں گی اور

سب کچھ آپ کی نگرانی یا ملکیت میں دے جاؤں گی

دونوں صورتوں میں آپ ہر چیز کی بلا شرکت غیرے

مالک ہوں گے۔"

"مگر۔"

"آپ کے اور شیکھر کے درمیان جائیداد کے

تنازعے برسوں سے موجود تھے۔ وہ سنے یا رتے بغیر

آرام سے کئے جا رہی تھی "سو آپ نے اس کا ایک

موثر حل یہ ڈھونڈا کہ شیکھر کو مٹانے کے بعد مجھے

بھی یہاں سے بے زار کر کے بھیج دیا جائے۔"

"مگر ہم نے تو آپ کو کبھی تنگ نہیں کیا۔"

"کیا بالکل کیا۔ مجھے ہر اسل کیا گیا۔" اس نے

گوپال پہ ایک تیز نگاہ ڈالی۔ "مجھے تو کرانیوں کی زبانی

جنوں بھوتوں کے جھوٹے سچے قصے سنائے گئے یہاں

تک کہ ٹھاکر گوپال نے ایک خادمہ کے ذریعے شادی کی

پیشکش بھی کر ڈالی۔"

بڑے ٹھاکر نے ایک تہہ آلود نظر گوپال پہ ڈالی وہ

نگاہیں چا کر رہ گیا۔

"مایا دیوی! ہم نے تو آپ کی بہت مدد کی آپ کی

جائیداد کو اسے کا نظام بھی کر لیا تھا۔"

"وہ بھی اپنے بیٹے کے ہاتھوں؟"

"آپ کو واقعی لگتا ہے ہم شیکھر کا خون کر سکتے

ہیں؟"

"مجھے واقعی لگتا ہے۔" وہ پھر سے کتاب پڑھنے

لگی۔

گوپال پھر پختہ وہاں سے چلا گیا۔ ٹھاکر گھوٹا تھہ بھی

کچھ سوچتے ہوئے دھیرے دھیرے قدم اٹھاتے چل

لیے۔

"میم صاحب! اسی لمحے بکاول کسی وردی میں

ملبوس تھانے کے لپکار کو ساتھ لیے غلت میں اس

تک آیا۔

مایا نے کتاب بند کر کے گردن اٹھائی۔

"بولو۔"

"داورندہ صاحب نے بندہ بھیجا ہے آپ کو تھانے

بلا تے ہیں۔" سنہری پیشانی شکن آلود ہو گئی۔

"میں تمہارے داورندہ کی ملازم نہیں ہوں جو

دوڑی چلی آؤں اس سے بولو اگر مجھ سے کوئی کام ہے تو

حویلی آجائے۔"

ایک کار قدرے تذبذب سے مڑنے لگا مگر کسی خیال

کے تحت اس نے روک دیا۔

"سنو تھانے میں کسی اور کو بھی اس وقت بلا رکھا

ہے اسپکٹرنے؟"

"ٹھاکروں کو بلایا تھا ڈی سی صاب بھی تھے مگر اب

وہ چلے گئے ہیں صرف پھوٹا ملک بیٹھا ہے ادھر۔"

"اچھا ٹھیک ہے تم باہر انتظار کرو میں آتی

ہوں۔"

پھر بکاول کو مخاطب کیا "مونی شر سے آگئی؟"

"نہیں میم صاب! "

"اچھا پھر رام ہاتھ سے کو بھی تیار کرائے میں

آئی ہوں۔“

کتاب ہاتھ میں پکڑے وہ اٹھ کر اندر چلی گئی۔
تیار کیا کرتی تھی، بس کرتا یا جامہ تبدیل کر کے
سفید ساڑھی زیب تن کرتی، چوٹی ٹھول دی تو موتیوں
سے بھری لڑی پیچھے بالوں میں لٹکنے لگی۔ آنکھوں میں
گہرا کاجل ڈالا اور باہر نکل آئی۔

نادر شاہ اپنی کرسی پہ براجمان تھا، سامنے میز رکھی
تھی اور میز کی دوسری طرف دو کرسیاں بچھی تھیں۔
باہمیں کرسی پہ بدر ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بیٹھا تھا۔
جس وقت وہ کمرے میں داخل ہوئی، وہ ہاتھ اٹھا کر
نادر شاہ سے کچھ کہہ رہا تھا، آہٹ پر خاموش ہوا، مگر
گردن موڑ کر نہیں دیکھا۔

نادر شاہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”آئیے میم صاب!“

وہ کرسی کھینچ کر بہت اعتماد سے اس کے بالکل برابر
ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بیٹھ گئی۔

”مجھے کیوں بلوایا آپ نے؟“

”یہ جانتے تھے جو بات ہو آپ کے سامنے ہو۔“
”بولیے۔“ وہ سامنے نادر شاہ کا چہرہ دیکھتی رہی۔

”بدر کا کہنا ہے اس کا شیکھر کے قتل سے کوئی
تعلق نہیں ہے۔ آپ اگر اس معاملے کو یہیں حل
کرنا چاہیے، یا صلح کرنا چاہیں تو بسم اللہ کہہ کر وہ پیچھے
ہو کر بیٹھ گیا۔ مایا کو محسوس ہوا، اس کا انداز جان
چھڑانے والا تھا۔

”مگر مجھے صلح نہیں کرنی۔“

”مجھے بھی نہیں کرنی۔“ مایا کی بات پر وہ تیزی سے
بولا۔ وہ دونوں سامنے نادر شاہ کو دیکھتے ہوئے ایک
دوسرے کو بظاہر نظر انداز کر رہے تھے۔ ”میرا اس
معاملے سے کوئی تعلق نہیں لیکن اگر بات مقدمے کی
ہے تو ٹھیک ہے، آپ اپنا استغاثہ کریں میں اپنا دفاع
کروں گا۔“

”شوق سے کیجیے۔“ وہ نادر کی طرف دیکھتے ہوئے

بولی۔

”اور میں عدالت میں ثابت کر سکتا ہوں گا کہ میں
بے قصور ہوں۔“

”ضرور کیجیے۔“

نادر شاہ ہولے سے طنز یہ مسکرایا۔ ”میں نے تم
سے کہا تھا بدر! اہل فرنگ کی دوستی خطرناک ہوتی ہے۔“

”بات مقدمے کی ہو رہی ہے نادر!“ بدر کو برا لگا
تھا۔

”دیکھیے میم صاب!“ نادر کرسی پہ آگے ہوا، پچھل
بات نظر انداز کر دی۔ ”مجھے بھی علم ہے کہ شیکھر کی
موت حادثاتی نہیں، آگ خود بخود نہیں لگا کرتی، مگر
بطور ایک تھانے دار مجھے شک کی فہرست میں ہر ایک کو
کھینٹتا پڑتا ہے، یہاں تک کہ اس کو بھی جس کو
شیکھر کی موت سے سب سے زیادہ فائدہ ہوا ہے۔“

”کس کو؟“ وہ چونکی۔

”آپ کو ملی ہے۔ شیکھر کی ساری جائیداد آپ
کو ملی ہے۔ سب سے زیادہ فائدہ تو آپ کو ہے۔“

”مگر سامنے کی بات تھی کہ اس کے مرنے کے بعد
میں نے واپس چلے جانا تھا اور میں کیا لندن میں اس
جائیداد کی رجسٹریاں سنبھالتی پھرتی۔ جائیداد ہر صورت
ٹھا کروں کے پاس رہنی تھی، سب سے زیادہ فائدہ تو
انہیں ہو گا۔“

”یہ محض مفروضے اور ”بعد“ کی باتیں ہیں میم
صاب! قانون اندھا ہوتا ہے، وہ صرف پہلا فائدہ دیکھتا
ہے۔“

”تو آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ شیکھر کو میں نے
قتل کیا ہے۔“ وہ ذرا بھی نہ گھبرائی تھی۔

”نہیں، کیونکہ آپ اس روز امرتسر میں تھیں،
میرے پاس گواہیاں موجود ہیں۔ آپ کا alibi بہت
مضبوط ہے کہ آپ بلی میں تھیں ہی نہیں۔“

”alibi تو میرے پاس بھی ہے۔“ وہ تیزی سے بولا
اور چہرہ مایا کی طرف موڑا۔ ”میں بھی اس روز گاؤں سے
باہر تھا۔“

کر دوں گا کہ میں

لرایا۔ ”میں نے تم
نہی خطرناک ہوتی ہے۔“

نادر! ”بدر کو برا لگا

اپنے آگے ہوا، پھیل
ہے کہ شیکھر کی
میں لگا کرتی، مگر
ست میں ہر ایک کو
کو بھی جس کو
فائدہ ہوا ہے۔“

ری جائیداد آپ
کو ہے۔“

مرنے کے بعد
لندن میں اس
یہ او ہر صورت
زیادہ فائدہ تو

تس ہیں میم
سلا فائدہ دیکھا

و کو میں نے

میں تھیں
alibi بہت

۔“

زی سے بولا
ز گاؤں سے

”ہاں میں جانتی ہوں آپ کہاں تھے۔“

”آپ کیسا سب جانتی ہیں کہ نیلی کے ڈاکو کون ہیں
بڑی شیکھر! نادر کو بھلے نہ جانتے ہوں، مجھے سب
جانتے ہیں۔“

نادر کے چہرے کا رنگ پل بھر کو بدلا۔ ”میرا اس
معالے سے کوئی سروکار نہیں ہے۔“ مگر بدر نے بغیر
ہی کے جا رہا تھا، اس نے شاید نادر کا انداز محسوس ہی
نہیں کیا تھا۔

”مگر۔۔۔ کسی نے آج تک میرے خلاف پرچہ
نہیں کٹوایا۔ کیا کسی ایک شخص نے بھی نیلی میں آپ
سے ذکر کیا کہ جنگل کے ڈاکوؤں کا سردار بدر عازان ہے؟
جانتی ہیں کیوں؟ اس لیے نہیں کہ وہ مجھ سے ڈرتے

ہیں، بلکہ اس لیے کہ وہ مجھ سے پیار کرتے ہیں، انہیں
میری صورت میں گاؤں کا ایک محافظ مل گیا ہے، انہیں
معلوم ہے کہ جب تک بدر عازان نیلی میں ہے، ان
کے کسی گواہ میں نقب نہیں لگے گا۔“

مایا نے ناگہی کے عالم میں اسے دیکھا۔

”آپ یہاں کے ڈاکوؤں کی نفسیات نہیں جانتیں۔

ہندوستان کے ڈاکو جو پولیس کے لیے دوہرے ہوتے
ہیں ان کے سب سے بڑے محافظ خود ان کے اپنے
گاؤں والے ہوتے ہیں اس لیے کہ اس گاؤں میں نہ تو
وہ ذکیت خود واردات کرتا ہے، اور اگر ذکیت طاقتور ہو

تو دور دور کے کسی ڈاکو کو ہمت نہیں ہوتی کہ وہ اس
گاؤں کے قریب بھی پہنک سکے۔ پولیس سے زیادہ تو
ڈاکو حفاظت کرتے ہیں گاؤں کی۔ یہ ڈاکوؤں کا کلچر ہے،

اور مایا دیوی! آپ مائیں یا نہ مائیں، فرنگیوں سے ہم
سب نفرت کرتے ہیں، وہ غاصب، چور اور جابر ہیں، اور
انہی فرنگیوں کے خلاف جب ہم بغاوت کرتے ہیں تو
یقین مانیے کیا ہندو اور کیا مسلمان، سب ہمارا ساتھ
دیتے ہیں۔“

وہ خاموشی سے لب کاٹتی، دو متضاد کیفیات کے
درمیان گہری تھی۔ پھر چند ثانیہ بعد بولی۔

”مگر تمہارے اور شیکھر کے درمیان کوئی تنازعہ تو
بہر حال تھا۔“

”اگر آپ غصہ کرنے کے بجائے مجھ سے پوچھ
لیتیں تو بہتر ہوتا۔“ اس نے گہری سانس لی۔ ”وہ زمین
ٹھا کر رکھنا تھا، نے ایک چوہدری کو بیٹی اور اس نے
مجھے بعد میں شیکھر نے دعو کیا کہ زمین اس کی ہے
اور اس۔۔۔ میرا قبضہ ہے۔ ٹھا کر اس نے اس چوہدری کو
ساتھ ملا لیا اور مکر گئے کہ مجھے کسی نے زمین بیچی ہے۔
مقدمہ ابھی تک عدالت میں ہے جس کا فیصلہ میرے
حق میں جلد یا بدیر ہو ہی جائے گا، پھر شیکھر کو مارنے
سے کیا ملتا مجھے؟ اصل فریق تو ٹھا کر ہیں۔“

اور وہ جیسے ہار گئی۔

”پھر کیا اسے ٹھا کر اس نے مارا ہے؟“

”میری رائے مانگ رہی ہیں؟“ بدر کا لہجہ متوازن
تھا، پسے کی طرح دوستانہ نہیں تھا، مگر راضی بھی مفقود
تھی۔

”اگر مانگوں تو۔۔۔؟“

”تو میں کہوں گا، نہیں۔۔۔ ٹھا کر شیکھر کو قتل
نہیں کر سکتے۔“

”مگر کیوں؟“ وہ حیران رہ گئی۔

”اس لیے نہیں کہ ٹھا کر اس کے ہاتھ کچھ نہ آتا تھا،
بلکہ اس لیے کہ وہ اتنے جی دار نہیں ہیں۔“

”لیکن شیکھر کہتا تھا۔“ اسے یاد آیا کہ اگر ان
باپ بیٹے کا بس چلے تو اسے قتل کر کے جائیداد
تھیا لیں۔

”شیکھر کہتا تھا نا، سوغلط بھی کہہ سکتا ہے۔“

”وہ ان کو جانتا تھا تو کہتا تھا۔“

”وہ گاؤں میں رہتا تو کسی کو جانتا ہوتا۔ ٹھا کر گاؤں
کے ساتھ جتنے بڑے ہوں اس کے ساتھ اتنے بڑے
نہیں تھے، جتنا اس کو اس کے مٹی بھر کا تے تھے۔“

”اجھا۔“ مایا نے شانے اڑکا دیے۔ ”مجھے امید نہیں
تھی کہ تم ٹھا کر اس کی حمایت کرو گے۔“

”میں صرف اپنی رائے دے رہا ہوں۔“

”آپ کیا کہتے ہیں داروغہ صاحب؟“ اس نے
بہت دیر سے خاموش بیٹھے نادر کو مخاطب کیا۔
”میں ابھی تفتیش کر رہا ہوں، ٹھا کر رٹا ہر مجھے

بے قصور لگتے ہیں مگر انہیں یکسر نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔

”اور یہ قبرستان کے بھوت کا کیا قصہ ہے؟“
”میں صاحب میرا خیال ہے ادھر کوئی نہیں ہے۔ یہ گاؤں والوں کا من گھڑت قصہ ہے۔ بہر حال میں ان تینوں سے مزید تحقیق کروں گا اور اگر یہ مجھے بے قصور لگے تو انہیں کیس سے خارج کر دوں گا۔ اگر یہ ملزم نکلے تو انہیں سزا ملے گی۔“

”جیسے آپ کی مرضی۔“ وہ بدر کو کیس سے خارج کرنے کا کہنا چاہتی تھی مگر انا آڑے آگئی تو فیصلہ نادر شاہ پہ چھوڑ کر باہر چلی آئی اسے معلوم تھا یہ تینوں نام وہ جلد ہی خارج کر دے گا۔

”بڑی زیادتی کی آپ نے لیڈی شیمکھو!“
وہ اس کے پیچھے آیا تھا۔
”مایا!“ اس نے زک کر تھج کی اور پھر چل پڑی۔ وہ جو چند قدم عقب میں تھا، مسکرا کر رہ گیا۔
”جائے جائے ٹھہر گئی اور خفگی سے گردن موڑی۔“
”مسکرائے کیوں؟“

”حالانکہ میں آپ کے مرنے سے قبل ہی اپنی مسکراہٹ چھپا چکا تھا، آپ کو کیسے علم ہوا؟“
”مجھے سب ظلم ہوتا ہے، جانے تم مجھے کیا سمجھتے ہو؟“

وہ پھر سے مسکرا دیا۔
”مسکرائے کیوں؟“
”اب یا پہلے؟“

”میں تمہارے ساتھ کسٹی کھیل رہی ہوں؟“ وہ نہج ہوئی۔
بدر کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ سفید ساڑھی میں سیدھے سنہری بال لیے وہ خفا خفا اسے دیکھ رہی تھی۔

”آپ کی وجہ سے آج میرے اتنے اچھے دوست کو مجھے طنز کرنے کا موقع ملا۔“
”نہیں۔“ وہ تیزی سے بولی۔ ”وہ تمہارا دوست نہیں ہے۔“

”ارے نہیں۔“ وہ مسکرا رہا تھا۔ ”نادر میرا بہت اچھا دوست ہے۔“

وہ کچھ کہنے لگی، پھر ٹھہر گئی، اسے لگا وہ اسے بتانا خبردار کرے، وہ یقین نہیں کرے گا۔

”شاید۔“ اس نے شانے اچکائے اور سفید ساڑھی کا بلو درست کیا۔ بدر کی نگاہ اس کے سر پر پھسلتی چلی گئی۔

”اتنے سفید رنگ پہنتی ہو تو بالکل کوئی۔“ وہ لمبے بھر کو ٹھہرا۔

”کہہ دو بدروح لگتی ہوں۔“

”پری لگتی ہو۔“

مایا نے ابرو اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ شاید پہچان گئی تھی، مگر اس کا اعتراف خلاف اٹانہ ہوتا تو وہ کہتی ڈالتی۔

”سچ کہہ رہا ہوں۔ زہرہ کہتی ہے، ٹھاکروں کی یہ مہارانی تو ساحرہ ہے، میں سوچ رہا تھا وہ ٹھیک کہتی ہے۔“

وہ چند قدم اس کے قریب آیا۔

”کیسی ہے زہرہ؟“

”خوب صورت ہے۔“

”میں نے حال پوچھا ہے۔“

”وہ بھی بہت اچھا ہے۔“

”مکیتیر ہے تمہاری، تو شاوی کب کرو گے اس سے؟“

”آپ نے اس روز کہا تھا کہ قبرستان میں رات ٹھہر کر اس بھوت کی گھات لگاتے ہیں۔“ اس نے بات بدل دی۔

”معلوم نہیں کوئی بھوت ہے بھی یا نہیں، میں تو بلی کے لوگوں کی نوٹنکیوں سے تنگ آگئی ہوں۔“

چلتی ہوں۔“

وہ اسے دور جاتے دیکھتا رہا۔

”زہرہ ٹھیک کہتی ہے۔“ اس نے سوچا تھا۔

”تھانے دار نے تذکرہ کیا تھا کہ آپ نے میرا اور میرا جی کا نام مشتبہ افراد کی فہرست سے نکال دیا ہے۔“

کھانے کی میز پر گوپال نے کرسی کھینچتے ہوئے قدرے
معاذی انداز میں بات شروع کی۔

کھانے کا کمرہ بے تحاشا انگریزی فرنیچر سے بھرا ہوا
تھا۔ فرنگی ایسے ہی گھروں کو بے جا چیزوں سے بھرنے
کے لیے بدنام تھے۔ چیزیں اچھی خریدتے مگر جانے کا
ذوق ناپید تھا۔ اور شکھو ان ہندوستانیوں میں سے
تھا جو اہل فرنگ کی نقالی میں پیش پیش رہتے تھے۔
”بدروزان کا بھی واپس لے لیا ہے۔“

گوپال رکابی اپنے سامنے رکھتے رکھتے چونکا۔ ”اس کا
ہم بھی تھا؟“

”ہاں! وہ سر جھکائے کھاتی رہی۔“

”تو واپس کیوں لیا؟“

”مجھے لگا وہ بے قصور ہے۔“

”اور ہمارا نام؟“

”بدروزان! آپ بھی بے قصور ہیں۔“ گوپال کو جھٹکے

پہنچنے لگے۔

”بدروزان! بدروزان!“

وہ رومال سے ہاتھ صاف کر کے، کرسی دھکیل کر
اٹھی۔

”جی بدروزان کہنے میں نے نام تو واپس لے لیا مگر

نیک سر حال مجھے ابھی تک آپ پر ہے۔“

گوپال جزیبہ و تاملان ڈالنے لگا۔ وہ سر جھٹک کر باہر

نکل آئی۔ ابھی یہ دھیوں پہ چڑھی ہی تھی کہ روپوٹی

نے روک لیا۔

”میم صاب! یہ چھوٹے ملک نے بھیجا ہے۔“ دبی

تواز میں کتے چاندی کی طشتری سامنے کی، جس پہ

سرخ نخل کا ٹکڑا بچھا تھا۔ اس پہ ایک ہندو رقعہ رکھا

تھا۔

وہ پہلی میز پر پہنچی تھی، قدر دراز تھا ہی، اوپر

کھڑے ہونے کے باعث مزید اونچی اور نیچے طشتری

تھا کہ کھڑی روپا بہت چھوٹی لگ رہی تھی۔

ماما نے رقعہ اٹھا کر کھولا۔

”اگر میرے سارے قصور معاف کر دیے ہیں تو

کل صبح میں کنویں کے کنارے تم سے بات کرنے کا

شکر ہوں گا۔“

اس نے رقعہ مٹھی میں دیا۔

”اس کا لپچی باہر کھڑا ہے۔“

”جی میم صاب!“

”اسے کو! اپنے مالک سے کہہ دے، پیغام وصول

کر لیا ہے اور سنو یہ چھوٹا تھا کہ کھارے کب جا رہا ہے؟“

”غالباً!“ اسی بدروزان کو۔“

”یعنی دو دن بعد۔“ وہ مڑی اور میز صاف پر جھکی

”سفید ساڑھی کا پلو اس کے پیچھے پیچھے زینوں سے لپٹا

اوپر جا رہا تھا۔“

اور جب وہ دروازے کے پیچھے گم ہو گئی تو روپوٹی

باہر جانے کے بجائے، آہستہ سے کھانے والے کمرے

کی جانب بڑھ گئی۔

صبح ابھی نیلی ہی تھی جب وہ کنویں پہ آگئی۔ وہاں

آج بھی بچی نہیں پہنچے تھے۔

بیری کے درخت کے ساتھ ہندو سفید گھوڑا سر

جھکائے کرے چوں میں منہ مار رہا تھا۔ اس نے

گھوڑے کو دیکھا تو فوراً ”گاہ ادھر ادھر گھوڑی“ اور پھر وہ

اسے نظر آئی گیا۔

کنویں کی جگہ پہ بیٹھا، سر جھکائے جوتے سے پتے

کو ملتا۔

وہ دے قدموں، ایک دم سے اس کے سامنے آ

گئی۔

وہ بے اختیار کھڑا ہو گیا۔

”ماما!“

وہ جس سفید ساڑھی میں ماتم کنل بیوہ کی توقع کر رہا

تھا، وہ تو آج نرالی چھب میں تھی۔

گہرا سرخ کرتا پاجامہ، کہنی تک آتی آستینیں اور

ان کے آگے کلاسیوں تک سرخ جوڑیوں سے بھرے

ملائم دودھیا بازو آنکھوں میں گہرا کاجل اور گلے چہرے

کے دونوں اطراف میں گرتے بالوں میں ایک طرف

لگتی موتیوں بھری لٹ - وہ اکثر بال کھولتی تھی،
ہندوستان میں کھلے بالوں والی عورت کو بے حیا اور
آوارہ تصور کیا جاتا تھا۔

بیلی میں کوئی شریف عورت بال نہیں کھولتی تھی،
مگر یہ وہ واحد لڑکی تھی جو کھلے بالوں میں بدر کو اور بھی
زیادہ حسین لگتی تھی۔

”جب تم نے کہا میں رنگ نہیں پہنتی۔ تو میں نے
سوچا، تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔ میں زندگی سے رنگوں کو
نکال کر خود پر ظلم کر رہی تھی۔ میں کون سا ہندوستانی
ہوں، مجھے لگا اگر رنگ پہننے لگوں تو یہاں کوئی خاص
اعتراض نہیں کرے گا۔“

”نہیں کرے گا۔“ بے اختیار لیوں سے پھسلا، وہ
مہوت سال سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنے سحر انگیز سراپے
سے بے نیاز کتوں کی منڈیر پر بیٹھ گئی اور گلانی میں پڑی
چوڑیاں ادھر ادھر سیدھی کرنے لگی، پھر سر اٹھا کر اسے
دیکھا۔

”تم نے مجھے اس لیے بلایا ہے کہ یوں دربان کی
طرح سامنے کھڑے رہوں؟“

”ارے نہیں۔“ وہ آہستہ سے ساتھ بیٹھ گیا۔
”پھر کس لیے بلایا تھا؟“ اس نے ہاتھ سے سارے
بال سمیٹ کر دائیں کندھے پہ ڈالے سرخ چوڑیاں
کھنک اٹھیں۔

”معلوم نہیں۔“ وہ سامنے دیکھنے لگا۔ ”بس اس روز
تمہارے اچانک غصے پہ ابھی تک حیران ہوں۔“

”بدر! تمہیں میرے ساتھ صاف صاف بات کرنی
چاہیے تھی۔ تمہیں اپنے اور شیکھر کے معاملے
کے بارے میں مجھے آگاہ کرنا چاہیے تھا۔ پھر یہ سوچے
بغیر کہ کوئی اور بھی شیکھر نام کا ہو سکتا ہے، تم نے
سارا الزام شیکھر کے سر ڈال دیا۔ وہ میرا شوہر تھا بدر!
مجھے دکھ ہوا ہے۔“

”میرا تنازعہ ٹھا کر ان کے ساتھ تھا اور میں معافی
چاہتا ہوں کہ ناوانستگمی میں میں نے تمہیں دکھ دیا،
مجھے واقعی شیکھر پہ شک نہیں کرنا چاہیے تھا مگر اس
کا نام پر یقین ہو کر میں نے تب ہی لیا تھا جب تم نے

کسی کالی چادر والے کو گودام میں داخل ہوتے دیکھا
تھا۔ مجھے لگا یہ سب شاید شیکھر کر رہا ہے۔“
”ہوں۔“ اس نے لب مسکڑے سارا بھڑا جیسے
ختم ہو گیا تھا۔ ”کون ہو سکتا ہے وہ شخص؟“
”اگر وہ ٹھا کر شیکھر نہیں ہے تو۔“

”بدر!“ اس نے صدمے سے اسے دیکھا۔
”تمہیں اب بھی شک ہے کہ وہ شیکھر ہو سکتا ہے؟“
”میں معافی چاہتا ہوں۔ گویا شک پر کب جا رہا
ہے؟“ بات پلٹ دی۔

”بدر کو۔“ وہ سامنے دیکھنے لگی۔ ”میں اس رات
بھوت کی گھات لگانے قبرستان جانا چاہتی ہوں۔“
”میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔“

”اچھا یہ شیکھر۔۔۔ میرا مطلب ہے یہ جوگی کیرا
آوی ہے؟“

”جادو ٹوٹے کرتا ہے، ڈاؤن غیر بھی دیتا ہے۔“

”کیا تم مجھے اس سے ملوا سکتے ہو؟ ہم کم از کم اسے
چیک تو کر سکتے ہیں یا اس کا کھرا۔۔۔ اودہ بدر تم نے کبھی
اس بھوت کا کھرا پکڑنے کی کوشش نہیں کی؟“

”کی تھی جب منگل سنگھ قتل ہوا تھا، مگر تم تاشا بیوں
نے کھرے تارہ کر ڈالے تھے۔ ایسے ویسے تو ڈرتے ہیں
مگر لاش کا سن کر تجس میں سب اکٹھے ہو گئے تھے۔“

”کبھی اس بھوت کا کھرا نہیں پکڑا گیا؟“
”میں چند ایک بار کوشش کر کے دیکھ چکا ہوں، مگر
وہ شخص اپنے کھرے مٹا کر جاتا ہے، خاصا شاطر انسان
لگتا ہے وہ مجھے لیڈی شیکھر!“

”لیڈی فرینڈس!“ غیر ارادہ، ”تھج کی تو وہ بولتے
بولتے تھر سا گیا۔“

”تم شیکھر کا نام اپنے ساتھ نہیں لگانا چاہتیں؟“
”میں تو اب سفید رنگ بھی نہیں پہننا چاہتی، تم کیا
چاہتے ہو؟“

”ہر وہ چیز جس سے تم خوش ہو۔ ایک بات پوچھوں؟“

”ڈاؤزی کی وہ ڈھلتی شام ان کے آس پاس منڈلانے
لگی۔ پل بھر کو وقت بھر سا گیا، وہ سوالیہ نگاہوں سے

اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ جانے کیا کرنا چاہتا تھا اور پھر کچھ اور کہنے کی خواہش کی۔ وہ بس اتنا پوچھ سکا۔

”راجپوت میری اور تمہاری شناسائی پہ اعتراض تو نہیں کرتے؟“

”کرتے ہیں۔“

”اور تم کیا کرتی ہو؟“

”میں؟ میں ہمیشہ تمہارے بلائے پہ آجاتی ہوں۔“

وہ اس لمحے اتنی سادہ لگی تھی کہ وہ اپنی بے ساختہ مسکراہٹ نہ روک سکا۔

وہ کھڑی ہو گئی۔

”کہہ رہی؟“

”چلو چل کر اس جوگی کو دیکھتے ہیں۔“

”نئی صبح؟“

”کیا وہ در تک سوتا ہے؟“

”ارے نہیں۔“ بدر ہاتھ جھاڑتا کھڑا ہوا۔ ”اس کے پاس تو صبح تڑکے سے ہی لوگوں کا تانتا بندھ جاتا ہے۔“

”بے چارے کچے عقائد کے پسماندہ لوگ۔“

وہ دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

”اس کا ڈیرہ یہاں سے کتنا دور ہو گا؟“

”زیادہ نہیں، یہ گاؤں بہت برہانہاں ہے۔“

کنواں پیچھے رہ گیا تھا، وہ دونوں آگے پیچھے کھیتوں کے بیچ پگھلنے والے گزر رہے تھے۔ وقفے وقفے سے اس کی سرخ چوڑیاں کھٹک اٹھتی تھیں۔

”تمہیں جان کارلس کیسا آدمی لگتا ہے بدر؟“

”ڈی سی بہادر؟“ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ”ویسا ہی ہے جیسے کہنی صاحب لوگ ہوتے ہیں۔ متعصب،

ہندوستانیوں کو سچ سمجھنے والے، سخت گیر، مگر ایماندار، فرض شناس۔“

”تمہیں نہیں لگتا وہ شیکھو کے قتل کے کیس میں چانک سے دلچسپی لینے لگا ہے؟“

”آج ہوتی ہو وہ نہ لے؟“

”لے، ضرور لے، مگر لے ہی کیوں؟“

”تمہیں کیسے لگا کہ وہ اس کیس میں دلچسپی لے رہا

ہے؟“

”اس نے مجھے بلا کر یہ بتایا تھا کہ تمہارا اور شیکھو کا کیا تعلق تھا۔“ بدر چلتے چلتے ٹھٹھک کر پلٹا۔ ”اس نے ایسا کیوں کیا؟“

”شاید گویاں نے اسے کہا ہو۔ اس نے بتایا تو یہی تھا۔“

”تم قبرستان میں جانے کے لیے گویاں کے شکار پہ جانے کا انتظار کیوں کر رہی ہو؟“

”میں نہیں چاہتی کہ اسے پتہ چلے۔ وہ عموماً میری ناک میں رہتا ہے۔“

”تمہیں اس سے اتنا فرق کیوں پڑتا ہے؟“

”وہ باپ بیٹا جیسے گاؤں سے نکالنا چاہتے ہیں اور میں انہیں ایسا کوئی موقع نہیں دینا چاہتی۔ میں شیکھو کے قاتلوں کو انجام تک پہنچانے بغیر یہاں سے نہیں جانا چاہتی۔“

”کیا تم صرف اسی لیے ادھر ہو؟“ بدر کو جیسے دکھ ہوا تھا۔

”یہ صرف ایک وجہ ہے۔“ وہ مبہم سا مسکرائی۔

”اور دوسری وجہ کیا ہے۔ یہ رہا اس جوگی کا ٹھکانہ۔“

ادھوری بات اس کے لبوں پہ دم توڑ گئی کہ جھگیاں آگئی تھیں۔

وہ جوگی کے ایک چیلے کی جانب بڑھا۔

”بابا سے ملنا ہے۔“

چیلے نے ذرا کی ذرا نظر اٹھائی۔

”بابا ابھی مصروف ہے، عمل کا وقت ہے، منگل کو آنا۔“

”منگل تو آج ہے۔“

”اگلی منگل کو آنا۔“ وہ جھنجھلایا تھا۔

”مگر مہاراج، میں بہت ضروری کام ہے۔“

”کہنا، ابھی عمل کا ہے۔“ دفعتا چیلے کی نگاہ دور سے آتی بابا پہ پڑی۔ سرخ کھلتے گلے جیسا لباس اس میں جھلکتی گوری جلد۔

”کیا ہوا؟ ہم اندر جا سکتے ہیں؟“ وہ بیک وقت دونوں سے مخاطب ہوئی۔

”یہ تمہارے ساتھ ہے؟“ آن کی آن میں چیلے کے تاثرات تبدیل ہوئے۔ بدر کا بٹتہ جواب پکاروہ ”اچھا زرا دیر کو تھمر دیکھ کر فوراً اندر چلا۔“

”کیا کہہ رہا تھا؟“ ”مجھے دیکھ کر کہا کہ جوگی مصروف ہے، مگر تمہیں دیکھ کر اسے یاد آیا کہ اس کا استاد اسے کچا چاہتا تھا اگر اسے علم ہوتا کہ اس نے ایک خوب صورت لڑکی کو اندر کا راستہ نہیں دکھایا۔“

”چیلہ اسی بل باہر آیا۔“ ”مہاراج نے اپنی عمل میں قدرے توقف کیا ہے، آپ اندر جا سکتی ہیں۔“ ”ہم ساتھ ہیں۔“ بدر کھیلے لہجے میں کہہ کر مایا کے ساتھ اندر داخل ہوا۔

خیمہ خاصا بنا تھا۔ دیواروں پر عجیب و غریب سے حروف تہجی میں مختلف الفاظ لکھ رکھے تھے، ایک کونے میں ہندو رقصی بھی جس کے نیچے مدھم آگ جل رہی تھی۔ ہندو کے ڈھکن کی درزوں سے نکلتے دھواں سے پورے خیمے میں عجیب لعن زدہ بو پھیلی تھی۔

سامنے چوڑی مارے چھوٹی چھوٹی داڑھی والا شخص بیٹھا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھے تھے اور آنکھیں موندے، زیر لب کچھ بدبواہی کا تھا۔ مایا اور بدر اس کے سامنے دوڑاؤ ہو کر بیٹھ گئے۔

”بدر! اس نے بغور جوگی کو دیکھتے ہوئے انگریزی میں سرگوشی کی۔“ اس نے چنچہ پن رکھا ہے۔“

بدر نے دیکھا، شیکھو بابا نے واقعی گہرے سبز رنگ کا میلا کچیل سا جھولا سا پن رکھا تھا۔ اس کی گردن میں عجیب و غریب پتھروں کا ہار تھا۔

”بولو کیا مسئلہ ہے؟“ جوگی نے آنکھیں کھولیں، ایک گہری نگاہ مایا پر ڈالی۔

”ہمارے ہاں اولاد نہیں ہے۔“ بغیر تمہید کے وہ اتنی سادگی سے بولی کہ بدر حیران سا رہ گیا۔ ”کوئی عمل بتا دیجیے مہاراج! میری ساس مولوی سے تعویذ لے کر کرتی ہے، وہ اس کی دوسری شادی کروادے گی۔“ ”ہوں۔ لیا عمل ہے، مگر چھو کری کو کرنا ہو گا۔“

”کیا کرنا ہو گا مہاراج؟“ وہ ادب سے استفسار کر رہی تھی۔

”چھو کری کو ہر تیسرے روز ہمارے پاس لانا ہو گا۔ ساتھ میں عمل کی دوسری اشیاء بھی تمہیں خود لانی ہوں گی۔“

”کیسی چیزیں؟“

”جوگی کی نگاہیں اس کے صبیح و صبح کے گرد طواف کر رہی تھیں، سوال در سوال کر رہی تھی اور وہ تو پہلے جھٹکے سے ہی نہیں سنبھلا تھا، خاموش سا بیٹھا تھا۔“

”ہوں“ جوگی نے ہنکارا بھرا۔ یہ یعنی تھا کہ اس نے مایا کو نہیں پہچانا تھا، وہ اپنی کٹیا میں مہاراج بن کر رہنے والا تھا، غالباً، یا ہر زیادہ نہیں نکلتا تھا۔ ”کسی کنواری عورت کی ہڈی لانی ہوگی جسے مرے ہوئے بس سات روز ہوئے ہوں، مگر آٹھواں روز نہیں ہونا چاہیے، ورنہ ایسی ہڈی پہ ہونے والے عمل سے تمہارے گھر ہونے والا بچہ بڑا ہو کر تم دونوں میں سے کسی ایک کا خون کر دے گا۔“

”کیا؟“ وہ بے اختیار چلائی، پھر کھانسنے لگی۔ آنچل قدرے ڈھلکا، جوگی کی آنکھیں مزید کھل گئیں۔

ناگوار کی ایک لہر بدر کے رگ و پے میں سرایت کر گئی اس نے ایک دم مایا کا ہاتھ پکڑا، اور اسے کھینچتا ہوا باہر لے آیا۔

”رکو تو...“ وہ جھگیان دور چھوڑ آئے تو اس نے قدرے خفگی سے ہاتھ چھڑایا۔ ”مجھے بات تو کرنے دیتے، ایسی بھی کیا جلدی تھی؟“

”اہل فرنگ کے ہاں اخلاقیات اور عزت کے جو اصول ہوں، مگر میں ایک ہندوستانی مرد ہوں اور کسی ہندوستانی مرد کو یہ گوارا نہیں ہو تا کہ کوئی اس کی عورت کو...“

وہ جو برہمی سے کتا چلا جا رہا تھا، ایک دم رُک گیا۔ ”کس کی عورت؟“ مایا کا لہجہ ایک دم بے تاثر ہو گیا تھا۔

”عورت ہندوستانی مرد کی عزت ہوتی ہے اور یہی کی ہر عورت میری عزت ہے۔“

استفسار کر

لانا ہو گا۔
خود لانی

طواف کر
وہ تو پہلے
اتھا۔

اس نے
کر رہے
کنواری
سات
چاہیے
کے
ایک کا

آپیل

سراپیت
کے

نے
کرنے

کے جو
در کسی
عورت

کیا۔
زہو گیا

دریلی

وہ بات بدل گیا۔

”مگر میں بیلی کی عورت نہیں ہوں۔“ اس نے
خوبی کی طرف جانے والے رستے پہ قدم بڑھاتے
ہوئے بال سمیٹے تو سرخ چوڑیاں زور سے کھٹکیں، پھر
خاموشی چھا گئی۔ وہ اسے دور ہوتے دیکھتا رہا، پھر سر جھکا
کر اپنے ہاتھ کو دیکھا۔
ڈھوڑی کی ڈھلتی شام کا سرا اس کے ہاتھوں سے
پھلتا جا رہا تھا۔

نہ کوئی وقت طے پایا تھا اور نہ ہی جگہ مگر اس رات
وہ جیسے ہی کچے راستے پہ آئی جانے کس طرف سے
نکل کر وہ اس کے سامنے آگیا۔

وہ ایک دم بدک کر پیچھے ہٹی، لبوں سے چیخ نکلی ہی
تھی کہ اس نے اس کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا۔

”بدر ہوں۔“ چاندنی میں نمایا اس کا چہرہ دیکھا تو وہ
جو گہرا کر ہاتھ ہٹانے لگی تھی، ڈھیلی پڑ گئی۔ بدر نے
آہستگی سے ہاتھ ہٹا دیا۔ اسے اپنے ہاتھ سے اس کی
ہمک آنے لگی تھی۔

”تم میرا انتظار کر رہے تھے؟“ مایا کا لہجہ مشکوک پا
کر وہ ہنس دیا۔

”ہاں۔“
”مگر تمہیں کیسے پتہ تھا میں آؤں گی؟“

”مت شک کرو، میں نہیں ہوں وہ بھوت۔ آج
چونکہ بدھ کی رات ہے تو میرا اندازہ تھا کہ تم ضرور آؤ
گی۔“

”اور مجھے بھی علم تھا کہ تم ضرور آؤ گے۔“ اس نے
مسکرا کر اسے دیکھا۔ چاند کی مدھم روشنی میں اس کا
نصیب ڈھاتا سراپا نمایاں تھا۔ وہ اسے گلابی شب خوبالی
کے رنگی لباس میں کسی گلاب کی طرح دیکھتی لگی تھی۔
سنگھار سے بے نیاز چہرہ اور سمیٹ کر دامن کندھے
پر ڈالے بال جن میں پروئے موتی چاندنی میں بھی کبھی
ہمک اٹھتے تھے۔

وہ دونوں ساتھ ساتھ کچے راستے پہ چلنے لگے۔

”کیا تم نے کسی بھوت کو قبرستان جاتے دیکھا؟“
”ابھی تو رات ہوئی ہے دیوہی کی ابھی غلبا، ہمیں
انتظار کرنا پڑے گا۔ آسانی سے نکل آئیں خوبلی سے؟“

”بس کویال کی غیر موجودگی کی تسلی کر کے نکلی ہوں،
شکر ہے کسی نے دیکھا نہیں۔“

بدر نے گردن ترچھی کر کے اسے دیکھا۔ کبھی کبھی
وہ اسے کوئی معصوم سی پھوٹی سی بچی لگتی تھی، عمر وہ کیا
تھی، وہ اب تک نہ سمجھ پایا تھا۔ بس ایک سرسرا تھا،
ایک طلسم ہو شربا جو اس کے وجود سے پھوٹا بدھ کو اپنے
حصار میں مقید کیے ہوئے تھا۔ اسے لگتا تھا وہ چاہے
بھی تو صدیوں یہ ان دیکھی زنجیریں نہیں کھول سکے گا،
وہ ہمیشہ اس حرم میں مقید رہے گا۔

دوسرے ہندوستانیوں کی طرح فرنگی عورتیں اسے
بھی پھینکی، خشک، سرد مزاج اور سپاٹ لگتی تھیں۔ ان
کی اکثریت بے حد گوری، مغرور اور فریبی مائل روکھی
پھینکی سی ہوتی تھی اور بطور ہندوستانی مرد اسے ایسی
عورتیں ہرگز پسند نہ تھیں۔ اگر کوئی بھی ہندوستانی
زہرہ اور مایا کا مقابل کرتا تو اسے زہرہ زیادہ حسین لگتی کہ
اس کا حسن مشرقی تھا، وہ بال نہیں کھولتی تھی، سر کو
آپیل سے ڈھکے رکھتی تھی۔ وہ بلاشبہ بیلی کی سب سے
حسین لڑکی تھی، لیکن وہ اپنے دل کا کیا کرتا، جسے مایا
جیسا کوئی لگتا ہی نہ تھا۔ مایا درحقیقت اتنی حسین نہ
تھی، مگر اس نے اپنے وجود کو کچھ ایسے تراشا تھا کہ خود
سے پھوٹی مقناطیسی شعاعوں سے وہ کسی کو بھی بس
نگاہوں سے مقید کر لیتی تھی۔ بالکل ایسے جیسے۔۔۔
جیسے بدر نے سوچا اور اس کے ذہن میں بس ایک ہی
مثال آئی۔۔۔ جیسے کوئی سنگ تراش کسی عام سے پتھر کو
تراش کر ”ماہ ملکہ“ بنا ڈالے۔

”کیا سوچ رہے ہو؟“

وہ چونک کر حال میں واپس آیا پھر سر جھٹک کر مسکرا
دیا۔ ”سوچ رہا تھا تمہارے اوپر بیلی کا ایک Legend

صادق اترتا ہے۔“
”کون سا لیجنڈ؟“

”پھر کبھی بتاؤں گا۔ ابھی یہ پھانک کھولو۔“
 قبرستان آگیا تھا۔ لکڑی کا پھانک بند پڑا تھا۔ بند
 کندھے میں ٹوٹا ہوا تالہ جھول رہا تھا۔
 ”کیسا بھوت ہے جسے اندر جانے کے لیے تالہ
 توڑنے کی ضرورت ہے یہ تالا دھڑکائی کیوں؟“
 ”شاید نمبردار نے لگولیا تھا۔ اب تو وہ نسل ہی ختم
 ہو گئی جو اس قبرستان میں فاتحہ پڑھنے آتی تھی۔ یہ
 بہت قدیم قبرستان ہے مایا دیوی!“
 قبرستان ویران پڑا تھا اور قبریں چلنے کب سے
 ٹھنڈ رہن چکی تھیں۔ چھوٹی سی بچی چار دیواری
 کے ایک سرے سے لگا برگد کا بوڑھا درخت برسوں
 سے ویسے ہی جھکا کھڑا تھا۔
 عجب ہو کا عالم تھا۔ سناٹا، تاریکی اور ہیبت بھرا
 احساس جیسے ارد گرد کوئی ہو۔ کوئی ان ویسے سفید
 لباس میں لپٹی ہوئی۔
 ”آؤ دھڑکتے ہیں۔“ وہ دونوں برگد کے تنے تلے
 بیٹھ گئے ایسے کہ پھانک سے داخل ہونے والے کسی
 بھی شخص پہ ان کی فورا ”نظر پڑ جاتی مگر وہ ان کو نہ دیکھ
 سکے۔
 لمحے خاموشی سے سرکتے رہے۔ آدھے چاند کے
 اوپر بادل تیر رہے تھے۔ کبھی وہ ان کے پیچھے چھپ جاتا،
 کبھی نکل آتا۔
 ”بیلی کا آسمان کتنا خوب صورت ہے۔ جانتے ہو
 بدر! ایسا آسمان میں نے نہیں دیکھا۔“ وہ تنے
 سے سر نکالے اور دیکھ رہی تھی۔ بدر خاموشی سے
 مسلسل پھانک پر نظر رکھے ہوئے تھے۔
 ”اور ایسا چاند بھی مجھے کیسے نہیں دکھائی دیا بدر!“
 ”تمہیں لگتا ہے ہم آج اسے دیکھ سکیں گے؟“
 ”چاند کو؟“ وہ بے خیالی میں گویا ہوئی۔
 ”نہیں مایا! بھوت کو۔“
 ”اوہ۔“ اس نے لب کیٹے۔ ”سانو تھا کہ رات
 کو اوھر آتا ہے۔ کیا معلوم آج بھی آجائے۔“
 ”کیا معلوم نہ آئے۔“
 ”تمہا یوس کیوں ہو رہے ہو؟“

”کیا تم نہیں ہو کیوں؟“
 ”نہیں۔“ اس نے دھڑکے سے شانے اچکا دیے
 تو بدر نے غور سے اسے دیکھا۔
 ”تمہارا مستقبل کے بارے میں کیا خیال ہے؟“
 ”کم از کم ہاپوس نہیں ہوں۔“
 ”ہونا بھی نہیں چاہیے۔“ پھر قدرے توقف کیا۔
 ”شادی کرو گی؟“
 ”شاید۔“ اس نے پھر سے شانے اچکا دیے گردن
 ابھی تک اوپر اٹھی تھی۔
 ”بیلی میں کب تک روگی؟“
 ”شیکھر کے قاتلوں کی سزا تک۔“
 ”فرض کرو تمہیں وہ نہ ملیں، تمہیں وہ بھوت بھی
 نہ ملے، تمہیں کچھ بھی نہ ملے تب کیا کرو گی؟“
 ”تو زندگی پھر سے شروع کروں گی۔“
 ”یعنی شادی کرو گی؟“
 ”شاید۔“
 ”مایا۔“ وہ بھی اب تاروں کو دیکھ رہا تھا۔ ”تم مجھ
 سے شادی کرو گی؟“
 بغیر تمہید کے اس نے اتنے اچانک سے کہہ ڈالا تھا
 کہ وہ خود بھی حیران رہ گیا تھا۔
 ”مگر تم تو منسوب ہو زہرہ کے ساتھ۔“ ناراضی نہ
 ناگواری بس آرام سے پوچھا تو وہ مزید حیران ہوا۔
 ”میں۔۔۔ میں اس کی شادی کسی اچھے خاندان میں
 کروا دوں گا۔ اسے مجھ سے بہتر کوئی بھی مل جائے گا۔“
 ”تمہیں بھی مجھ سے بہتر کوئی بھی مل جائے گی۔“
 ”مجھے بہتر کی تمنا کہاں ہے مایا؟“ وہ جیسے تھک کر
 بولا۔ ”مجھے لگتا ہے میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں،
 مگر۔۔۔ مگر تم نہیں سمجھو گی۔ یہ محبت ہے ہی ایسی چیز
 بہت حقیقی مگر حقیقت سے دور لے جانے والی۔“
 وہ ایک دم کھڑی ہو گئی۔ بدر نے گردن اونچی کر کے
 اسے سوالیہ نظروں سے ٹکا۔
 ”تم ابھی خود یقین نہیں ہو کہ تمہارے
 محسوسات کی حقیقت کیا ہے، تمہیں صرف یہ لگتا ہے

نہیں مجھ۔۔۔
الفاظ اس کے لبوں میں رہ گئے۔ پھاٹک کے اس پار
ایک ہولہ سا نظر آیا تھا۔

”دھر کوئی ہے۔“ وہ پھرتی سے نیچے ہو گئی۔
”کون ہے یہ؟“ وہ دونوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے
کی کوشش کر رہے تھے۔

”بدر، کیا ہم قبرستان کے بھوت کا اصل چہرہ دیکھنے
آئے ہیں؟“

کوئی تھا جو قبرستان کی چھوٹی سی چار دیواری کے
ساتھ ساتھ چل رہا تھا جیسے اندر جھانکنے کی کوشش کر
رہا ہو۔ دور سے چہرہ واضح نہ تھا، مگر سفید کرتا صاف نظر
آ رہا تھا۔

مایا نے آنکھیں سکوڑ کر دیکھا اور پھر اس کا منہ
جیت سے کھل گیا۔

”گوپال۔“ وہ گویا ہی تھا۔ چار دیواری سے
جھانکنے کی کوشش میں دیوار کے ساتھ ساتھ چل رہا
تھا۔

مایا نے دھڑ دھڑاتی ہوئی باتھ مارا، ایک پتھر اس کے
پاتھ لگا۔ اس نے کھینچ کر وہ پتھر گویاں کو دے مارا۔

پتھر اس کے کندھے سے ٹکرایا، اور دوسرے ہی پل
گویاں ”بھوت، بھوت“ چلا تا بھاگ اٹھا۔

وہ دونوں ابھی تک بے یقینی سے گویاں کو بھاگتے
نارنگی میں گم ہوتے دیکھ رہے تھے۔ کچے راستے پہ غبار
کے بادل ہلکے سے اٹھتے تھے۔

”تو یہ تو کتنی بھوت گویاں تھا۔“ وہ تیز زدہ سی تھی۔
”نہیں۔“ بدر سوچی نگاہوں سے زمین پہ واپس

بٹتے گرد کو دیکھ رہا تھا۔ ”وہ گویاں نہیں ہو سکتا۔ اس
نے سفید کپڑے پہن رکھے تھے اور بھوت کو جتنے بھی

لوگوں نے دیکھا ہے، وہ کہتے ہیں کہ وہ ہمیشہ سیاہ لباس
میں ہوتا ہے۔ دوسری بات، جب تم نے گویاں کو

ہلکانے کے لیے پتھر مارا تو وہ بھوت، بھوت چلا تا بھاگا،
یعنی وہ سمجھا کہ اسے پتھر بھوت نے مارا ہے، اس کا

مطلب ہے وہ خود بھوت نہیں ہے۔“
”پھر وہ قبرستان کیوں آیا؟“

”ہم کیوں آئے ہیں؟“
”بھوت کو رنگے ہاتھوں پکڑنے۔“
”اور وہ ہمیں پکڑنے۔“

اسے جیسے جھٹکا لگا۔ ”مگر اسے کیسے پتہ چلا؟ وہ تو آج
شکار پہ جا رہا تھا۔“

”اس نے یقیناً“ وہ رقیہ پڑھا ہو گا اور چھپ کر
تہسارا پیچھا کیا ہو گا، چھپس واقعی راجپوتوں کی ملازموں پہ
بھروسہ ہے۔“

”اوہ خدایا! مایا پریشان سی ہوئی ”اگر وہ گاؤں میں
ہے تو مجھے واپس جانا چاہیے۔ پھر کی رات دوبارہ سے
گھات لگائیں گے، ابھی تو مجھے خود خاصا خوف آ رہا ہے۔“

اس نے ٹولی پھوٹی قبروں کو دیکھ کر جھرجھری مٹی اور
پھاٹک کی جانب بڑھ گئی۔

وہ چہرے پہ ڈھیروں ٹکان لیے اسے دور ہوتے دیکھا
رہا اصل بات تو مایا کے لبوں پہ ادھوری دم توڑ کر کچے
راستے کی دھول میں گم ہو گئی تھی۔

”گاؤں میں عجیب سی باتیں پھیل رہی ہیں۔“
صبح ناشتے کی میز پہ پہلی غیر رسمی بات تھی جو ٹھاکر
رگھوناتھ نے اس سے کہی تھی۔ گویاں آج ناشتے پہ

نہیں تھا، ٹھاکر رگھوناتھ نے اسے بتایا کہ وہ پچھلی شام
سے شکار پہ گیا ہوا ہے اور اس نے فوراً ”یقین کر لیا
تھا۔“

”کیسی باتیں؟“ وہ آرام سے چھوٹے چھوٹے لقمے
لیتی رہی۔

”جانے کس مردود نے پھیلائی ہیں، میں تو سوچ
سوچ کر ڈر رہا ہوں کہ اگر یہ باتیں پھیلتی رہیں تو بھگوان
جانے کیا نتیجہ نکلے گا۔“

”ارے کیا بات ہو گئی ٹھاکر صاحب؟ کیوں پریشان
ہیں؟“ ہمدردی سے کہتے مایا نے ہاتھ روک لیا۔

”ایک تو ایف آئی آر والی بات، بھلے ہم شریکوں کو
وضاحت دیتے پھر جس کہ ہماری بنیا کو غلط فہمی ہو گئی تھی
مگر کیا کہیے ان لوگوں کی وہ کہتے ہیں کہ۔۔۔“ چپکچپ کر

انہوں نے ان الفاظ کا چناؤ کیا جو مایا کو گراں نہ گزریں۔
 کہ میم صاحب کو ٹھاکر قید کرنا چاہتے ہیں، اس کی
 جائیداد، تصنیف چاہتے ہیں۔“

چنگیز پکڑے اندر داخل ہوتی روپا بے اختیار سینے پہ
 ہاتھ رکھتی خوف زدہ سی پیچھے ہوئی۔

”ہیچ ہیچ۔۔۔“ مایا نے رومال سے ہاتھ صاف کر
 کے بہت افسوس سے انہیں دیکھا۔ ”یہ تو بہت برا ہوا۔
 ایسی بات کس نے پھیلانی ہوگی؟“

روپے کی اوٹ میں کھڑی روپوتی سر سے پیر تک
 لرز گئی۔

”معلوم نہیں، آپ کو بے کچھ اندازہ؟“
 ”میرے لیے تو یہ ایک خبر ہے ٹھاکر صاحب! اندازہ
 کا بے کو ہوگا۔“

”خیر، اگر کوئی آپ سے اس متعلق استفسار کرے
 تو اسے واضح ضرور کر دیجیے گا کہ یہ محض بے بنیاد باتیں
 ہیں، ہماری سادہ کو تباہ کرنے کی کوشش ہے۔“ وہ
 چہرے پہ پریشانی و تفکر کی گہری لکیریں لیے اٹھ کھڑے
 ہوئے۔

ان کے کمرے سے نکلتے ہی روپوتی دوڑتی ہوئی
 آئی اور اس کے پاؤں پکڑ لیے۔

”میم صاحب! مجھے بچاؤ میرے منہ سے غلطی سے
 نکل گیا تھا، رتن بوا یا زہرہ بی بی نے آگے کہہ دیا ہوگا، مگر
 بھگوان کے لیے میم صاحب بڑے ٹھاکر کو نہ بتائے گا کہ
 یہ بات مجھ سے آگے ہوئی ہے۔“ وہ روپیے کو تھمی۔

”بھئی مان گئے تمہارے ہندوستان کو۔“ وہ رومال
 رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی، پاؤں آہستہ سے پیچھے کر لیے۔
 ”جہاں پرچہ ہوگا، نہ ہی ریڈیو، وہاں بھی شام ہونے
 سے پہلے ہر بات پھیل چکی ہوئی ہے۔ جو سنا تھا، آج
 دیکھ ہی لیا۔“

اور روپا شیشدری اسے باہر جاتے دیکھتی رہی۔
 وہ جو بھی تھی کہ اس نے میم صاحب کو استعمال کر
 کے چھوٹے ٹھاکر سے ڈھیروں روپے پورے ہیں، آج
 اس پر یہ انکشاف ہوا تھا کہ استعمال تو وہ خود ہوتی تھی۔

لکڑی کی میز پہ چاچی کپڑا بچھا کر اس کا کھانا رکھتے
 گئی۔ وہ آستینیں کمانیوں تک موڑتے ہوئے چارپائی
 پہ آ بیٹھا۔

راہداری سے آئی زہرہ ستون کے قریب ٹھک کر
 رکی۔

وہ صبح کا نکلا اب واپس حویلی آیا تھا۔ زہرہ نے اسے
 دو روز بعد دیکھا تھا۔ وہ فجر کے ساتھ ہی چلا جاتا تھا، پھر
 جانے رات کو کس وقت آتا، اسے تو پتہ ہی نہ چلے۔
 اور اب کتنی اچانک سے وہ اسے دپہر میں کھڑی دیکھ
 رہی تھی۔

وہ جھٹ ستون کی اوٹ میں ہو گئی۔ ہاتھ بے اختیار
 شانے پہ ڈھلکے آچل کی جانب بڑھا اور سر ڈھانپ
 لیا۔ اسے لگا ایک دم سے ہی آنگن میں کمکشاں کے
 سارے ستارے اتر آئے ہوں۔

”یہ ڈاک آئی تھی شہر سے، فاضل دے کر گیا ہے،“
 چاچی نے پیلا لفافہ اس کے سامنے رکھتے ہوئے
 مشاچی کا نام لیا۔

”اچھا۔“ وہ کھانے سے ہاتھ روک کر لفافہ الٹ
 پلٹ کرنے لگا۔

”پہلے روٹی تو کھالے پتر۔“ چاچی ساتھ ہی چارپائی
 پہ بیٹھ گئی۔

”کھانا ہوں۔“ وہ مصروف سالفافہ چاک کر کے
 اندر سے عدالتی کاغذ نکالنے لگا۔

”کیا لکھا ہے؟“
 ”کچھ خاص نہیں، سو موہار کو پیشی ہے، شہر جانا ہو
 گا۔“ وہ روٹی توڑنے لگا۔

”کہ ہر مصروف رہتا ہے آج کل، ماں کے لیے
 گھڑی دو گھڑی بھی نہیں ہے۔“

”بس کچھ کام تھے۔ خیر، کھڑی سب ٹھیک ہے۔“
 ”کر م ہے مولا کا۔“

”بلیقیس کی بیٹی کی شادی ہو گئی۔“ اس نے اپنی دوائی
 کھلائی کا نام لیا تو چاچی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”ہاں، کل ہی رخصت ہوئی ہے۔“
 ”میے دے دیے تھے؟“

”ہاں۔“

”اور زہرہ ٹھیک ہے؟ نظر نہیں آ رہی؟“

اور ستون کی اوٹ میں چھپی زہرہ کو لگا، اس کی ساری دعائیں مقبول ہو چکی ہوں۔ من نور نور سے دھڑکنے لگا۔ یہ فکر بھری بے فکری اور اپنائیت بھری لا تعلقی۔۔۔ یہی سب تو اسے بدر میں اچھا لگتا تھا اپنے لیے، یا پھر اس کی آنکھیں اسے وہی دکھائی تھیں جو دل و دماغ دیکھنا چاہتے تھے۔

”اچھی ہے۔“

اور وہ جو اندر آنے لگی تھی بدر کی اگلی بات پہ رُک گئی۔

”زہرہ کا کیا سوچا ہے؟“

”سوچنا کیا ہے، سارا زلیور کپڑا تیار ہے۔ اس جاڑے شادی کروں گی۔“

بدر کا منہ کو جاتا والا لیے ہاتھ رُک گیا۔ ”کس کے ساتھ؟“

”بدر!“ چاچی کو دھکا لگا تھا۔ ”تیری اور زہرہ کی بات بچپن سے طے ہے۔“

”اور جیسے بچپن گزر گیا ویسے ہی وہ بات بھی گزر گئی اماں!“

”خبردار جو تو نے ایسی بات منہ سے نکالی۔ وہ جان دیتی ہے تجھ پر، اس کا ذہن تیرے حوالے سے بن چکا ہے۔“

”تو میں نے نہیں بنایا ذہن۔ تو نے اور اماں نے مجھ سے پوچھے بغیر فیصلہ کیا تھا، میں نے تو کبھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ پھر میرا کیا قصور؟“

”جیسے وہ کسی تصویر کی سزا لگتی ہے؟“

”میں یہ کب کہہ رہا ہوں۔“

”تو کیا کہنا چاہ رہا ہے؟“

”اماں! اسے مجھ سے بہتر پرل جائے گا۔“

”مگر وہ تیرے نام سے منسوب ہے، تو کیوں اس سے ناخوش ہے؟ ہے کوئی پورے گاؤں میں اس کی سکھ، سلیقہ مند اور حسین لڑکی؟“

”وہ تیرے ساتھ ہی خوش رہے گی۔“

”پھر میں خوش نہیں رہوں گا؟ اگر تو یہ چاہتی ہے تو کروے میری اس سے شادی۔“ وہ تیزی سے اٹھ اڑا باہر نکل گیا۔

چاچی سینے پہ ہاتھ رکھے پریشان سی اسے جاتے دیکھتی رہی اور وہ جو ستون کی آڑ میں کھڑی تھی، نہ حال کی بچے نہ کھتی چلی گئی۔

”تو پھر میں خوش نہیں رہوں گا۔“

”میں خوش نہیں۔“

اس فقیرے کی تکرار اس کے کانوں پہ ہتھوڑے پر ساری تھی۔ بہت سی آوازیں شامل ہو گئی تھیں۔

بچپن کی، لڑکھن کی، شعور کی چوکھٹ کی، حسین یادوں کی، آوازیں اور پھر آوازوں کو اس جھوم میں ایک دم مغمور سی آواز ابھری۔

”تمہاری چاچی ٹھیک کہتی ہے زہرہ! تم بھی کس کا غم کرتی ہو۔“

اور وہ چونک سی گئی۔

”میم صاب!“ نفرت، رقابت اور حسد کی ایک بھرپور لہر اس کے وجود میں دوڑ گئی۔ ”میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔“ وہ مٹھیاں پیچ کر اٹھی اور بھاگتی ہوئی حویلی کے پچھواڑے کھلنے والے دروازے کی طرف بڑھی۔

بڑے ٹھاکر کو ہرگز علم نہ تھا کہ آج جب قسمت کی وہ دیوی ان کے در پہ دستک دے گی تو دروازہ وہ خود کھولیں گے۔

انہوں نے اتفاق سے اسی وقت بھانک کھولا ہی تھا کہ دستک دینے کو اٹھا زہرہ کا ہاتھ نیچے گر گیا۔

”کون؟“ وہ حیران ہوئے۔

سر کو سیاہ آئینے سے ڈھکے، سنہری دھاتی رنگت، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، پیشانی پہ پڑے نل، اور انگارے پھوٹی آنکھیں یہ سنہری میلا کون بھی بھلا؟ انہوں نے پہلے تو اسے گاؤں میں نہیں دیکھا تھا۔

”میم صاب کہاں ہے؟“ وہ غرائی سے غرائی میں اس کے ہوش و حواس کا

”میم صاب سے ملنا ہے؟ رتن

پہلے کھانسی سے بوا کو آواز دینے

صاب کے کمرے میں لے جائیو۔“

”میں اس ڈائن کا کمرہ خود ڈھونڈ

پڑی سے برآمدے کی سیڑھیاں

میں گئی۔“

”یہ کون ہے؟“

رتن بوا آگے بڑھی ”یہ ملکوں

نازان کی منگیتیر ہے۔“

ٹھاکر گھوٹا ہاتھ کو جیسے کرٹ کرٹ

بدر کی منگیتیر اور ان کی حویلی

ڈائن کھتی جارحانہ انداز میں دا

ہے بھی؟ مگر جب ذہن کے

ملاقاتوں کے چرچے لہرائے تو

لڑکی کا فطری رد عمل جان کر

سمجھ میں آنے لگی۔

ہندوستان کے ہر گاؤں کی

بھی کسی کا رہو نہیں رہتا تھا۔

علم ہر کسی کو یا کسی نہ کسی کو تو

وہ تیزی سے اندر لپکے۔

سیڑھیوں کے اوپر بلایا کے

زہرہ کی غصے میں بلند ہوئی تو

”تم کیا سمجھتی ہو؟ تمہیں

ساری کڑیاں مل گئی تھیں

زندگی نے انہیں بدر عازان۔

کا ایک سنہری موقع دیا تھا

تھے؟

”رام ہاتھ۔۔۔ جوت

دینے لگے۔ ایک نوکھا

تھا۔ اگر سب چیز

تھے تو۔

”جی مہاراج! آرام نا تھہ دوڑتا ہوا آیا۔
”جا کر تھانے دار سے بولو فوراً“ حوٹکی آئے پڑے
ٹھا کرنے بلوایا ہے، ان کی جان سے جیتی اور اہم کام
ہے۔ ان کو بولو دیر نہیں کرنی اور تازہ دم کھوڑا لے
جاؤ۔ جلدی۔“
ہدایات دے کر وہ تیزی سے اندر کی جانب بڑھ
گئے۔

(یسری اور آخری قسط آئندہ ماہ)

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

کتاب کا نام	مصنفہ	قیمت
زندگی اک روشنی	رخسانہ نگار رحمان	500/-
خوشبو کا کوئی گھر نہیں	رخسانہ نگار رحمان	200/-
شہر دل کے دروازے	شازیہ چودھری	400/-
تیرے نام کی شہرت	شازیہ چودھری	200/-
دل ایک شہر جنوں	آسیہ مرزا	450/-
آئینوں کا شہر	فاخرہ افکار	1/-
پھلاں دے رنگ کالے	فاخرہ افکار	200/-
عین سے گورت	غزالہ عزیز	200/-
دل آسے ڈھونڈ لایا	آسیہ رزاقی	350/-
بکھرنا چاہیں خواب	آسیہ رزاقی	200/-
خواب در پیچے	سعدیہ ال کاشف	-
اماؤں کا چاند	شری سعید	100/-
رنگ خوشبو ہوا بال	افشاں آفریدی	450/-

ناول نکالنے کے لیے کتاب ڈاک خرچہ 30/- روپے
نگوانے کا پتہ:
کتبہ عمران ڈائجسٹ 37 اردو بازار کراچی۔
فون نمبر: 2216361

”میم صاب کہاں ہے؟“ وہ غرائی۔ شاید جنون اور
باراگلی میں اس کے ہوش و حواس کام کرنا چھوڑ چکے
تھے۔
”میم صاب سے ملتا ہے؟ رتن بوا!“ وہ حیرت
پھانے شائستگی سے بوا کو آواز دینے لگا۔ ”ان کو میم
صاب کے کمرے میں لے جایو۔“
”میں اس ڈائن کا کمرہ خود ڈھونڈ سکتی ہوں۔“ وہ
تیزی سے برآمدے کی سیڑھیاں پھلا نکلتی اندر بھاگتی
ہوئی نکلی۔
”یہ کون ہے؟“
”رتن بوا آگے بڑھی۔“ یہ ملکوں کی دھبی ہے ملک بدر
ناز ان کی منگیتیر ہے۔“
ٹھا کر رکھنا تھ کو جیسے کرنٹ لگا تھا۔

بدر کی منگیتیر اور ان کی حوٹلی میں میم صاحب کو
ڈائن کھتی جارحانہ انداز میں داخل ہوئی ہے؟ کیا مٹھی
ہے بھی؟ مگر جب ذہنی کے پردوں پہ لایا اور بدر کی
لانا کاؤں کے چرچے لہرائے تو بطور اس کی منگیتیر، اس
لڑکی کا فطری رد عمل جان کر جیسے ساری کہانی ان کی
کچھ میں آنے لگی۔

ہندوستان کے ہر گاؤں کی طرح ان کے گاؤں میں
بھی کسی کا پردہ نہیں رہتا تھا۔ کون کیا کرتا ہے؟ اس کا
علم ہر کسی کو تھا کسی نہ کسی کو تو ضرور ہوتا تھا۔
وہ تیزی سے اندر لپکے۔

پیڑھیوں کے اوپر پایا کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔
زہرہ کی غصے میں بلند ہوئی آواز سنائی دے رہی تھی۔
”تم کیا سمجھتی ہو؟ تمہیں کو مجھ سے چھین لوگی؟“
ساری کڑیاں مل گئی تھیں۔ وہ فوراً ”باہر کو دوڑے
زندگی نے انہیں بدر عازان سے سارے بدلے چکانے
کا ایک شہری موقع دیا تھا، وہ اسے ضائع کیسے کر سکتے
تھے؟

”رام نا تھہ۔۔۔ جسونت۔“ وہ نوکروں کو آوازیں
دینے لگے۔ ایک انوکھا خیال ان کے ذہن میں بن رہا
تھا۔ اگر سب چیزیں ویسی ہو جائیں جیسے وہ سوچ رہے
تھے تو۔۔۔

س کا اگر تو یہ چاہتی ہے تو
”وہ تیزی سے اٹھا اور

پریشان سی اسے جاتے
میں کھڑی تھی، نڈھال
”گ۔“

کاتوں پہ ہتھوڑے
شامل ہو گئی تھیں۔
ش کی، حسین یادوں
ہجوم میں ایک دم

زہرہ اتم بھی کس کا

اور حید کی ایک
”میں چھین زندہ
را بھی اور بھاگتی
لے دروازے کی

جب قسمت کی
دروازہ وہ خود

نک کھولا ہی تھا
کیا۔

ن رنگت، بڑی
اور انگارے
پھلا؟ انہوں

رونی بخش دی ہے بیڈ کہیے کیا ہیں گی؟
 ”ہاں؟“ وہ ویران نگاہوں سے بڑے ٹھاکر کو دیکھتی
 رہی۔ اس کے حواس سن ہو چکے تھے۔ صبح بھلا حتی
 کہ شانوں پہ ڈھلکے آچل تک کا خیال نہ رہا تھا۔
 ”روپا دیوی۔“ بڑے ٹھاکر نے آواز دی تو روپا فوراً
 بغلی دروازے سے نکل کر حاضر ہوئی۔
 ”جی مہاراج!“

”ہماری بیٹا کے لیے شروت لے آئے۔“
 روپا نے ایک متاسف نگاہ زہرہ کے خود سے بے
 گانہ وجود پر ڈالی۔ (کدھر پھنس گئی ہے یہ؟ جی چاہتا
 ہے بھنوڑ کر جگدول، ٹکسہ) اور ہاتھ باندھے پلٹ
 گئی۔

”جھوٹے ملک کو علم ہے کہ آپ ادھر ہیں بیٹا؟“
 اس نے آہستہ سے نفی میں گردن ہلائی۔ بدر کی
 بے رخی اور خود پر ڈھایا جانے والا یہ ظلم اسے جیسے
 بے خوف اور بے حس کر چکا تھا۔ سارے احساسات
 ہی مر گئے تھے۔

”بتائیے گا بھی نہیں اسے وہ ہمیں پسند نہیں
 کرتا۔“ وہ قدرے رازداری سے گویا ہوئے ”اور چننا
 مت کیجئے گا ہم بھی نہیں بتائیں گے۔“
 اس نے بے توجہی سے اثبات میں گردن ہلا دی وہ تو
 شاید ٹھیک سے سن بھی نہیں رہی تھی کہ وہ کیا کہہ
 رہے تھے۔ ذہن میں وہی آواز گونج رہی تھی۔
 ”تو پھر میں خوش نہیں رہوں گا۔“

”بدر اچھا آدمی ہے اس نے ہمیں بچا لیا، ورنہ میم
 صاحب نے تو ہم پر کیس کر دیا تھا کہ ہم نے شیکھر کو
 مارا ہے۔ اچی ہم کا بے کو کریں گے ایسا شیطانی کام؟ مگر
 یہ تو بدر کا برا پن تھا کہ اس نے میم صاحب پر زور دے کر
 معاملہ سنبھال لیا۔ میم صاحب مت مانتی ہے بدر کی۔“
 زہرہ نے اب کی بار سر بھی نہ ہلایا وہ دیوار کو تنکے
 کیس دور گم تھی۔

”تم بھی کس کا غم کرتی ہو زہرہ؟“ مایا لوگوں کو اپنے
 ساتھ چلنے تو دیتی ہے مگر ان کا ہاتھ نہیں پکڑتی۔“

روپا نے چاندی کی طشتی اس کے سامنے کی ہنس
 میں شروت کیوڑہ سے بھرا جام تھا۔ زہرہ نے ٹھیک
 انداز میں جام اٹھالیا، مگر منہ سے نہیں لگایا۔
 ”بدر بھی مایا دیوی کی بہت مانتا ہے، حالانکہ یہ حق تو
 آپ کا تھا بیارانی، بڑا مت ماننے کا مگر بدر تو چلو مروت
 اس ڈائن کی باتوں میں آگیا، مگر آپ جیسی اچھی بیٹی کا
 اس عورت سے دوستانہ؟“

”نہیں۔“ وہ بے اختیار بولی۔ ”دوست نہیں
 ہرگز نہیں ہے۔“ اور سختی سے نفی میں سر کو جھپٹ
 دی۔ ”ماننے کا منتقش ٹھنڈا جام اسی طرح دونوں باتوں
 میں جکڑا تھا“ میں تو میم صاحب سے صرف یہ کہنے آئی
 تھی کہ وہ۔“

”کہنے؟“ ٹھاکر رگھو ناتھ نے حق کی نے منہ سے
 نکالی اور حیرت سے اسے دیکھا۔ ”جی وہ عورت تو کہنے
 سننے کی حد سے نکل چکی ہے۔ ہمارا تو جینا حرام کر رکھا
 ہے۔ حویلی پہ قبضہ، ملازموں پہ قبضہ، مال مویشی پہ
 قبضہ، ارے یہ فرنگی کہاں جائیں، زمین، جائیداد کے
 معاملات؟ ہم سے بستر انہیں کون سنبھال سکتا ہے؟ مگر
 نہیں جی یہ عورت کہاں باز آنے والی ہے؟ مگر آپ
 کے ساتھ کیا کیا اس نے؟“

”بدر نے مجھ سے شادی سے انکار کر دیا ہے۔“ بدر
 اور چاچی کے آپس کا راز کب اس مردہ سی ہوئی لڑکی
 کے لبوں سے پھسلا، اسے خبر بھی نہ ہوئی۔ گویا اس
 کے ساتھ رویہ برسوں پرانی خاندانی دشمنی اسے سب
 بھول گیا۔ شاید یہ بھی احساس نہ تھا کہ اس وقت وہ
 ٹھاکر رگھو ناتھ کے سامنے بیٹھی ہے۔ بس یاد رہا تو
 صرف یہ کہ بدر نے اسے جس عورت کے لیے مسترد
 کیا ہے اس کا یہ بھی دشمن ہے، سو اسے اس وقت
 ٹھاکر رگھو ناتھ اپنے سب سے بڑے ہمدرد لگے تھے۔

”اور اس انکار کی وجہ یہ ہی عورت ہے؟“ ٹھاکر
 رگھو ناتھ نے بے پناہ حیرت سے اسے دیکھا۔ ”آپ
 جیسی سندری بیٹا کو وہ اس پھٹی گوری میم کے لیے
 چھوڑ سکتا ہے؟ ہائے بھگوان، یہ کیا ظلم کر دیا اس نے؟“

اس کے سامنے کی جس
تھا۔ زہرہ نے میکائی
نہیں لگایا۔
تارے حالانکہ یہ حق تو
تھا مگر بدر تو چلو مرد ہے
آپ جیسی اچھی بیٹی کا
بہ دوست نہیں
لفی میں سر کو جنبش
طرح دونوں ہاتھوں
سے صرف یہ کہنے آئی
حق کی نے منہ سے
اجی وہ عورت تو کہنے
را تو جتنا حرام کر رکھا
بعض مال موٹی پہ
زمین جائیداد کے
نبال سکتا ہے مگر
والی ہے؟ مگر آپ
ار کر دیا ہے۔ بدر
مردہ سی ہوئی لڑکی
ہوئی۔ گویاں کا اس
دشمنی اسے سب
تا کہ اس وقت وہ
ہے۔ بس یاد رہا تو
ت کے لیے مسترد
واسے اس وقت
مرد رو لگے تھے۔
ت ہے؟" ٹھاکر
سے دیکھا۔ "آپ
ی میم کے لیے
م کر دیا اس نے؟

نیا اسے نظر آتا بند ہو گیا ہے کیا اس کی عقل ساتھ
چھوڑ گئی ہے؟ ارے وہ آپ یہ یہ غضب کیسے دھا سکتا
ہے؟
زہرہ کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔
"وہ اس سے شادی کر لے گا۔"
"اور آپ کو لگتا ہے ہم اپنی بیٹی کے ساتھ یہ ظلم
ہونے دیں گے؟ ہمارے ہوتے ہوئے میم صاحب
آپ کے ساتھ ایسا کر سکتی ہے؟"
"آپ۔ آپ اسے روک سکتے ہیں؟ آپ کچھ
کر سکتے ہیں؟" اس کی دیوانی محبت بلبلانے لگی۔
"کیوں نہیں؟ ہم اپنی بیٹی کے لیے سب کچھ کر س
گے۔" پھر حقہ گڑ گڑایا اور کچھ سوچ کر بولے۔ "بدر کو
اس کے سحر سے نکالنے کا واحد طریقہ یہ ہی ہے کہ میم
صاحب واپس ولایت چلی جائے۔"
"کیسے؟ کیسے جائے گی وہ؟"
"اس پہ کوئی زور دے، اسے کوئی زبردستی واپس
بھیج دے تب ہی وہ دفعتاً ہوگی ورنہ تو کوئی امکان نظر
نہیں آتا۔"
"کون کون زور دے سکتا ہے اس پہ؟" وہ بے
مبری سے بولی۔
"وہی جو بیلی کا بے تاج بادشاہ ہے۔"
وہ زیر لب مسکرائے۔ اسی رخ پہ حالات کو لے
جانے کے لیے تو انہوں نے یہ بساط بچھائی تھی۔ ابھی
چند روز قبل ہی تو گویاں نے انہیں بتایا تھا۔
"پتا جی! آج تو غضب ہی ہو گیا۔ بھگوان نے بچالیا،
ورنہ وہ ملک بدر کی منگیتر ایسی آفت شے ہے، میں
چوہدری بونے کے کھیت سے گزر رہا تھا، روی ساتھ
تھا۔ (گویاں کا دوست) کہ تانگے پہ وہ اپنی خادمہ کے
ساتھ جاری تھی، وہیں بیچ راہ کے تانگے کا پہرہ ٹوٹ
گیا، ہم مدد کے لیے گئے تو اس نے تو مانو جو اتار لیا۔
ایسی اتھری کڑی ہے روی اور میں جھٹ پچھے ہٹ
گئے۔ وہ تو شکر کیجو کہ واروغہ جی ادھر سے گزر رہے
تھے، ہم نے انہیں آگے کر دیا، پھر روی مدد کرتے رہے،

مگر ایک بات ہے پتا جی، وہ لڑکی بہت سوہنی ہے تبھی
تو یہ پھر سنا اور اسے دیکھ کر مبسوت سا کر ڈھا تھا، بعد میں
پوچھا بھی کہ یہ تھی کون، میں نے تو کہہ دیا، میں کیا
جانوں مسلمانوں کی لڑکی لگتی ہے۔ وہ چپ سی کر گیا مگر
مسور بھی تھا۔ لیکن سارا سرور نکل جائے گا جب علم
ہو گا کہ وہ ملک بدر غازیان کی منگیتر ہے، لگھ لگھ پتا جی
اس لڑکی کے لیے کوئی قتل کر بھی سکتا ہے۔ اور وہ بھی
سکتا ہے۔ یہ ملک بدر کو خون خرابے میں ضرور
پھنساے گی۔"
اور وہ بات ان کے دل کو ایسے لگی کہ وہ کوئی سبب
بننے کی دعا کرتے رہے، اور آج ان کی ساری دعائیں
مقبول ہو چکی تھیں۔ بس اگر سب کچھ ویسا ہی ہو جائے
جیسے وہ سوچ رہے تھے تو۔
"کون ہے بیلی کا بے تاج بادشاہ؟"
"وہی بیٹا رانی جو ہمارے ہند کے ہر گاؤں کا بادشاہ
ہوتا ہے۔ تھانے وار بادشاہ۔" اور اسی بل خادم نے
اطلاع دی۔
"داروغہ جی تشریف لاتے ہیں مہاراج۔"
"اند رلے آؤ۔" وہ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔
خادم کے پیچھے انیسٹرٹار شاہ داخل ہوا۔ ہاتھ میں
چھتری تھی اور وردی میں ملبوس تھا۔
"آداب بڑے ٹھاکر۔"
بڑے ٹھاکر نے ہاتھ جوڑ کر جواب دیا۔ "بیٹھے
مہاراج۔"
نادر شاہ نے صوفے پہ بیٹھے ہوئے ارد گرد جائزہ لیتی
نگاہ دوڑائی اور ایک دم ٹھنکا۔
سامنے صوفے پہ وہ گم صم صی لڑکی بیٹھی تھی جس
کی سیاہ چادر شانوں پہ ڈھلکی تھی اور ڈھلی چولی میں
سے بال نکل کر چہرے کے گرد بکھرے تھے۔ بلی عمر کی
معصومیت چہرے پہ بکھری تھی۔ مام کنڈی سی سوکار
آنکھیں دیوار پہ مرکوز کیے وہ کہیں دور مگر تھی۔
نادر شاہ کو بے اختیار وہ سہلی شام یاد آئی جب اس
نے یہ چہرہ پسلی دفعہ دیکھا تھا۔ ایک منظر اس کی نگاہوں

کے سامنے لہرایا۔

تالنگے کے ایک طرف کھڑی جھنجھلائی لڑکی۔ سیاہ چادر کے ہالے میں مقید سنہری دھلتا چہرہ اور چادر میں سے جھلکتے بڑے بڑے چاندی کے جھمکے۔ بار بار ماتھے سے جھولتی لٹ کوکان کے پیچھے اڑتی۔ مدد کے لیے شکر گزار ہوتی، جھلت میں تالنگے یہ دوبارہ چڑھتی لڑکی، اسے ایک ایک پل یاد تھا۔ وہ اسے بھولانی کب تھا۔ بڑے ٹھاکر نے اس کا ٹھکانا اور مہسوت ہونا بہت غور سے دیکھا تھا۔ وہ زیر لب مسکرا دیے، تیریا لکل نشانے لگا تھا۔

”مہاراج۔“ ان کے پکارنے پر وہ سنبھل گیا۔

”جی ٹھاکر صاحب! ان سے ملوانا تھا آپ نے؟“

نادر شاہ کا معاملہ بدر سے مختلف تھا۔ وہ بیلی کا تھانے دار بادشاہ تھا۔ اور اس بادشاہت کو قائم و دائم رکھنے کے لیے جہاں اس کو سب سے اپنا رعب و دبدبہ رکھنا ہوتا تھا۔ وہاں درپردہ دوستیاں اور تعلقات بھی قائم رکھنے تھے۔ ٹھاکروں سے اس کی اتنی ہی اچھی دوستی تھی جتنی بدر غازان سے تھی۔ اسے علم تھا کہ ٹھاکر اس کی وکیتی کی وارداتوں سے آگاہ تھے۔ سو وہ بھی ان کے کئی دھندوں سے آنکھیں بند کر لیتا تھا۔ غیر قانونی شراب کے بنانے میں ٹھاکروں کا پورا خاندان ملوث تھا۔ مگر کوئی انہیں گرفتار نہ کرتا تھا۔

نادر شاہ سے علاقے کے لوگوں کو شکایت ہرگز نہ تھی۔ وہ تفتیش اور سراغ رسانی کے امور کا ماہر سمجھا جاتا تھا۔ نقب لگے راہنہ کی واردات ہو یا دن دباڑے دہرے قتل کا واقعہ ہو، وہ پوری جانفشانی سے تفتیش کر کے مجرموں کو پکڑ لیا کرتا تھا۔ ایک طرف اس نے لوگوں کو ان کے کام کر کے رام کر رکھا تھا، تو دوسری طرف ٹھاکروں اور بدر غازان کو ان کی کمزوریاں ڈھونڈ کر۔

بدر غازان جیسا شخص اسے اپنی وکیتوں کا پردہ رکھنے کے لیے چاہیے تھا۔ ایسا شخص جسے وہ ایک باغی ہیرو کے طور پر پیش کر سکے، جو بس یہ جانتا ہو کہ یہ سب کچھ کسی خاص مقصد کے لیے کیا جا رہا ہے، جسے

انگریزی سامراج سے بغاوت کا جھانسنہ دے کر اسے تین راہنہ بنا کر وہ ہتھیار یا ہوا ساوا مل میں شہر کر لے، اتنی صفائی سے کہ کسی کو علم نہ ہو۔ گاؤں میں نادر شاہ اور بدر غازان بہت مضبوط حلیف تصور کیے جاتے تھے، اتنے بہترین دوست جن کے بکے اتحاد کے باعث ان کو ضرر پہنچانا مشکل تھا۔ اس لیے اتحاد میں جب راہنہ کی ادھوری واردات کی دراز پڑی تو بڑے ٹھاکر کو یہ خبر سننے ہی ایک امید کی بندھ چلی تھی کہ وہ کوئی پتا پھیل کر نادر شاہ کو بدر کی پشت پناہی سے ہٹا سکتے ہیں۔

”ہماری بیٹا رانی آپ سے کچھ کہنا چاہتی تھیں، انہیں کچھ شکایتیں تھیں، بولو بیٹا۔“

زہرہ جیسے کسی خواب سے جاگی تھی۔ سامنے صوفے پر بیٹھا تھانے دار اسے بغور دیکھ رہا تھا۔

اس نے گھبرا کر ڈھلکا آنچل سر پر درست کیا۔ اسے احساس ہونے لگا تھا کہ کہیں کچھ بہت غلط ہو گیا تھا۔ اسے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا، وہ غلط جگہ پہ غلط لوگوں کے بیچ بیٹھی ہے۔

”بیٹائی بیٹا! داروغہ جی کسی کو بھی گھٹنے بھر میں دھکے دے کر گاؤں سے نکلوا سکتے ہیں۔“ اور اس نے یقین کر لیا۔

”داروغہ جی! آپ مایا میم صاحب کو یہاں سے نکلوا دیں۔“

نادر شاہ بری طرح سے چونکا۔ ”میم صاحب کو؟ مگر کیوں؟“

”وہ ڈاکٹر میرے گھر میں فساد ڈال رہی ہے۔“

بڑے ٹھاکر اس اثنا میں اٹھ کر ساتھ والے کمرے میں چلے گئے، تاکہ دونوں کو بظاہر تنہائی دے کر وہ پردے کے پیچھے سے تمام گفتگو بھی یا آسانی سن سکیں۔

”کس قسم کا فساد؟ لی بی کچھ وضاحت کریں۔“

(جانے یہ اتنی خوب صورت لڑکی کون تھی۔)

”وہ میرے منگیتہ پر ڈورے ڈال رہی ہے، وہ اسے مجھ سے الگ کر دے گی۔“

دے کر اپنے
مال خود ہم
بہت مضبوط
نہیں دوست جن
چنانچہ مشکل تھا اور
پوری واردات کی
ایک امید سی
ناور شاہ کو بدر کی
منا چاہتی تھیں
اسے بغور دیکھ رہا
ورست کیا اسے
ت غلط ہو گیا تھا
ظ جبکہ یہ غلط لوگوں
کھینچے بھر میں دھکے
اور اس نے یقین
کو یہاں سے نکلوا
ہم صاحب کو ہنگام
رہی ہے
تھ والے کمرے
تہائی دے کر وہ
انسانی سن سکیں
ت کریں
لون تھی
رہی ہے وہ اسے

”مگتیر“ یہ لفظ نادر کو چاہک کی طرح لگا تھا۔
”کون ہے آپ کا مگتیر؟“ ٹھاکروں کا کوئی لڑکا؟
”آپ ٹھاکروں کی کیا لگتی ہیں؟“
”نہیں، نہیں ٹھاکر نہیں۔ میں تو مسلمان ہوں،
زہرہ زہرہ ہے میرا نام۔“ وہ بے ربط بول رہی تھی۔
”زہرہ“ نادر نے زیر لب دہرایا۔ ”کون ہے آپ
کا مگتیر؟“
”بدر جی، ملک بدر غازی۔ وہ میرے چاچے کا لڑکا
”کیا؟“ نادر شاہ کو کرنٹ لگا تھا۔ تو یہ تھی بدر کی وہ
مگتیر جس کے حسن کے قصے اس نے سن رکھے تھے۔
اور دل میں کئی بار دیکھنے کا اشتیاق بھی پیدا ہوا تھا۔
”مگر تم اوھر ٹھاکروں کی حویلی میں کیا یہ تمہیں
زبردستی لائے ہیں؟“
”جی، ہم زبردستی لائے ہوتے تو آپ کو تو نہ بلاتے
داروغہ جی۔“ بڑے ٹھاکر اسی بل کمرے میں داخل
ہوئے، زہرہ سے کچھ بعید نہ تھا، وہ کیا کہہ دے۔ ”اس
میں صاحب کی وجہ سے اگر اس بچی کی مفتی بدر سے
لوٹ آئی تو شریکیوں میں کتنی بدنامی ہوگی۔ وہ اسی لیے تو
خود حویلی آئی تھی کہ مایا دیوی کو خبردار کر سکے، مگر وہ
عورت تو۔ بھگوان کی سونگندہ کھنسنے کی حد میں ہی
نہیں ہے یہ اس سے بات کر کے روتی ہوئی نیچے آئی
تو ہمیں تو مانو بہت دکھ ہوا، سو فوراً“ آپ کو بلا بھیجا کہ
اس معاملے کو حل کروائیں، بدر کو تو بلانے سے رہے
جی، وہ تو ہماری شکل دیکھنے کا روادار نہیں ہے۔“
یہ وہ وقت تھا جب گاؤں کے سارے مسئلے حل
کروانے لوگ تھانے دار کے پاس شکایت لے کر
جاتے تھے۔
نادر زہرہ کی جانب متوجہ ہوا۔
”بدر کو علم ہے کہ تم اوھر ہو؟“
”نہیں۔“ وہ گھبرا اٹھی۔ ”خدارا آپ انہیں مت
بتائیے گا۔“
”تمہیں اوھر نہیں آنا چاہیے تھا، تمہارے اور
ٹھاکروں کے خاندان کی عداوت بہت پرانی ہے۔“

”نادر جب وہ خود میم صاحب کے ساتھ ہوتا ہے،
تب وہ عداوت کہاں جاتی ہے؟“ اس کی آنکھیں
جھلکانے لگیں۔
”میم صاحب کی بات اور ہے، وہ راجپوت نہیں
ہے، آج اوھر ہے تو کل چلی جائے گی پھر۔“
”وہ واقعی چلی جائے گی؟“ اس نے بے مبری سے
بات کاٹی۔ ”کیا آپ اسے یہاں سے بھیج سکتے ہیں؟“
”میں دیکھوں گا، کیا کسی اور کو علم ہے کہ تم اوھر
ہو؟“
”نہیں۔“ وہ بے اختیار گھبرا کر کھڑی ہوئی۔ شربت
کا جام قالیں پہ رکھ دیا۔ ”میں نہیں چلتی ہوں۔“ کہہ کر
وہ بیرونی دروازے کی سمت بھاگتی چلی گئی۔
”میں ابھی آیا۔“ نادر اس کے پیچھے لپکا۔ وہ
برآمدے تک ہی پہنچی تھی، جب اس نے اسے روکا۔
”زہرہ سنو۔“
”جی؟“ وہ پلٹی۔ چادر کا گھونگھٹ ٹھوڑی سے ذرا
اوپر اس نے انگلیوں سے پکڑ رکھا تھا۔
”شام کو تھانے آجانا، وہیں پوری بات کریں گے،
فکر نہ کرو میں اس معاملے کو سنبھال لوں گا۔“
”آپ بدر کو مت بتائیے گا۔“ وہ قدرے خوف زدہ
نظر آرہی تھی۔
”میں اسے نہیں بتاؤں گا، مگر آئندہ ٹھاکروں کی
حویلی مت آنا ناوان لڑکی، ان کا لڑکا اچھے قماش کا نہیں
ہے۔“
”میں تو بس میم صاحب سے۔“
”ارے جنم میں گئی میم صاحب۔ اس الٹی کھوپڑی
کی عورت سے سرنہ پھوڑو۔ جاؤ گھر اور بعد میں تھانے
آجانا۔“
وہ شرمندہ سی ہو گئی، اور خائف بھی۔ ”مگر خدارا
آپ بدر کو نہ بتائیے گا۔“
”نہیں بتاؤں گا۔“ اسے معلوم تھا اب اسے بدر
سے بہت کچھ چھپانا پڑے گا۔
وہ بیڑھیاں اترتی چلی گئی اور نادر شاہ اس کا سنی سی
لڑکی کو یک ٹک دیکھ گیا۔ یہاں تک کہ وہ پچانک پار

کر مٹی اور اسے لگا کہ بل بھر میں راجپوتوں کی اونچی
جوبلی ویران ہو گئی ہے جیسے وہ سندرناری سارے
رنگ اپنی کلی چادر میں چھپا کر لے گئی ہو۔
جب وہ بڑے ٹھاکر سے رسمی باتیں کر کے رخصت
ہوا تو اسی وقت گہپال اندر داخل ہوا۔
”پتاجی! بوا بتا رہی تھی کہ ملکوں کی دھمی آئی تھی۔“
وہ حیران سالن کی جانب آیا۔ ”اور داروغہ جی؟“
ٹھاکر رگھوناتھ کے چہرے پہ گہری ہوتی شاطر
مسکراہٹ دیکھ کر اس نے فقرہ لبوں پہ روک دیا۔
”کیا پکڑ ہے پتاجی؟“ وہ مجتہس سالن کے قریب آ
بیٹھا۔

”ہمارے بڑے کہہ گئے ہیں پتر کہ انسانوں میں
تین طرح کے جھگڑے ہوتے ہیں زن اور زمین
کے ہم نے سوچا اگر بدر عازان اور نادر شاہ زر اور
زمین پہ نہیں جھگڑتے تو زن پہ ضرور جھگڑیں گے۔“
”معلوم نہیں پتاجی۔“ وہ کچھ کچھ سمجھ رہا تھا۔ ”وہ
سالا کیوں جھگڑے گا اس عورت پہ؟ وہ تو میم صاب کے
چکر میں ہے۔“

”بھاڑ میں جائے میم صاب۔“ وہ بد مزہ ہوئے۔
”سالی نے ہمیں کس گورکھ دھندے میں پھنسا دیا
ہے جانے کون مار گیا شیکھو کو اور اس عورت نے
عذاب گلے ڈال دیا۔ نادر شاہ جتنا ہمارا دم بھرے اگر
اس کا اپنا مفاد ہوا تو ہمیں دھرنے سے گریز نہیں کرے
گا اور ابھی ہم مکمل طور پر اس کیس سے نہیں نکلے۔“
اور اوپر اپنے کمرے سے نکلتی پایا ٹھہر گئی۔
”تو کیا یہ دونوں شیکھو کے قتل میں واقعی ملوث
نہیں؟“ وہ حیران سی سوچتی رہ گئی۔ ”پھر کون قتل
کر سکتا ہے اسے؟“

پھر سر جھٹک کر سیڑھیاں اترنے لگی۔ اس کی
جوتوں کی ٹنگ ٹنگ پرانے دونوں نے چونک کر سر اٹھایا
اور اسے نیچے اترتے پا کر بالکل خاموش ہو گئے۔ وہ
انہیں مکمل طور پر نظر انداز کیے باہر نکل آئی۔
ابھی روپا نے اسے بتایا تھا کہ کھوجی کرم الہی اس
سے ملنے آیا ہے۔ کتا ہے کوئی ضروری کام ہے وہ اسی

لیے نیچے آئی تھی۔

”روپا! اس نے برآمدے کی سیڑھیاں اترتی ہوئی
روکا۔ ”کھوجی کدھر ہے؟“
”وہ کھڑا ہے جی۔“ اس نے پھاٹک کی جانب اشارہ
کیا جہاں کھوجی بچوں کے بل زمین پہ بیٹھا تھا۔
”چھاپا اور سنو زہرہ چلی گئی؟“
”ہاں جی۔“

”اور کس کو بلوایا تھا بڑے ٹھاکر نے؟ مجھے دیوان
خانے سے بولنے کی آوازیں اوپر آ رہی تھیں۔“ انداز
سرسری تھا۔

”داروغہ جی آئے تھے، معلوم نہیں خود آئے تھے
کہ بلوایا گیا تھا۔“
”ہوں۔ ٹھیک ہے، جاؤ۔“ وہ اس کی بات پہ غور
کرتی کھوجی کی طرف آئی۔ اسے آتا دیکھ کر وہ بے چینی
سے اٹھ کر اس کے قریب آیا۔
”سلام میم صاب!“

”نیریت کرم الہی۔“ اس کی ساری حیات جاگ
اٹھیں۔

”جی میم صاب۔“ اس کے انداز میں دبا دبا سا جوش
تھا۔ ”کچھ دکھانا تھا آپ کو۔“
”کیا؟“ وہ چونکی۔ ”کیا وہ کھرے کا کوئی سرخ پا چکا
تھا۔“

کھوجی نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے، پھر ادھر
ادھر دیکھا۔ جگہ رازدارانہ گفتگو کے لیے نامناسب
تھی، سوا اشارہ کیا ادھر آئیے۔ وہ سمجھ کر اس کے ساتھ
باہر چلی آئی۔

چند کچی دھول اڑاتی پگڈنڈیوں پہ اسے اپنے عقب
میں اسے چلا تا وہ اسے مرکزی تھانے سے قریب لے
آیا۔

”یہ کھرا دیکھیے۔“ زمین پہ بچوں کے بل بیٹھ کر
کھوجی نے کچی پگڈنڈی کی طرف اشارہ کیا۔
میلانے قدرے جھک کر پلکیں سکڑ کر دیکھا وہ کسی
جوتے کا صاف اور واضح نشان تھا جو مٹی نے خود پہ ثبت
کر لیا تھا۔

بیٹھیاں اترتی رہا کو

انک کی جانب اشارہ
پہ بیٹھا تھا۔

رہنے؟ مجھے دیوان
ی تھیں۔ "انداز

س خود آئے تھے

کی بات یہ غور
یہ کرو بے چینی

حیات جاگ

وایا سا جوش

سراغ پا چکا

لے پھر ادھر
نامناسب
کے ساتھ

پنے عقب
بے لے

بیٹھ کر

وہ کسی
رہبت

"یہ وہی کھرا ہے جو اس روز ہم نے کچھ راستے پہ
ملا تھا۔"

"ہوں۔" وہ سوچ میں غم کھرے کو دیکھتی رہی۔
ایک قطار میں تازہ کھرے بنے تھے جو تھانے کی طرف

برہتے جا رہے تھے۔
"یہ کس کا کھرا ہو سکتا ہے؟"

"معلوم نہیں میم صاحب، لیکن یہ بالکل تازہ کھرا
ہے، ابھی ہوائے اسے نہیں چھیڑا۔ معلوم ہوتا ہے کہ

کوئی ادھر سے گزر کر ابھی تھانے گیا ہے، مگر واپسی کا
کھرا نہیں ہے، یا تو وہ شخص کسی دوسرے راستے سے

واپس گیا ہے یا پھر ابھی وہ تھانے میں ہی ہے۔"
"تم نے نادر شاہ کو آگاہ کیا؟"

"نہیں، میں نے سوچا، پہلے آپ کو خبر کر دی
جائے۔" وہ عاجزی سے بولا۔

"بہت اچھا کیا، ابھی تھانے دار کو آگاہ بھی مت
کرنا۔ مجھے خود اس کھرے کو ڈھونڈنے۔"

"کوئی آ رہا ہے میم صاحب، ادھر آجائیے۔"
وہ دونوں بے اختیار درختوں کی باڑھ کے پیچھے

ہو گئے، تاکہ آنے والا ان کو نہ دیکھ سکے۔
"یہ تمہارا انعام۔" مایا نے اپنے بٹوے میں سے

کچھ روپے نکال کر اسے دیے۔
"نہیں میم صاحب! میں نے اس لیے تو نہیں بتایا

تھا۔" مگر اس کا انکار رسمی تھا، اس نے روپے پکڑی
لیے اور جب وہ سر جھکائے، بڑھ بند کر رہی تھی، کھوجی

لپک کر آگے گیا اور جانے والے کا کھرا بڑھنے لگا۔
"میم صاحب۔" ایک دم وہ آہستہ آواز میں جوش

سے چینا۔ "یہ ہی ہے اسی کا کھرا ہے، یہ ہی وہ شخص ہے
جو تھاکر شیکھو سے ملا تھا۔"

مایا درخت کی اوٹ سے نکل کر اس کے قریب آئی
اور کھرے کے تعاقب میں تلاشنا چاہا۔

"کون؟ کدھر؟" وہ ماتھے پہ ہاتھ کا چھجا بنا کر ادھر
ادھر دیکھ رہی تھی۔

"وہ اس طرف وہ جو ادھر جا رہا ہے۔" یہ ہی وہ
شخص ہے۔ کھوجی نے انگلی سے اشارہ کیا۔ مایا نے اس

کی انگلی کے تعاقب میں گردن قدرے اونچی کر کے
دیکھنا چاہا اور انگلی ہی بل وہ ساکت رہ گئی۔

"نہیں۔" اس نے بے یقینی سے لمبی میں سر ہلایا۔
"یہ نہیں ہو سکتا۔" وہ سخت استغلاب کے عالم میں

کھوجی کی جانب مڑی۔ "ییس۔ یہ شخص نہیں ہو سکتا،
تم سے غلطی ہوئی ہے۔"

"برسوں سے یہ کام کر رہا ہوں میم صاحب! اب
غلطی نہیں ہوئی۔"

کھوجی نے قدرے برا مانا، مگر پھر اس نے محسوس کیا
وہ اس کی طرف متوجہ ہی نہیں تھی۔ وہ بے یقینی سے

لمبی میں سر ہلاتی پگڈنڈی پہ دور ہوتے فرد کو دیکھ رہی
تھی۔ اس کے چہرے پہ ایسی بے بسی تھی کہ جب میں

نوٹ اڑتے کرم الٹی کو لگا وہ پل بھر میں کسی دوسری
عورت سے متعارف ہوا تھا۔ وہ سننے اور رعب و اب

والی میم صاحب کو پکچی مٹی پہ گم ہونے والے نشانوں کی
طرح کہیں دھول میں کھوجی تھی۔

"زہرہ کیسی ہے؟"

شام میں جب وہ حسب معمول کنویں کی منڈیر پہ
بیٹھے تھے، اس کی کسی بات کے جواب میں مایا نے

اچانک بوچھا ساتھ ہی بغور اسے دیکھا۔
"ٹھیک ہے۔" اس نے لاپرواہی سے شانے

اچکائے۔
"نظر نہیں آئی کافی دنوں سے؟" وہ پلک جھپکائے

بغیر درکار چہرہ پڑھ رہی تھی۔
"ہمارے خاندان کی عورتیں زیادہ باہر نہیں

نکلتیں۔"
"مگر جب میں نے پہلی دفعہ اسے دیکھا تھا تو وہ مجھے

باہر ہی ملی تھی۔"
"کسی کام سے نکلی ہوگی، قدرے لاپرواہ ہے، مگر

شعور کے ساتھ ساتھ سمجھ داری آتی جا رہی ہے۔"
"اچھا۔" وہ ہولے سے ہنسی۔ "خیریت پوچھ لیتا

اس کی میری طرف سے۔"

”پوچھ لوں گا۔“ اور رات میں کھانا کھاتے ہوئے اسے یاد آیا تو ایک دم زہرہ کو پکار بیٹھا۔
”کمرے میں ہے، شاید حاجراں سے لڑائی ہو گئی ہے، جب سے اس کے گھر سے آئی ہے، کمرہ بند کر کے بیٹھی ہے، ٹھہر میں بھیجتی ہوں۔“ چاچی کا لہجہ خوشی سے چل اٹھا۔ اسے لگا شاید بدر کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔

”اٹھ زہرہ! بدر بلا رہا ہے۔“ چاچی نے اس کے کمرے کا دروازہ کھولتے ہی خوشی خوشی بتایا۔
وہ جو آنکھوں پر بازو رکھے ست سی پینک پی لیٹی تھی، ایک دم اٹھ بیٹھی۔ دماغ میں کہیں خطرے کی گھنٹی بجی۔ وہ پہر کی نادانی ابھی بھولی کہاں تھی۔
”میں مجھے کیوں بلا رہا ہے؟“
”کوئی بات کرنا چاہتا ہو گا۔“ اس کی ہچکچاہٹ دیکھ کر چاچی نے تسلی دی۔
”اسے بول دو میں سو رہی ہوں۔“ وہ گھبرا اٹھی تھی۔

”غلط ہے زہرہ، چل اٹھ جلدی کر۔“
اور چارو ناچار اسے جانا ہی پڑا۔
”جی۔“ بمشکل ہی وہ اس کی چارپائی کے کنارے ٹکسپائی جیسے ابھی بھاگنے کو تیار ہو۔ ”کوئی کام تھا؟“
”نہیں کام نہیں تھا۔ مایا۔۔۔ پھر رک کر جیسے تمہید باندھی۔“ دراصل شام میں پایا میم صاب سے ملاقات ہوئی تھی وہ تمہارا پوچھ رہی تھی۔
زہرہ کا تو جیسے خون خشک ہو گیا۔ اسے یہ کیوں بھول گیا تھا کہ تھانے دار اور ٹھاکر جی کو جتنا منع کر لے، سب سے پہلے تو بدر کو میم صاب بتائے گی، خدا یا وہ کہاں جائے؟

”ککس۔ کیا پوچھ رہی تھیں؟“
”حال پوچھ رہی تھی، کہہ رہی تھی، عرصہ ہوا تم سے ملاقات نہیں ہوئی۔ سو تمہاری فکر تھی۔“ وہ کھانا ختم کر کے ہاتھ صاف کر رہا تھا۔
زہرہ نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔
”بس یہی کہا انہوں نے؟“

”ہاں۔“
”اور کچھ نہیں کہا؟“
”اور کیا کہتا تھا؟“ وہ برتن پرے کھسکا تا اٹھ کھڑا ہوا۔ زہرہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔
”خوبی آنے کا نہیں بتایا؟“ بے اختیار لبوں سے پھسلا۔
”کیا؟“ وہ سمجھا نہیں تھا۔
”میرا مطلب ہے، انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ وہ ہماری خوشی کب آئیں گی؟“ پورے دن میں اس نے پہلی عقل کی بات کی تھی۔
”نہیں۔“ وہ ہنرہ جیب میں ڈالتا ہر چلا گیا۔ وہ اس کے قدموں کی چاپ سنتی رہی۔
”میم صاحب نے بدر کو کیوں نہیں بتایا؟“
وہ برآمدے کی خاموش دیواروں سے پوچھ رہی تھی۔

وہ تھانے میں چوہدری دلاور کے ساتھ بیٹھا کسی جھگڑے کی صلح صفا کر رہا تھا، جب ایک سپاہی نے آکر اطلاع دی۔
”یا ہر کوئی عورت آئی ہے شاہ صاب، آپ سے ملنا چاہتی ہے۔“
”کون ہے؟“ وہ جو دوسرے معاملے میں پوری طرح سے منہمک تھا، الجھ کر پوچھنے لگا۔
”میم نہیں بتاتی۔“
”جا کر اس کو کہو سویر آتا، میرے پاس ابھی وقت نہیں ہے۔ جی چوہدری صاب، کل امیرے کے۔“ وہ کوفت چھپاتا واپس ادھر متوجہ ہو گیا۔ سائمن صبح شام شکایات لے کر آتے رہتے تھے کسی بڑی واردات یا قتل کا قصہ ہوتا تو وہ عورت یقیناً ”کسی الہاکر کو بتا دیتی۔ یقیناً“ کوئی ذاتی نوعیت کا کام ہو گا، سو اس نے اہمیت نہ دی۔
چوہدری دلاور کا معاملہ نپٹا کر وہ نقب زنی کی ایک جائے واردات پہنچ چلا گیا۔

پرے کھکاتا اٹھ کھڑا
بے اختیار لبوں سے

یہ نہیں بتایا کہ وہ
سے دن میں اس نے

یا ہر چلا گیا۔ وہ اس

بتایا؟

سے پوچھ رہی

ساتھ بیٹھا کسی
ایک سپاہی نے

آپ سے ملنا

لے میں پوری

ابھی وقت
ہے کہ۔ وہ

باکلیں صبح
کسی بڑی

کسی اہلکار
کا۔ سو اس

ن کی ایک

سموں کے ایک سرکردہ خاندان کی حویلی میں نقب
لگا کر رات کو چوری ہوئی تھی۔ کچھ عرصہ قبل مرنے
والا چوہدری منگل سنگھ اسی خاندان کا فرد تھا۔
اس نے کھرے اٹھوائے، تفصیل سے رپورٹ
بائی، گھر والوں کے بیانات لیے، نمبردار کو تھانے بلاوا کر
اس خاندان کے بارے میں چند معلومات لیں، غرض
جب وہ اس کارروائی سے فارغ ہوا تو شام دھل گئی
تھی۔

”وہ عورت چلی گئی تھی؟“ ابتدائی تفتیش کی
رپورٹ رقم کرتے ایک دم یاد آنے پر اس نے سپاہی کو
بل کر دریافت کیا۔

”ہاں جی۔ وہ کچھ کہے بتائی چلی گئی۔“

”اچھا۔“ وہ حیران ہوا۔ ”جانے کون تھی۔ کوئی نام
پتا نہیں بتایا۔“

”نہیں جی۔“

”مشکل‘ حلیہ کیسا تھا؟“ وہ اندازہ کرنا چاہ رہا تھا کہ وہ
کون تھی۔

”چہرہ چھپا رکھا تھا، آواز سے تو کم عمر لگتی تھی،
آنکھیں خوب صورت تھیں، کالی چادر اوڑھ رکھی
تھی۔“

”کالی چادر۔“ وہ بے اختیار چونکا۔

”اوہ خدایا، کیسے بھول گیا اسے کہ وہ تھانے آئے گی،
شاید اسے اندر سے امید ہی نہ تھی کہ وہ واقعی آجائے
گی اور اب اگر آتی گئی تھی تو کیسی غلطی ہو گئی رہتا۔“

”یہ بات تم مجھے پہلے نہیں بتا سکتے تھے؟ کل اگر وہ
آئے تو مجھے فوراً اطلاع کرنا۔“ وہ خواہ مخواہ سپاہی پر
غصہ نکالنے لگا۔ پھر اس کے جانے کے بعد آگیا کہ
فائلیں پرے کر دیں اور کرسی پر دراز ہو کر آنکھیں
موندیں۔

ذہن کے پردوں پر فلم کی طرح کل کے مناظر چلنے
لگے۔ وہ کم صم سی گھبرا کر کھڑی ہونے والی لڑکی، پیکپاتی
الٹیوں سے تھما کالی چادر کا کونہ، بڑی بڑی سندر
آنکھوں میں اتری وحشت۔

نادر شاہ نے اپنی زندگی میں ایسی لڑکی پہلی دفعہ دیکھی

تھی۔ پہلی دفعہ کسی نے اس کے دل پہ دستک دی تھی
اور پہلی دفعہ اسے بدر سے شدید نفرت محسوس ہوئی
تھی۔
شاید وہ لاشعوری طور پر اپنا اور بدر کا موازنہ کرنے
لگا تھا۔

گھنیری رات پھر سے پرانے قبرستان پہ اتر آئی
تھی۔

برگد کی چھایا تلے وہ دونوں پھر سے موجود تھے۔
گوپال اس رات جانے کہاں تھا، بدر نے پوچھنا
ضروری نہ سمجھا تھا۔

”ایک سوال کروں مایا؟“ وہ قبرستان کے ناپیدہ
بھوت کی باتیں کرتے کرتے ایک دم سے گفتگو کو کسی
اور موڑنے لے جانے لگا۔

”پوچھو۔“ وہ تنے سے سر نکالے اوپر آسمان کو دیکھ
رہی تھی جو کالے بادلوں سے ڈھکا تھا۔ چاند اور تارے
جانے کہاں گم ہو گئے تھے۔

”تم نے کبھی مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ میں اس شام
ڈلموزی میں کیوں تھا؟“

”میں نے تو یہ بھی نہیں پوچھا کہ تم اس صبح جنگل
میں کیوں تھے؟“

بدر نے دیکھا، وہ موتیوں کی لڑی اسی طرح اس کے
بالوں سے لٹک رہی تھی۔

”یہ لڑی کتنی لمبی تھی نا۔“ بدر نے انگلی سے
موتیوں کو چھوا۔ وہ بے حس و حرکت اوپر دیکھتی رہی۔

”تم نے کیوں توڑا تھا اسے؟“
”پہلے بتایا تھا نا، یہ شاہی خاندان کا دستور ہوتا
ہے۔“

اس نے لڑی چھوڑ دی، وہ ہولے سے مایا کے
کندھے پہ آن گری۔

”تم اس شام ڈلموزی میں کیوں تھے؟“ سیاہ بادل
ہلکے ہلکے گرجنے لگے تھے۔

”دوستوں کے ساتھ سیرو تفریح پہ گیا تھا، وہ آگے

نکل گئے اور میں پیچھے رہ گیا، معلوم ہی نہ ہوا کہ کب
سانپ نے کاٹا اور۔۔۔

”اور تمہارے دوست؟“

بارش ہوئے ہوئے برسنے لگی۔ برگد کی بوڑھی
شاخوں نے بوندوں کا راستہ روک لیا، مگر سامنے قبریں
گیلی ہونے لگیں۔

”تم نے نیچے جا کر جن لوگوں کو بھیجا تھا، وہ مجھے
اسپتال لے گئے تھے، بعد میں میرے دوست بھی مجھے
تلاش کرتے ادھر آگئے تھے۔“

”تمہارے دوست کون؟ وہ نادر شاہ؟“

”ہاں نہیں، وہ بس گاؤں کا بار ہے، ہم دونوں
میں مماثلت یہ ہے کہ دونوں کو فرنگیوں سے نفرت
ہے، اور ان کا یہاں بالخصوص شکار کے لیے آنا سخت
نا پسند ہے۔ مگر جب ہم نے ماکھ کے ساتھ مل کر ان کو
لوٹنا شروع کیا تو فرنگی بلی آنے سے گھبرانے لگے۔ ماکھا
یہاں کا ایک نامی گرامی ڈاکو ہے، اس روز برچھیت وہی
تھا۔“

”میں بھی تو فرنگی ہوں بدر۔“

ایک لمحے کو بجلی زور کی چمکی، پورا قبرستان روشن
ہو گیا۔ گیلی قبوں پہ قطرے موسلا دھار برس رہے
تھے۔ دوسرے ہی پل اندھیرا چھا گیا۔
”تمہاری بات اور ہے، کمپنی بہادر کے صاحب
لوگ کاروبار کرنے ادھر آئے تھے، پھر یہاں قبضہ کر کے
بیٹھ گئے۔“

”ہندوستان کے باقی لوگ بھی کمپنی بہادر سے
نفرت کرتے ہیں؟“

”کرتے تو سب ہی ہیں۔ اظہار کوئی کوئی کرتا
ہے۔“

”تو اس صورت حال کا کیا بنے گا؟“

”جب فرنگی یہاں سے جائیں گے تو مسلمان ادھر
ہندوستان میں ایک الگ ریاست بنائیں گے، پھر سب
ٹھیک ہو جائے گا۔“

وہ زور سے ہنس پڑی۔

”تم کس دنیا میں رہتے ہو بدر؟ فرنگی یہاں سے کبھی

نہیں جائیں گے، وہ سو سال بعد بھی ادھر ہی ہوں
گے۔“

”اور تم۔۔۔ تم کب تک ہوگی ادھر؟“ اس نے
لا حاصل سیاسی بحث سے بچنے کو بات پلٹ دی۔
پارش مدھم ہوتے رک چکی تھی۔ ٹھنڈی ہوا چلنے
لگی تھی۔

”معلوم نہیں۔“

”میرے ایک سوال کا جواب تم پہ ادھر ہے۔“
وہ کچھ نہیں بولی تو وہ تھک کر خود ہی کہنے لگا۔

”جب میں نے تھا کر شیکھو کی دلہن کے بارے
میں سنا تو مجھے لگا کہ یہ بلی کی وہی مہارانی ہے جس نے
میری جان بچائی تھی۔ اور ابھی میں تمہارا چہرہ دیکھ کر
مجھے یقین سا ہو چلا تو میں لاشعوری طور پر تمہارا انتظار
کرتا رہا، ہر جگہ، ہر وقت میں نہیں جانتا کہ یہ سب کیا
ہے۔ بس میں چاہتا ہوں کہ تم یہاں سے بھی نہ
جناؤ۔“

”اور زہر کہاں جائے گی؟“

”اسے کوئی بھی مجھ سے بہتر مل جائے گا۔ میں
بس۔۔۔ بات اس کے لبوں پہ ہی رہ گئی۔
قبرستان کے پھانک کے ساتھ ساتھ ایک ہیولہ
ساگر زربا تھا۔

”یہ کون ہے؟“ مایا سرگوشی میں بڑبڑائی اور حیرت
سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی۔

”شاید وہی بھوت۔“ بدر کے اندر جوش سا بھر گیا۔

”یہ تو۔۔۔“ وہ جیسے پہچان گئی، اور اس سے پہلے کہ وہ
نبھٹا وہ تیر کی تیزی سے ابھی اور لپک کر دوڑتی ہوئی
اس تک جا پہنچی، اور وہ جو اسے دیکھ کر اٹنے قدموں
واپس مڑنے کو تھا اسے موقع ہی نہ مل سکا۔

مایا نے اس کا گریبان پکڑ لیا۔

”تم ادھر کیا کر رہے ہو؟“ وہ انگریزی میں غرائی مگر
جواب دینے کے بجائے اس شخص نے اس کے ہاتھ
جھٹک کر اپنا گریبان چھڑایا اور بھاگتا ہوا واپس ہو گیا۔

بدر دیکھ چکا تھا، وہ لمبی سبز برساتی پہنے شخص ڈپٹی
کمشنر جان کا رس تھا۔

”یہ یہاں کیا کر رہا تھا؟“
”معلوم نہیں۔“ وہ اسی طرح غصے میں سرخ پڑتی
اس کو درگم ہوتے دیکھتی رہی۔

”کیا یہی وہ بھوت تھا؟“
”معلوم نہیں۔“ وہ مزید کچھ کہے بنا پھانک پار کر
گئی۔
وہ تمام سوچوں کو ذہن سے جھٹک کر آہستہ سے اس
کے پیچھے ہولیا۔

”تجھے زہرہ پہ کیا اعتراض ہے میرا پتر؟“
اس دوپہر والا منظر پھر سے سچ گیا تھا۔ وہ اسی طرح
برآمدے میں چارپائی پہ بیٹھا میز پر رکھا کھانا کھا رہا تھا اور
فکر مند سی چاچی پاس بیٹھی پوچھ رہی تھی۔ اور وہ اس
طرح اندر دیوار کی اوٹ میں گھڑی تھی۔
”کوئی اعتراض نہیں ہے۔“
”پھر تو کیوں انکار کرتا ہے؟“
”میں تجھ سے بہتر۔“

”بات بہتر کی نہیں ہے پتر بات اعتراض کی ہے۔“
تجھے اعتراض کیا ہے؟ وہ سوہنی نہیں ہے؟ سلیقہ
شعار نہیں ہے؟“

”اس میں کوئی برائی نہیں ہے اماں!“ اس نے
تھک کر توڑا ہوا القمہ واپس رکھ دیا تھا۔

”ماں برائی تو ہے نا اس میں وہ ولایت سے نہیں آئی
پتر پتر انگریزی نہیں بولتی میری دھی جتنی اچھی
ہو جائے وہ میم نہیں ہے تو تو کیوں کرے گا اس سے
شادی؟“

”اماں! میں نے ایسا کب کہا ہے؟“ وہ پریشان سا
ہو گیا۔

”بس کر بدر!“ چاچی برتن میٹھنے لگی۔ ”تو ماں کو
بے وقوف سمجھتا ہے۔ سارا گاؤں جانتا ہے تو میم
صاب سے ملتا ہے۔ کل نذیراں پانی بھرنے کنویں پہ
رہی تو تجھے اوھر دیکھا ۴ لٹے قدموں واپس آئی وہ۔ تو بتا
تو میم صاب سے بیاہ کرنا چاہتا ہے؟“

وہ خاموش رہا۔ جواب تو اسے خود بھی معلوم نہ تھا۔
”تو جا کر پوچھ لے میم صاب سے کرے گی وہ تجھ
سے بیاہ؟“

اس نے سراٹھایا۔ ”میں اس سے پوچھ چکا ہوں۔“
چاچی صدمے سے اسے دیکھتی رہ گئی اور اندر زہرہ
کا دل ڈوبتا گیا۔
”تو نے کیا پوچھا اس سے؟“
”یہی کہ میں۔ میں اس سے شادی کرنا چاہتا
ہوں۔“

چند لمحے خاموشی سے سرک گئے۔
”وہ مان گئی؟“ بہت دیر بعد چاچی بولی تو اس کی آواز
میں ٹوٹے مان کی کرچیاں تھیں۔
”نہیں۔“

زہرہ نے بے اختیار دیوار کا سہارا لیا۔ اس کی کچھ
سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

”اس نے انکار کر دیا؟“ چاچی حیرت زدہ رہ گئی، بھلے
وہ نہ چاہتی ہو مگر اسے امید نہیں تھی کہ کوئی عورت
اس کے بانگے جیلے پتر کو انکار کر سکتی ہے، وہ بھی وہ
گوری چمڑی والی پھکی میم صاب زہرہ کے آگے کہاں
وہ شہزادی اسے حسین لگ سکتی تھی۔

”نہیں۔“ وہ سر جھکائے بیٹھا تھا، کھانا کب کا اس
نے چھوڑ دیا تھا۔

”کیا مطلب پتر؟“
”اس نے جواب ہی نہیں دیا اماں!“ وہ تھکا تھکا سا
کہہ رہا تھا۔ شب بے داری کے باعث اس کی
آنکھیں سرخ پڑی تھیں۔

چاچی کو ایک دم اس پر بے پناہ ترس آیا۔ زہرہ کتنی
لاڈلی سہی، وہ اس کا بیٹا تھا۔ اکلوتا بیٹا۔ پہلو تھی کی اولاد
باقی چار بچے تو پیدا ہوتے ہی مر گئے تھے۔ ایک وہی
تو تھا جو اس کے پاس تھا۔

”میرا پتر!“ وہ برتن چھوڑ کر اس کے پاس بیٹھ
گئی۔ ”یہ فرنگی یہاں رہنے کے نہیں ہیں، وہ اول تو تجھ
سے شادی نہیں کرے گی۔ تیری ماں دنیا دیکھے ہوئے
ہے پتر، وہ بھلا کیوں کسی ہندو ستلی سے شادی کرے

گی؟

”شیکھر کیا تھا پھر؟“

”تو مجھے بتا شیکھر سے کیوں کی تھی اس نے شادی؟ زیادہ مال و دولت والا تھا کیا اس سے؟“ چاچی نے التماس کر دیا۔

”نہ نہیں، وہ تو محبت کی۔۔۔“ وہ رُک گیا چاچی اس سے یہی کہلوانا چاہتی تھی۔

”ہاں تو محبت تو اس نے شیکھر سے کی تھی، عورت زندگی میں بس ایک بار ہی محبت کرتی ہے بدر! وہ بھلے بعد میں کسی کو کتنا ہی چاہنے کا دعوا کرے اس کے سارے جذبے استعمال شدہ اور پرانے ہوتے ہیں وہ ساری عمر اس پہلے مرد کو دل سے نہیں نکال پاتی۔ تو دوسرا مرد بنے گا؟“

”ماں! اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہمارا مذہب۔۔۔“
”ماں کو مذہب نہ پڑھا۔“ سارا پیارا اڑچھو ہو گیا، وہ پھر ماں سے ملکانی بن گئی اور غصے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔
”تیری ماں نے دنیا دیکھی ہے وہ عورت شکل سے ہی لومڑی لگتی ہے مجھے، یہی ڈر تھا وہ تجھے لے اڑے گی۔
جانجا کر لے اس سے بیاہ، مگر یاد رکھیو، وہ فرنگی اور سہر رہنے کی نہیں ہے، وہ تجھے انگلستان لے جاوے گی، تب تجھے ماں یاد آوے گی۔“

”ماں!“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”مگر اس نے انکار کر دیا تو میں اس سے دوسری دفعہ نہیں کہوں گا، اور اگر اس نے اقرار کر لیا تب بھی تیری مرضی کے بغیر شادی نہیں کروں گا۔ تو فکر نہ کر اور اس کے بارے میں ایسے غلط اندازے نہ لگا۔ وہ دوسرے فرنگیوں سے بہت مختلف ہے۔“

”ٹھیک ہے“ اس نے چاچی کا ہان رکھ لیا تھا، وہ قدرے پرسکون ہوئی، مگر لہجہ سخت ہی رکھا۔
”مگر یاد رکھیو یہ سب فرنگی ایک ہی جیسے ہیں۔ چور، غاصب اور لٹیروں۔ تیری یہ میم صاب بھی اسی حصلت کی۔“

”رہنے دو ماں!“ وہ بے زار سا ہار نکل گیا۔
چاچی نے تھک کر گہرا سانس لیا۔ وہ پرسکون تھی

گمزدہ رہ نہیں تھی۔

اسے لگ رہا تھا، بدر چاچی کو بھی منانے کا اور ہاں بھی مان جائے گی۔ ایسے میں وہ کیا کرے گی؟
”تھانے دار کے پاس جاؤں؟ مگر کل گئی تو ملاقات نہیں تھا۔ لیکن کیا معلوم وہ کوئی راستہ نکال دے اور میم صاب یہاں سے دفع ہو جائے۔“
”یا خدا! اس نے تھک کر اوپر دیکھا۔

”ان فرنگیوں کو ہندوستان سے نکال یا ہر کر۔ سب اور برداشت نہیں ہوتے۔“ اور کالی چادر اوڑھنے لگی۔

☆ ☆ ☆

وہ صبح سے دیگر کام نبھاتا، آٹا شعوری طور پر اس کی آمد کا منتظر تھا، اور کام کہاں نبھاتا رہا تھا۔ کبھی نقب کے کیس میں تاریخ کا اندراج غلط کر بیٹھتا، کبھی گھر والوں کو تفتیش کے لیے بلوایا، اور غائب و ماغی سے سوال کر بیٹھتا، غرض سارے کام آج خراب ہو رہے تھے۔
ناور شاہ خاصے مضبوط اعصاب کا حامل تھا لیکن اس دل کا کیا کرتا جو دوسرے انسانوں کی طرح اللہ نے اسے بھی دے رکھا تھا۔

سہ پہر میں جب وہ سکھوں کی حویلی سے واپس آیا تو اے ایس آئی نے بتایا۔ ”وہ کالی چادر والی عورت جس کا آپ کہہ گئے تھے، اندر بیٹھی۔“ اور وہ مکمل بات سنے بغیر تیزی سے اندر لپکا۔

وہ اس کی میز کے سامنے کرسی پہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ ناور شاہ نے تیزی سے میز کے اس طرف اپنے کرسی سنبھال لی۔

”آداب!“ زہرہ نے چونک کر سر اٹھایا۔ کالی چادر نے سنہری چہرے کے گرد ہالہ سا کر رکھا تھا، آنکھوں میں مٹا مٹا سا کاجل تھا، اور ایک گھنگھریالی لٹ دوپٹے کے اندر سے نکل کر بائیں گل پہ بھول رہی تھی۔
”و علیکم۔ میں کل آئی تھی آپ۔“

”بہت معذرت۔ مجھے علم ہوتا، آپ آتی ہیں تو سارے کام چھوڑ دیتا۔“ اسے احساس ہوا، اندر دینی

خوشی میں بھٹکنے لگی ہے تو خود کو قدرے قابو کیا۔ ”بہتے کیسے آتا ہوا؟“

وہ نگاہیں جھکائے، انگلیاں چٹکانے لگی، لب پاربار کھول کر بند کرتی۔ وہ زیر لب مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔

”آپ کسی طرح...“ بے ربط سا انداز تھا۔

”میں کسی طرح... کیا؟“ اس نے گھنیری پلکیں اٹھائیں، وہ اتنے غور و محبت سے اس پر نگاہیں جمائے ہوئے تھا کہ زہرہ کی نگاہیں پھر سے جھک گئیں۔

”آپ کسی طرح میم صاب کو یہاں سے بھیج دیں۔“

”کہاں بھیج دوں؟“

”کیس بھی بھیج دیں۔“ وہ بے چین سی ہوئی۔

”لیکن کم از کم وہ ہم سب سے بہت دور چلی جائے۔“

”آپ سب سے یا صرف بدر سے؟“

”بس وہ بدر سے دور چلی جائے ورنہ...“ وہ بے بسی سے بولی۔ ”ورنہ میری منگنی ٹوٹ جائے گی، اور آپ کو معلوم ہے میری کتنی بدنامی ہوگی۔“ کل کی نسبت

آج وہ عقل مندی کا مظاہرہ کرنے کا ٹھکانے ہوئے تھی سوائے دلی جذبات کا اظہار کرنے کے بجائے اس نے معاشرتی نکتہ اٹھایا۔

”ہوں۔“ نادر شاہ بغور اس کو دیکھتا پیچھے کو ہو کر بیٹھ گیا۔

”بدر کیا کہتا ہے؟“

”وہ کہتا ہے وہ چاچی کی مرضی کے بغیر میم صاب سے شادی نہیں کرے گا۔“

”چاچی؟“

”وہ اس کی ماں جی۔“

”اچھا اور میم صاب کیا کہتی ہے؟“

”پتا نہیں۔“ اس نے سر جھٹکا، انداز جلتا کڑھتا سا تھا۔

”اچھا فرض کرو تمہاری منگنی ٹوٹ جاتی ہے تو تم...“

”اللہ نہ کرے جی۔“ وہ تڑپ کر بولی۔ ”اس لیے تو آپ کے پاس آئی ہوں کہ آپ کوئی بحال نکالیں آپ تو تھانے دار ہیں جی، آپ تو سارے پنڈ کے لوگوں کے مسئلے حل کرتے ہیں۔“

کچھ عقل اور کچھ عمر کی وہ چھوٹی سی لڑکی۔

بے اختیار مسکرایا۔

”بھئی، اگر بدر سے منگنی ٹوٹ جائے گی تو کسی اور سے ہو جائے گی، ایسا بڑا مسئلہ تو نہیں ہے نا۔“

”اللہ نہ کرے۔“ وہ برامان کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”آپ تو...“

اسی بل اے ایس آئی دستک دے کر اندر داخل ہوا، زہرہ نے چہرہ چھپالیا۔

”کیا بات ہے؟“ نادر شاہ نے آگے کر پوچھا۔

اور زہرہ کے قدموں تلے زمین نکل گئی خود نادر شاہ بھی پریشان سا اٹھ کھڑا ہوا۔

”کیا کہتا ہے؟“

”آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔“

”اچھا دوسرے کمرے میں بیٹھاؤ، میں آتا ہوں۔“ اے ایس آئی کو رخصت کر کے اس نے زہرہ کو دیکھا جس کی رنگت سفید پڑ گئی تھی۔

”اسے تپ چل گیا کہ... خدا اے اب کیا ہو گا۔“

”تسلی رکھو لڑکی! وہ دن میں دس دفعہ میرے پاس آتا ہے۔ تم یہاں بیٹھو، میں ذرا اسے اندر کمرے میں بیٹھاتا ہوں، پھر تمہیں بتا دوں گا، تم پچھلے دروازے سے نکل جانا۔“

”وہ دن میں دس دفعہ آپ کے پاس کیوں آتا ہے؟“

وہ دروازے کی طرف بڑھا تو زہرہ کی حیران آواز نے اس کے قدم زنجیر کر دیے۔

”وہ میرا...“ دوست کہتے کہتے وہ رُک گیا اس کے دل نے اسے روک دیا تھا دوستی تو بہت خالص رشتہ تھا، جانے اب رہا بھی تھا یا نہیں کہ اب تو ان کے درمیان ایک عورت آگئی تھی۔

”میں آتا ہوں۔“ وہ چلا گیا اور زہرہ اس کے

اور دورے جملوں پہ غور کرتی رہ گئی پھر چند لمبے گزرے اور اے ایس آئی نے آکر اسے بتایا کہ وہ جاسکتی ہے تو وہ اچھی طرح چادر لپیٹے باہر چلی گئی۔ صد شکر کہ بدر نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ بدر اسے تھکا تھکا سا لگا تھا، جیسے قدرے پریشان ہو۔

نادر شاہ نے اس سے نہیں پوچھا کہ اس کو کیا پریشانی ہے، اس کا دل اس کی پریشانی حل کرنے کو ہی نہیں چاہا تھا۔ تلخیاں تو اسی روزانہ کے تعلق میں گھل گئی تھیں جب بدر نے میم صاب کو جانے دیا تھا، حالانکہ یہ ان کا اصول تھا کہ مقصد یہ ذاتی شناسائی کو ترجیح نہیں دی جائے گی، لیکن بدر نے عہد شکنی کی تھی۔ اب تو خیر سارے معاملے ہی مختلف ہو گئے تھے۔

”چوہدری منگل سنگھ قتل کیس کا کیا نادر؟“ چند رسمی جملوں کے بعد وہ پوچھنے لگا۔ بڑھری اور تھکان اس کے چہرے سے عیاں تھی، نادر تو لگا وہ ذہنی طور پر تھکا ہوا ہے، اور شاید بیمار بھی ہے۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور خوبصورت چہرہ قدرے کمزور دکھ رہا تھا۔

”قاتل پکڑا گیا۔ شوہا سنگھ تھا، جس سے اس کا درخت پہ جھگڑا ہوا تھا۔“

”ہاں سنا تھا۔“ وہ کہہ کر جب ہو گیا۔

”کوئی مسئلہ ہے اس سے متعلق؟“ نادر کا لہجہ محتاط سا تھا اور لیا دیا بھی۔

”نہیں۔“ بدر نے سر جھکائے نفی میں سر ہلایا۔ ”بھوت کا کیا قصہ تھا؟“

”تمہارے خیال میں یہ کون ہو سکتا ہے؟“

”اب اتنا وقت کہاں ہے اپنے پاس کہ گاؤں والوں کی ہوائیوں پہ ضائع کروں۔“ نادر شاہ کا لہجہ روکھا سا ہو گیا مگر وہ اپنے خیال میں اتنا گم تھا کہ دھیان نہیں دیا۔ ”معلوم نہیں کون ہے؟“ وہ دھیمے سے بڑبڑایا۔

”تم تو نہیں ہو؟“ نادر شاہ نے کہا۔

اس نے بے یقینی سے نادر کو دیکھا۔ ”تمہیں لگتا ہے میں ایسا کام کر سکتا ہوں؟“

”ایسا کوئی غلط کام تو بھوت نے ابھی تک نہیں

کیا۔ قبریں کھود کر زیادہ سے زیادہ لاشیں ہی نکال لے جائے گا، یا ہڈیاں اب یہ اتنا بڑا جرم تو نہیں ہے۔“

”اور میں ہڈیاں کیوں لے کر جاؤں گا؟“ وہ سمجھا تھا نادر مذاق کر رہا ہے۔

”وہ جو جوگی ہے نا، جو ہنڈ کے اس پار رہتا ہے، سنا ہے ہڈیوں پہ عمل کر کے دیتا ہے، میں سمجھا شاید تم عمل لینے یم صاب کے ساتھ اس کے پاس گئے تھے۔“

نادر کا لہجہ بظاہر مذاق کرنے والا تھا مگر اندر طنز اتنا واضح تھا کہ بدر کو اچھا نہ لگا۔

”اچھا مجھے تو نہیں معلوم۔“ اس کا لہجہ خشک ہو گیا۔

”باقی تو پورے پنڈ کو معلوم ہے۔ خیر اب یہ بھی جانے سچ ہے کہ نہیں سنا ہے تم شادی کر رہے ہو۔“

”کس سے؟“ بدر کا لہجہ محتاط ہو گیا۔

”تم شاید اپنے خاندان میں کہیں منسوب ہو۔“

”ہاں ہوں۔“

”تو شادی وہیں خاندان میں کرو گے؟“

اب کے بدر کو واضح برا لگا۔ وہ شادی جس سے بھی کرے یہ اس کا ذاتی معاملہ تھا، اور بیلی کے ہر غیر متد مروت کی طرح اسے تھانے پچھری میں اپنا ذاتی معاملہ اچھا لانا گوارا نہیں تھا۔

”ظاہر ہے خاندان میں ہی کروں گا۔“ وہ مایا سے اپنی جذباتی وابستگی کا اظہار کر کے اسے خود پہ مزید کوئی طنز کرنے کا موقع نہیں دے سکتا تھا۔

”اچھا۔“ نادر کے دل کو دھکا سا لگا۔ ”گاؤں والے تو کہتے ہیں تم میم صاب کے چکر میں ہو، مجھے تو خیر تب بھی یقین نہیں آیا تھا۔“

نادر کا لہجہ اتنا کڑوا تھا کہ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”گاؤں والے تو یہ بھی کہتے ہیں کہ آج کل داروغہ جی کے ٹھاکروں کی دعوتوں پہ بہت چکر لگ رہے ہیں، لیکن مجھے بھی تب یقین نہیں آیا تھا، چلتا ہوں۔ رب راکھا۔“

پھر ایک لفظ کے بغیر، یہاں تک کہ مصافحہ بھی کیے بغیر وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

نادر نے زور سے میز کو ٹھوکر ماری۔
”ڈاکو کی اولاد نہ ہو تو۔“

اسے بھول گیا تھا کہ بدر کو ڈاکو اسی نے تو بنایا تھا۔

زہرہ نے برآمدے سے دیکھا تھا وہ پائیں بارغ میں
جھولنے کے ساتھ کھڑا اپنے کتے کے سر پر ہاتھ پھیر رہا
تھا اور وہ گوری لمبی سی سنہرے بالوں والی لڑکی ساتھ
کھڑی ہنس رہی تھی۔ وہ کتے کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے
کچھ تیار ہاتھ اور وہ ہنستی جا رہی تھی۔

وہ تھکے تھکے قدموں سے چلتی رسوائی میں
آئی سیڑھی کھینچی اور بیٹھ گئی، کھلے دروازے سے
پائیں بارغ کا منظر اب بھی واضح تھا۔

چاچی روٹی کے لیے تیار رکھ رہی تھی، خامدوب کے
ہوتے ہوئے بھی روٹی وہ خود ہی ڈالتی تھی، کتنی بھی بدر
اس کے علاوہ کسی کی روٹی نہیں کھا سکتا اور زہرہ نے
سوچا، میم کو تو روٹی ڈالنی بھی نہیں آتی ہوگی، پھر وہ اس
کے ساتھ کیسے زندگی بسر کرے گا؟

شاید وہ دونوں کا ساتھ تسلیم کر چکی تھی۔

”جی بھر کے دیکھ لے ان کو زہرہ!“ چاچی لکڑیوں کو
پھونکیں مار کر سلگا رہی تھی، دھواں نکل نکل کر اس
کے اوپر آ رہا تھا۔ ”یہ منظر بس چند روزہ ہے، تو اپنی
چاچی کی بات لکھ کے رکھ لے، یہ میم یہاں ٹکنے والی
نہیں ہے۔“

زہرہ یک ٹک کھڑکی سے نظر آتے منظر کو دیکھ رہی
تھی۔ اب مایا جھک کر کتے کے سر پر ہاتھ پھیر رہی تھی،
مگر کتا ایک دم غریبا تو وہ دو قدم پیچھے ہٹی۔ بدر نے کتے
کو زنجیر سے کھینچ کر پیچھے کر لیا۔ زہرہ کے لبوں پر اداس
مسکراہٹ آئی۔

”تو جانتی ہے چاچی شیر و اجنبی لوگوں سے بہت دیر
میں گھٹا ملتا ہے! خوشخوار ایسا ہے کہ جان ہی لے
ڈالے مگر مجھ سے ایسے پیار کرتا ہے جیسے میں بدر کا برتو
ہوں، بس ایک دفعہ بدر نے اسے بتایا تھا کہ یہ میری خیم زاد
ہے، اس کو دکھ نہیں دینا، وہ دن اور آج کا دن، شیر و

مجھ سے نہیں غریبا۔ چاچی! میں سوچتی ہوں، بدر نے یہ
بات میم صاب کے لیے کیوں نہیں بتائی؟“

”متنا نہ سوچا کر۔ زہرہ! پیار پڑ جائے گی۔“ وہ روٹی
کو ہاتھ پہ پھیلا رہی تھی۔ ”میں ہونے والی بدر کو
کسی اور کا؟“

”وہ تو ہو چکا کسی اور کا چاچی!“ وہ دکھ سے ان دونوں
کو دیکھے کئی کب میرے پاس واپس آجائے تب بھی
میرا ہونکر نہیں رہے گا۔ میں نے تجھے کہا تھا تیسری
زہرہ بھلے زیادہ حسین ہو، لیکن یہ عورت تو سادہ ہے
اور تجھے حشر کرنا کہاں آتا ہے؟“

”تو غم نہ کر، یہ چند دنوں کی مہمان ہے پھر چلی جائے
گی۔“ لکڑیاں آگ پکڑنے لگیں تو چاچی نے ہاتھ پہ
پھیلائی روٹی گرم تو ہے یہ ڈال دی۔

”اور پھر صدیوں وہ اسی کا سر رہے گا۔“ اس نے
دل میں کہا۔ پھر سرخ موڑ کر چاچی کو دیکھا، وہ اب تو
سے اترتی روٹی کو پکڑے سے دبا رہی تھی۔
”کسی کو جیتا کیسے جاتا ہے؟“

”پنڈل ہار کر۔“

”اور دل کیسے ہار جاتا ہے؟“

”اپنی ذات کو مٹی میں ملا کر۔“

”اور اگر تب بھی وہ نہ ملے جس کی تمنا کی ہو تو...؟“
”تو صبر کر لیا جاتا ہے میری دھی! اللہ کسی کی
ریاضت کو راز نگاہ نہیں کرتا۔“ روٹی جگہ جگہ سے
سنہری ہونے لگی تو چاچی نے اسے اتار دیا۔

زہرہ گردن موڑ کر پھر سے دونوں کو دیکھنے لگی۔ بدر
کتے کو پیچھے لے کر جا رہا تھا، کیونکہ مایا دور کھڑی تھی۔
شاید شیر و اس دیکھ کر بہت زیادہ بھونکنے اور غرانے
لگا تھا۔

زہرہ کو یاد آیا، شیر و اسے دیکھ کر کبھی نہیں غریبا تھا۔
شیر و کو زہرہ کی عادت تھی، جانے کیسے بدر اپنے ارد گرد
کے لوگوں کو مایا کی عادت ڈالے گا۔

نادر شاہ نے بیل کی ایک کٹنی کو بلا بھیجا تھا۔

نام تو جانے کیا تھا اب تو لوگ اسے جھمن ہی کہتے تھے۔ رشتوں کے پیغام ادھر ادھر لے کر جاتی تھی، لڑکے لڑکیوں کے درمیان خطوں کے تبادلے کراچی، جہاں کسی نے کسی سے ملنا ہوتا وہاں پہرہ دیتی۔ تھے تحائف ادھر ادھر اسے ہر گھر کی فکر، ہر معاشرے کی خبر ہوتی تھی۔

جھمن فوراً ہی حاضر ہوئی تھی۔

”حکم حضور! آج بڑے دنوں بعد ہماری یاد آئی۔“ وہ ہاتھ جوڑے بولی تو نادر شاہ نے گویا ناک سے مکھی اڑائی۔

”فضول باتیں چھوڑو، تم سے ایک خاص کام ہے۔“

”حکم کیجیے حضور!“

”تو بتاؤ۔“ وہ کچھ سوچتا ہوا کرسی پر آگے کو ہوا۔ ”یہ ملکوں کی دھمی زہرہ کیسی لڑکی ہے؟“

جھمن نے آنکھیں گھمائیں۔ ”پورے گاؤں میں اس سے سندر لڑکی کوئی نہیں ہے ایسی موہنی صورت، سلیقہ شعار اور سب سے بڑھ کر پاکیزہ اور پاکیزہ اور۔“

”نہ جی نہ وہ بڑی پکی لڑکی ہے۔“ جھمن رازداری سے بتانے لگی۔ ”ایک دفعہ میں نے کوشش کی تھی۔ شمس الدین کے بیٹے کا خط لے کر گئی تھی۔“ اس نے ایک زمین دار کا نام لیا۔ ”مگر نہ جی، ایسی پکی اور کراچی لڑکی ہے، نہ صرف خط میرے منہ پہ دے مارا بلکہ درانتی اٹھا لائی اور بولی میرا گلا کاٹ کر اپنے کتے کو کھلا دے گی، اگر پھر بھی ادھر آئی تو۔“ شمس الدین کے الو کے سچے بیٹے کو بتا دینا کہ بدرغازان کی منگ کی طرف ٹیڑھی آنکھ بھی کی نا تو اچھا نہیں ہوگا۔ میں تو بس برقع اٹھا کر بھاگ ہی پڑی۔“

”تو شمس الدین کے بیٹے نے کیا کہا؟“

”اجی ملک بدر سے تو سب ڈرتے ہیں، رعب و ہرہ بھی تو کم نہیں ہے۔ وہ تو توبہ کرنے لگا جب اسے علم ہوا کہ وہ بدر کی منگ ہے ورنہ گاؤں والے تو اس بات سے عموماً لاعلم ہی تھے ناجی۔“

ایک کٹنی کے منہ سے بدر کی سائنس نے ٹھوس اندر کرواہٹ گھول دی۔

”کب ہوا تھا ان کا رشتہ؟“ وہ ناگواری چھپاتے پوچھنے لگا۔

”بچپن کی بات ہے جی، اب تو سب کو علم ہو چکا ہے۔“

”زہرہ کے ماں باپ؟“

”نور پور میں رہتے تھے، دریا کے کچے پہ گھر تھا۔ وہاں سیلاب آیا تو سب بہہ گئے، بس یہ بچی کی سوہدرا سیوا سے گھر لے آیا۔ تب سے اس کو بیٹی بنا کر رکھا ہے۔“

”اچھا، ایک اور بات بتاؤ؟“ وہ لفظ ہر سرسری انداز میں استفسار کرنے لگا۔ ”یہ میم صاب کیسی عورت ہے۔“

جھمن نے برا سامنہ بنایا۔ ”وہ تو پھکی میم ہے جی۔ عجیب مزاج عورت ہے۔ راجپوتوں کے ایک لڑکے نے جو تھا کروں کا دور پار کا رشتہ دار ہے، اس کے لیے پیغام بھیجا۔ (ساتھ میں سونے کا ہار بھی تھا) تب کی بات سے جب تھا کر شیکہ زندہ تھا۔ میں نے پیغام لا دیا۔ وہ کتاب پڑھ رہی تھی۔ اس نے کھول کر پڑھا، اچھا کہہ کر سر ہلایا اور سونے کا ہار نوکرانی کی گود میں ڈال دیا۔ اور پھر سے لگی پڑھنے۔ میں نے جواب کا پوچھا تو بولی کھل آتا۔ میں اگلے روز گئی اور جواب پوچھا تو مجھے اندر تھا کر شیکہ کھد کے پاس لے گئی اور رقعہ اس کے سامنے رکھ کر ایسی معصومیت سے بولی۔ ”یہ عورت کل لائی تھی، بڑھ کر بتا دیں، میری تو سمجھ میں نہیں آیا۔“ حالانکہ رقعہ انگریزی میں تھا، اور پھر نہ پوچھو تھا کرنے میرا کیا حال کیا۔“

”یہ بتاؤ۔“ نادر تفصیل سے آگے کر بولا۔ ”اس کا بدر کے ساتھ کیا چکر چل رہا ہے؟“

”اے جی!“ جھمن کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ”چکر ہی تو چل رہا ہے۔ صبح شام ساتھ ساتھ پھر رہے ہوتے ہیں، دیکھ بیجیے گا۔ یہ فرنگی میم اسے کہیں کا نہیں چھوڑے گی۔“

”تمہیں لگتا ہے اب بد زہرہ سے شادی کر لے گا؟“ اس نے وہ بات پوچھی جس کے لیے اس نے کٹنی کو بلوایا تھا۔

”ہاں جی۔ ضرور کر لے گا۔“

”مگر وہ تو میم صاب سے... نادر شاہ کو جھٹکا لگا۔“

”ارے یہ میمیں کہاں تکتے والیاں ہوتی ہیں، آج نہیں تو کل یہ یہاں سے چلی جائے گی، اجی کبھی تو فرنگی دفع ہوں گے نا! اور شادی تو آخر میں بد زہرہ سے ہی کرے گا۔“

”وجہ؟“ اس کا لہجہ سرد ہو گیا تھا۔

”شاہ صاب! ان کے ہاں شادیاں خاندان میں ہوتی ہیں اور زہرہ کے جوڑ کا اور کوئی اس کے خاندان میں نہیں ہے۔ دوسرے بد زماں کی بہت مانتا ہے وہ ماں کو دکھ نہیں دے گا، شادی زہرہ سے ہی کرے گا، نہ کی تو زہرہ کہاں جائے گی؟ وہ خاندان سے باہر شادی نہیں کرتے؟“

”کون؟ کون نہیں کرتے؟ زہرہ کی تو ماں پہو ہی نہیں ہے اور ملکانی ٹھہری عورت ذات۔ کون فیصلہ کرے گا کہ بدر سے نہ ہوئی تو زہرہ کی شادی کس سے کرنی ہے؟“

”بدر خود فیصلہ کرے گا، اس کا باپ تو کتنی برس ہوئے خاندانی جھگڑے میں قتل ہو گیا تھا، اب ہی تو وہ ولایت سے تعلیم ادھوری چھوڑ کر آ گیا تھا، اب وہی تو ہے اپنے خاندان کا بڑا اور بدر کے ہوتے ہوئے زہرہ کی شادی کیسے کسی اور سے ہو سکتی ہے؟“

”اور اگر بدر نہ رہے تو؟“ لا شعور میں تیرتے اس خیال نے شعور پہ دستک دی تو الفاظ پھسل پڑے، چھمن نے آنکھیں سکڑیں تو وہ سنبھل گیا۔

”اگر بدر بیچ میں نہ رہے اور میم سے شادی کر لی تب؟“

”ایسا نہیں ہو گا حضور، لکھی لی جیو۔“

”اچھا، ایک کام کرنا ہے تمہیں۔“

اور پھر چھمن کے جانے کے بعد اس کے ذہن میں اسی ایک فقرے کی تکرار گونجتی رہی۔

اگر بدر نہ رہے
اگر وہ بیچ میں سے نکل جائے

بی چھمن اپنا برقع سنبھالتی، خادمہ کے پیچھے اندر برآمدے میں داخل ہوئی تو ماتھے پہ ہاتھ کا چھبانا کر دیکھا کہ کیا منظر ہے اور منظر میں موجود ہر شخص اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

چارپائی پہ بیٹھی سبزی کاٹی چاچی نے چھری رکھ دی تھی۔

کسی زمین کے کاغذوں سے کچھ پڑھتا بدر صفحہ پلٹتے پلٹتے رک گیا تھا۔

برآمدے کے ستون سے ٹیک لگائے چڑیوں کو باجرہ ڈالتی زہرہ نے گردن اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

”سلام ملکانی، کیسی ہو؟ ٹھیک تو ہو؟“ وہ ماں چپاتی، برقع پکڑے اندر داخل ہوئی تو بدر نے ایک ناگوار نگاہ اس پہ ڈال کر ماں کو دیکھا، چاچی نے حیرت سے شانے اچکاکے کہ وہ لاعلم تھی۔

”ہاں چھمن! کو کیسے آنا ہوا؟“ چاچی کا لہجہ محتاط اور روکھا سا تھا۔ چھمن جیسی بد کردار اور بدنام عورت کا ان کی حویلی میں اچھا سواگت ناممکن بات تھی۔

”ارے بیٹھنے کو نہیں، کو کی؟ سلام چھوٹے ملک۔“ چارپائی پہ بے تکلفی سے بیٹھتے نگاہ بدر پہ پڑی تو جھٹ سلام جھاڑ دیا۔ اچھا ہی ہوا کہ وہ ادھر ہی تھا، داروغہ جی نے یہ ہی تو تاکید کی تھی کہ ساری بات چیت اس کے سامنے ہونی چاہیے۔

اس کے باپ کو مرے عرصہ ہو گیا تھا، لیکن گاؤں والے اسے آج بھی چھوٹا ملک ہی کہتے تھے۔

”کیا کام ہے؟“ ماں کے بولنے سے قبل وہ بول پڑا۔

”بہت گرمی پڑ رہی تھی آج، لائے میں تو گھڑی بھر میں پسینہ پسینہ ہو جی ہوں۔“ وہ برقع ایک طرف رکھتی، آٹھل درست کرنی تمہید کی غرض سے یوں بولی جیسے برسوں سے میل ملاقات ہو۔

وہ جیسے ضبط کر کے رہ گیا۔ کاغذات ایک طرف

کھکا دیے۔

زہرہ قدرے پریشان سی ہو گئی تھی، عرصہ پہلے جھمن اس کے لیے کوئی رقعہ لائی تھی، جانے اب کیوں آئی تھی، کہیں چاچی اور بدر اسے ہی تصور وار نہ سمجھیں؟ اللہ عزت رکھنا۔

”کوئی کام تھا؟“ چاچی جیسے آگیا گئی تھی۔ جھمن خواجہ دیر کے جاری تھی، کبھی برقع اوڑھ کر کرتی تو کبھی پینٹ پوچھتی۔

”آں ہاں، بڑا خاص کام تھا، اسے ذرا پانی تو پلاؤ، قسم سے بڑی گرمی ہے۔“

”جو بات کر رہی ہے، جلدی کرو اور اپنا راستہ پکڑو۔“ بدر بات کاٹ کر سختی سے بولا تو جھمن گڑبگڑ گئی۔

”آں ہاں وہی وہ اپنا۔“ پھر ٹھہر کر جیسے الفاظ مجتمع کیے۔ ”ساتھ والے گاؤں کے رئیس ہیں، انہوں نے رشتہ بھجوا لیا ہے۔“

”کس کا رشتہ؟“ چاچی نے حیرت سے چھری رکھی۔

”مہنی۔ اپنی زہرہ کا۔“ چاچی کے چہرے کے بدلنے تاثرات دیکھ کر اس کی زبان لڑکھڑا گئی۔ باجرے کے دانے اس کے ہاتھ سے گرے تھے۔

چاچی کے تو مانو سر پہ لگی تلووں پہ بھیجی۔

”ناں ان کی ہمت کیسے ہوئی رشتے کی بات ڈالنے کی؟ جانتی نہیں ہے تو۔ بتایا نہیں تھا ان کو کہ چڑھی نہ ماریں؟ زہرہ تو بدر کی سنگ ہے۔“

”ہاں بتایا تو تھا لیکن۔“

”لیکن کیا؟“ بدر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

”لیکن وہ دراصل۔“ حالات ناموافق دکھائی دینے لگے تو وہ برقع دبوچ کر یوں چوکنی ہو بیٹھی کہ اگر جو مکالی

نے چھری پھینچ کر ماری تو بھاگ اٹھے گی۔ ”دراصل

گاؤں والے کہتے ہیں کہ چھوٹا ملک تو اب شاید میم صاب سے اس لیے انہوں نے رشتہ بھجوا۔“

اور بدر کی برداشت جواب دے گئی۔ میز کو ٹھوکر

مارتا وہ کھڑا ہوا۔ ”اٹھو!“

جھمن نے پریشان سی ہو کر بدر کو دیکھا۔

”چھوٹے ملک کل تو سن لو، بڑا اچھا رشتہ۔“

”میں نے کہا ہے اٹھو۔“

وہ اتنی زور سے دھاڑا کہ جھمن برقع پکڑے کھڑی ہو گئی، اسے علم ہوتا کہ ایسی بے عزتی ہوئی تو نادر شاہ کے پانچ روپے لیتی نہ اوڑھ آتی۔

”آئندہ اس حویلی کا رخ کرنے سے پہلے سود فہ سوچنا۔ اور اگر تم پھر کبھی زہرہ کے لیے آئے جیسے

بدر کردار لوگوں رشتہ لائیں تو میں تمہاری پونیاں گرا کے اپنے کتوں کے آگے پھینک دوں گا۔ دفع ہو جاؤ اوڑھ سے۔“

وہ دروازے کی چوکت سے جا لگی، مگر ملک، صہبہ جواب کیا دیں ان لوگوں کو۔“

”ان سے کہو ہمارے اوپر ابھی اتنا برا وقت نہیں آیا کہ تم جیسے بدنام لوگوں سے رشتہ جوڑ بیٹھیں جانے ہو جا۔“

اور وہ ”چھاچی“ کہہ کر کانوں کو ہاتھ لگاتی بھاگ کھڑی ہوئی۔

وہ غصہ سے کھولتا اسے جاتے دیکھتا رہا۔

زہرہ کی نگاہیں اسی پہ جمی تھیں۔ اس نے انکار تو

کر دیا تھا لیکن اس باعث کہ رشتہ ایک کئی کے توسط سے آیا تھا اور بات لاج کی تھی، خدا معلوم اپنے

جیسوں کا رشتہ ہی لائی ہوگی، بدر نے تو پوچھنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا کہ کس کا رشتہ تھا، لیکن اس نے ایک دفعہ

بھی یہ نہیں کہا تھا کہ وہ اس کی منگیتر ہے۔

زہرہ کے اندر کچھ زور سے ٹوٹا تھا، تو وہ بالآخر اس

رشتے کو بھلا چکا تھا۔

وہ خاموشی سے سر جھکائے اندر چلی گئی۔ چاچی۔

افسردگی سے اسے دیکھا۔

”اب تو گاؤں کے لوگ بھی کہنے لگے ہیں کہ تو میم صاب۔“

”بھائو میں گئے لوگ۔ آئندہ اس عورت کو اندر

داخل ہونے دیا تو اچھا نہیں ہوگا۔ شریفوں کا گھر ہے

یہ۔ رہ گئی زہرہ تو بھلے میری اس کی شادی ہو یا نہ ہو۔

انتا خود غرض نہیں ہوں کہ کسی بوجھ کی طرح اسے سر

سے اتار دوں، ایسے لوگوں کا رشتہ قبول کر لوں۔“
کھوتا ہوا تادہ باہر نکل گیا۔ چاچی تاسف سے سر
جھکائے سبزی کاٹنے لگی۔

”وہ کتنا ہے اتنا برا ویلا نہیں آیا ہم یہ کہ بدنام
بدکردار لوگوں میں رشتہ کر بیٹھیں، زمانہ تھو تھو کرے
گا ہم، بے عزت کر کے نکال دیا جی۔ توبہ توبہ۔“
چھمن نادر شاہ کے دفتر میں کرسی پر آلتی پالتی مارے
بیٹھی، پان چباتے ہوئے عادت سے مجبور ہر سچاڑھا کر
بتا رہی تھی۔

”تو نے بتایا کہ کس کا رشتہ ہے؟“

”مارے نہیں جی، انہوں نے موقع ہی نہیں دیا۔“
”ٹھیک ہے، رشتے کا تو معاملہ تھا ہی نہیں، اصل
بات تو ملک بدر کا میم صاب کے نام پہ بھڑکنا سننا تھا،
تو نے اچھا کام کیا۔“

اور اس کے جانے کے بعد ساری باتیں نادر شاہ کے
ذہن میں پھر سے گونجنے لگیں۔

”بدکردار بدنام لوگ۔“

وہ ایک فیصلہ کر کے کھڑا ہوا۔ ”اب یہ تو وقت
بتانے کا ملک بدر غازان کہ بدنام کون ہوتا ہے اور زمانہ
کس پہ تھوکتا ہے۔“

پھر باہر آکر ایک المکار کو بلایا۔ ”چھوٹے ملک کی
زمینوں پر جاؤ، کھمدار کو ڈھونڈو اور اس سے کہو کہ
چھوٹے ملک کو بولے، نادر شاہ رات کو نہر پہ تمہارا
انتظار کرے گا۔ جلدی آجانا، ضروری کام ہے، خود یہ
پیغام اسے نہ دینا، کھمدار کے ہاتھ یا اس کے کسی
دوسرے ملازم مزارع کے ہاتھ کھلوانا، سمجھ گئے؟“
اس کا ذہن ایک نئی سوچ کے تانے بانے بن رہا
تھا۔

جس وقت اسے پیغام ملا، وہ کام سے گاؤں سے باہر
جا رہا تھا، سن کر سوچا، کیا کام ہو سکتا ہے نادر شاہ کو جو
اسے یوں بلوایا ہے؟ اسے آخری ملاقات میں نادر شاہ

کا دل الب و لہجہ یاد تھا، لیکن پھر یہ سوچ کر نظر انداز کر دیا
کہ شاید اسے اپنی غلطی کا احساس ہو وہ شرمندہ ہوا اور
تعلقات میں آئی سرد مہری ختم کرنا چاہتا ہو۔ ٹھیک ہے،
چلا جاؤں گا۔

گاؤں کی حدود ختم ہوتے ہی گھٹنا جنگل تھا، جس کے
بیچ سے سڑک گزرتی تھی۔ وہ جنگل بھی نیلی کا ہی تھا۔
اس سڑک پہ قدرے آگے اس نے کئی روز گزرے،
مایا کی بھٹی کو روکا تھا۔ گھوڑا سپرٹ دوڑاتے اسے وہ
واقعہ یاد آگیا تو یوں یہ آپسی مسکراہٹ بکھر گئی۔
وہ انجان فرنگی لڑکی اب اس کے دل و جان کا حصہ
بنی جا رہی تھی، اسے یاد آیا، دو روز گزر گئے وہ اس سے
نہیں ملا۔ اس نے وجہ یاد کرنے کی سعی کی تو مایا کی آواز
سماعت میں گونجنے لگی۔ وہ سر جھٹک کر رہ گیا، گھوڑا
آہستہ کر دیا۔ اتنا اسے سوچنے لگا تھا کہ اس کی آواز
جنگل میں بھی سنائی دیتی تھی اور۔۔۔

ایک دم اس نے گھوڑا روک دیا۔ وہ وہم نہیں تھا،
اسے حقیقتاً مایا کی آواز جنگل کے درختوں سے
نکراتی سنائی دے رہی تھی۔

زور زور سے ماری گئی تین چیخیں۔

وہ چلا رہی تھی۔ وہ جست لگا کر گھوڑے سے اترا
اور آوازی سمت کا اندازہ کر کے اس طرف دوڑا۔

سڑک کے قریب ہی چند درختوں کے درمیان
اسے وہ نظر آئی۔

وہ شاخیں ہٹاتا، پتوں پہ پاؤں رکھتا اس کی طرف لپکا
اور سامنے کا منظر دیکھ کر اس کا خون کھول اٹھا۔

وہ درخت سے لگی تھی، اور ایک آدمی اس پہ جھکا
تھا، مایا کی گردن اس کے ہاتھ میں تھی، اور وہ انگریزی
میں مغلظات بکے جا رہا تھا۔

”چھوڑو مجھے۔۔۔ میں پولیس کو بتا دوں گی کہ تم۔۔۔“

”ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو تمہیں زندہ زمین میں
گاڑوں گا۔“

اس کی گردن دبوچے ہوئے ایک جھٹکا دیا تو وہ زور
سے چیخی، پھر نگاہ اس شخص کے کندھے پر سے ہوتی
ہوئی پیچھے کھڑے بدرپہ پڑی۔

سوچ کر نظر انداز کر گیا
ہو وہ شرمندہ ہو اور
ناچا ہوتا ہو۔ ٹھیک ہے

ناجنگل تھا جس کے
بھی نیلی کاہی تھا۔
نے کئی روز گزرے
نہ ڈالتے اسے وہ
ہٹ بکھر گئی۔

دل و جان کا حصہ
زر گئے وہ اس سے
تی کی تو مایا کی آواز
کر رہ گیا گھوڑا
کہ اس کی آواز

وہ وہم نہیں تھا
درختوں سے

ڑے سے اترا
دوڑا۔

کے درمیان

کی طرف پکا
تھا۔

اس پہ جھکا
روہ انگریزی

کہ تم...

ہنسن میں

یا تو وہ زور
سے ہوتی

”بدر! مجھے بچاؤ۔“ وہ چلائی، تو گھبرا کر اس آدمی نے
اس کی گردن چھوڑی اور پلٹ کر دیکھا۔
وہ جان کارلس تھا۔

وہ دونوں ہاتھوں سے اسے دھکیلتی تھا کہ بدر کے
پچھے آکھڑی ہوئی اور جیسے خوف زدہ ہو کر سختی سے اس
کا بازو پکڑ لیا۔

”یہ سی بہادر! میری بات کان کھول کر سنو۔“ وہ
اپنے غصے پہ قابو نہ آ سکا، انگلی اٹھا کر بولا۔ ”مگر آئندہ تم نے
اس عورت کی طرف نظر بھی ڈالی تو تمہاری سرکار کو
تمہاری لاش بھی نہیں ملے گی۔ چلو۔“ مایا کو کہنی سے
پکڑے، جان کارلس کے حق چرے پہ ایک تہر آلود نگاہ
ڈالتا، اسے جنگل سے نکال لایا، گھوڑے پہ اپنے پیچھے
بٹھایا اور اڑھ لگا دی۔

گھوڑا اتنا تیز دوڑ رہا تھا کہ اس نے بدر کے شانے
اور کمر کو مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ وہ بالکل خاموش
گھوڑا دوڑا رہا تھا، راستہ وہی تھا جو گاؤں سے باہر جاتا
تھا۔ وہ واپس گاؤں نہیں جا رہے تھے، مگر اس نے ایک
دفعہ بھی نہ پوچھا کہ اسے کدھر لے کر جا رہا ہے، بس وہ
بے آواز رو رہی تھی، اور جب اس کی سسکیاں
چکیوں میں بدلنے لگیں تو اس نے گھوڑا روک دیا اور
نیچے اتر آیا۔

”او، نیچے آجاؤ۔“ وہ اکیلی گھوڑے کی پیٹھ پہ بیٹھی
رو رہی تھی، بدر کو اس پہ ترس آیا۔ اس نے پکٹی دفعہ
اسے روٹے دیکھا تھا۔ اور اس کا دل دکھا تھا۔

”مایا! نیچے اترو۔“ نرمی سے کہہ کر اس نے ہاتھ
بڑھایا، وہ اسی طرح سسکیوں سے روتی بدر کا ہاتھ تھام
کر شانے کا سہارا لیے سڑک پہ نیچے اتر آئی۔ دونوں
اطراف میں گھنا جنگل تھا۔

”اوہر آجاؤ۔“ بدر نے ایک ہاتھ سے لگام تھامی
’دوسرے سے اس کا کندھا اور اندر درختوں کے بیچ
لے آیا۔

اونچے درختوں کے درمیان ایک قطعہ خالی تھا
سوکھے تھے اوہر گرے تھے، شاید کوئی درخت طوفان
سے ڈھے گیا تھا، جسے بعد میں مجھے والے اٹھا کر لے

گئے تھے اس کا ایک فٹ ٹاکٹر اٹھا۔

اس نے لگام چھوڑ دی، گھوڑا اوہر اوہر گردن
جھکائے کھاس میں منہ مارنے لگا۔ وہ مایا کو تسلی دیتا
شانوں سے تھامے کئے تھے تنک لایا اور بٹھا دیا۔

”آرام سے بیٹھو اور مجھے ساری بات بتاؤ۔“
وہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپائے روتی ملکیتی ہوئی
تھے۔ بیٹھی تھی، اور وہ بچوں کے بل اس کے سامنے
اس کے ہاتھ تھامے بیٹھا تھا۔

”مایا! خدارا، مجھے بتاؤ کیا ہوا تھا، تم اوہر کیوں گئی
تھیں؟ یہ سی اوہر کیوں؟“

اس کی بات ختم ہونے سے پہلے اس نے گیلیا چرو
اٹھایا۔

”بدر! شیکھو کہ جان کارلس نے قتل کیا ہے۔“
”کیا کہہ رہی ہو؟“ وہ ہکا بکا رہ گیا۔

”مجھے کھوجی اس روز ایک کھرا دیکھانے لے گیا تھا۔“

جو اس شخص کا تھا جو شیکھو سے بچے راستے پہ آخری
دفعہ ملا تھا۔ میں نے وہ کھرا دیکھا اور جب اس کھرے کو
چھوڑتے قدم دیکھ کر سر اٹھایا تو جان کارلس جا رہا تھا۔
میں نے کسی سے ذکر نہیں کیا، بس خاموشی اختیار کر لی،
مجھے لگا کھوجی کو غلط فہمی ہوئی ہے، لیکن اس رات جان
کارلس کو قبرستان میں دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ اس کا
یقیناً ”اس معاملے میں ہاتھ ہے، وہی شیکھو کے قتل
میں سب سے زیادہ دلچسپی لے رہا تھا، وہی ہے جو
شیکھو سے آخری دفعہ ملا تھا۔ میں اس روز تو خاموش
رہ گئی، مگر آج جب وہ مجھے راستے میں ملا تو میں نے
کھرے کا ذکر کر دیا۔ وہ مجھے ایک ضروری بات بتانے
کے لیے اوہر لے آیا اور پھر۔“ وہ پھر سے رونے لگی۔
”اس نے اقرار کیا اس نے شیکھو کو مارا ہے؟“

”نہیں۔“ وہ سسکیوں کے درمیان بمشکل بول

رہی تھی۔ ”میں نے کہا اس نے قتل کیا ہے تو وہ

بجائے انکاری ہونے کے مجھے مارنے کی دھمکیاں

دینے لگا، میری گردن دبوچ لی، میں چلانے لگی تو تم

آگئے، بدر! اس درندے نے شیکھو کو مار ڈالا ہے
شیکھو نے اس کا کیا بازو اٹھا؟ وہ تو بہت بڑبان تھا بہت

اچھا، بہت مخلص انسان تھا وہ اس کو کیوں؟ وہ بچوں کی طرح ہلک رہی تھی اور بدر کے لیے اس کو چپ کرانا مشکل ہو رہا تھا۔

”ایسا یہ بات کافی پیچیدہ ہے، جان کارلس کو ادھر آئے دو روز ہی گزرے تھے جب شیکھر کا قتل ہوا۔ اس کی شیکھر سے کیسی شناسائی تھی کہ دو روز میں ہی کوئی جھگڑا بھی ہو گیا۔ یقیناً یہ لمبی کہانی ہے، کیونکہ اگر کارلس وہ بھوت ہے تو منگل سنگھ نے مرتے وقت شیکھر کا نام کیوں لیا تھا؟ تھا کہ شیکھر اور کارلس میں کوئی گہرا تعلق ضرور ہے۔ کیا تمہیں بھی شیکھر نے کارلس کے بارے میں بتایا تھا۔“

”مجھے کچھ نہیں پتا۔“ وہ ماتھے پر ہاتھ رکھے ابھی تک روئے چلے جا رہی تھی۔ ”مجھے لگتا ہے شیکھر آج مرا ہے، ابھی میرے ہاتھوں میں دم توڑا ہے اس نے۔ بدر! اس درندے نے اسے مار ڈالا ہے، میں جانتی ہوں۔“

”آرام سے ملایا! اس نے ہوئے سے اس کا ہاتھ دبا لیا۔ پھر گردن اٹھا کر اونچے درختوں کے درمیان جھانکتے نارنجی سورج کو دیکھا، جو ڈوبنے کو تھا۔ کچھ دیر میں شام ڈھل جائے گی، ہمیں واپس چلنا چاہیے۔ اندھیرے میں یہ جگہ خطرے سے خالی نہیں ہوئی۔ میں تمہیں ادھر اس لیے لایا تھا کیونکہ اب گاؤں میں سرعام ملنا مناسب نہیں لگتا، آؤ شاہاں۔“

وہ کھڑا ہوا تو ملایا بھی آنسو صاف کرتی کٹے تنے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اب وہ خود کو قدرے سنبھال چکی تھی، سو بدر کا ہاتھ نہیں پکڑا تھا، بس گھوڑے کی لگام پکڑ لی۔ گھوڑا تابعداری سے اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا تو وہ مسکرا دیا۔

”یہ تمہیں پہچاننے لگا۔“

وہ آنسوؤں سے بھیگے چہرے سے مسکرا دی۔

”اسے میری عادت جو ہو گئی ہے۔“ آج وہ بدر کو بہت مختلف لگتی تھی، اپنے جیسی عام سی سا وہ سی لڑکی، وہ ملکہ والی تمکنت، غرور اور شان بے نیازی آج اس میں مفقود تھی، جس سے وہ اسے اپنی پہچان سے بہت دور

لگتی تھی۔

”تم کہاں جا رہے تھے؟“

”ساتھ والے گاؤں، کچھ کام تھا، لیکن اب نہیں رہا۔ اب واپس چلنا ہوں۔“

”اوہ! میں نے تمہارا وقت ضائع کیا، لیکن بہت نہیں ہوئی، تم اب بھی مجھے چھوڑ کر واپس جاسکتے ہو۔“ وہ دونوں سر دک پہ آگئے تھے، گھوڑا ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

”نہیں، کل چلا جاؤں گا، آج رات یہاں میں کم ہے۔“

”کیسا کام؟“ وہ رک کر اسے دیکھنے لگی، آنسو اب خشک ہو چکے تھے۔

”کچھ خاص نہیں، نادر نے بلوایا ہے، آؤ بیٹو، ہاتھ آگے کیے اسے بٹھانے کا منتظر تھا، اس کے بعد اسے چڑھنا تھا، مگر اس نے اس کا ہاتھ نظر انداز کر دیا۔“

”نادر شاہ نے کیوں بلوایا ہے؟“

”یہ تو نہیں پتا، جا کر پوچھوں گا۔“

وہ چپ چاپ متفکری اسے دیکھنے لگی۔

”کیا ہوا لایا؟“

”تم نادر شاہ پہ کتنا بھروسہ کرتے ہو؟“

”وہ میرا دوست ہے۔“

”وہ تو تھا کروں کا بھی دوست ہے، کوئی سچا اور مخلص دوست آپ کے دشمن سے دوستی نہیں کاٹھتا۔ اس روز وہ حویلی آیا بیٹھا تھا، تمہارا ذکر کر رہے تھے، تمہارے خلاف کوئی کچھڑی پک رہی ہے، میں پوری بات نہیں سن سکی، مگر وہ باب، بیٹا نادر شاہ کو رخصت کر کے بہت خوش تھے کہ آنسوؤں نے تمہیں چت کر دیا۔“

”ہوں! اندازہ تو مجھے بھی ہے، خیر دیکھتے ہیں۔“ اس کے انداز میں، نوز لا روائی تھی۔

”بدر! وہ کسی انجانے خوف کے زیر اثر ہوئی۔“

”مت جانتا۔“

”کیوں؟“

”وہ تمہیں نقصان پہنچا سکتا ہے۔“

تھا، لیکن اب وقت

آج کیا، لیکن بہت دیر
واپس جاسکتے ہو۔
اڑاساتھ ساتھ چل

رات بلی میں کام

نے لگی، آنسو اب

ہے، تو بیٹھو۔ وہ
تھا، اس کے بعد
نظر انداز کر دیا۔

تھی۔

کی سچا اور مخلص
ن کا تھا۔ اس
کر رہے تھے

ہے، میں پوری
شاہ کو رخصت
نہ تمہیں چیت

ہتے ہیں۔ اس

ر اثر بولی۔ تم

”ہی ذات اللہ کی ہے، تم کیوں فکر کرتی ہو، پھر وہ
بنا تھا کروں کا دم بھرے، میرا وہ بہت اچھا دوست ہے“
پلو بیٹھو۔

وہ متذنب سی اسے دیکھتی اوپر چڑھ گئی۔ وہ مطمئن
تھا کہ اس کی فکر میں اس نے کارنس والے واقعہ کو
زاموش کر دیا تھا۔
اسے حویلی کے باہر چھوڑنے لگا تو احتیاطاً پوچھ

”کیا تم کو یہاں کہاں ہے؟“

”دیکھا کہ گیا ہے، مگر واپسی رات تک ہو جائے
گی۔“ پھر ہلکا سا مسکرائی۔ ”کیا میں تمہارا شکریہ ادا
کروں۔“

وہ گھوڑے پہ بیٹھا تھا اور وہ گردن اٹھائے اسے دیکھ
رہی تھی۔
”مگر کیا تو مجھے لگے گا میں تمہارا اپنا نہیں ہوں اپنا
خیال رکھنا، خدا حافظ۔“ اس نے گھوڑا موڑا، پھر پلٹ

کر بولا۔ ”دور ہاں اب رونا نہیں۔“
”جھٹ۔“ وہ اثبات میں سر ہلا کر مسکرا دی۔ وہ
تھوڑی دیر گیا تھا کہ پیچھے سے پکارا گئی۔

”منو، کل شام کنویں پہ آجانا۔“
وہ ہلکا سا مڑا۔
”نہیں۔ اب بلی کے لوگ باتیں بنانے لگے
ہیں۔“

”بنانے دو، تم آجانا۔“
”چھا صبح آجائوں گا، شام میں دوسرے گاؤں جانا
ہے۔“

مائی نے مسکرا کر ہاتھ ہلا دیا۔ اور وہ اس خوشگوار صبح کا
تصور لیے گھوڑے کو ایزھ لگاتا وہاں سے چلا گیا جو بدر
غازان کے لیے کل نہیں آئی تھی۔



رات اس نے کھانا جلدی کھالیا۔
”کہیں جانا ہے؟ ابھی تو آیا تھا۔“ چاچی اس کو
جلنے کی تیاری پکڑتے دیکھ کر بکھلا سی گئی۔

”ہاں اماں! گھڑی دو گھڑی تک آجائوں گا، تم فکر نہ
کرنا سو جانا۔“ وہ شمال گردن کے پیچھے سے گزار کر
دونوں سرے آگے لے آیا، پھر جوتی پہنے لگا۔

”پر جا کہ ہر رہا ہے۔“ چاچی بے چین سی اس کے
ارد گرد پھر رہی تھی۔ ”کہیں پھر اس ڈائن کے پاس تو
نہیں۔“

”نادر کے پاس جا رہا ہوں، کچھ کام ہے۔“ پھر ماں کا
پریشان چہرہ دیکھ کر ہلکا سا مسکرایا۔ ”ماں! نہ فکر کر،
جلدی آجائوں گا۔“ اسے تسلی دے کر وہ باہر نکل آیا۔
اس کا رخ نہری طرف تھا۔

نہر گاؤں کے آخری سرے پہ تھی، جو شخص باہر
سے گاؤں آتا، وہ نہر کے ساتھ سے گزر کر آتا تھا، نہر
کے آگے گاؤں ختم ہوتا تھا اور وہاں سے جنگل کا آغاز
تھا۔ نادرنے اسے پہلے کبھی نہر کنارے نہیں بلایا تھا۔
کوئی خاص کام ہو گا۔

وہ سوچ کر جیسے مطمئن سا تھا۔
نہر کنارے درختوں کی قطار تھی، ان کے پیچھے
جھاڑیاں اور سرکنڈے آگے تھے۔ وہ نہر پار کر کے
جھاڑیوں تک پہنچا تو اسے نادروں کا بیٹھا نظر آیا۔

”نادر!“ وہ گرم جوشی سے مسکراتے ہوئے اور اس
سے ملے ملا۔ ”کیسے ہو؟“

اور وہ سلام کا جواب دیتے ہوئے اپنے اندازے کی
درستی پہ مسکرایا۔ (تو نادر شرمندہ تھا اور معذرت کرنا
چاہتا تھا۔)

”اور سنا یا ر! کتنے دن بیت جاتے ہیں تجھ سے
ملاقات نہیں ہو پاتی۔ میں خود کام میں اتنا مصروف رہا،
اس روز بھی تھیک سے بات نہیں کر سکا، بعد میں بڑا
افسوس ہوا۔“ وہ دونوں درختوں تلے ٹیک لگا کر بیٹھ
گئے تھے، نادر کی نگاہیں سامنے نہر کے اس پار راستے پہ
تھیں۔

”چھوڑ یا ر!“ اسے اس روز برا تو لگا تھا، مگر کسی کو
اپنی وجہ سے کیوں اتنا شرمندہ کرتا۔ ”اور سنا، تھاکروں کا
کیا حال ہے؟“

”برا کچھ گا!“ ہے ان کو شیکھو کے قتل کے سلسلے

میں، مگر نہیں مانتے، مجھے وہ بے قصور لگتے ہیں۔ میم صاحب کے پاس بہت سے گویاں ہیں اور وہ واقعی امر تشریف بھی ڈرنے سے شامل تفتیش کر لیتا۔
”مجھے وہ اس معاملے میں بے قصور لگتی ہے۔“ وہ کارلس کا شک گول کر گیا۔

”ہوں۔“ نادر مسلسل سامنے راستے پر دیکھ رہا تھا۔ بدر نے دیکھا ایک رومال میں لپٹا پستول اس کے ہاتھ میں تھا، جسے وہ عاتاً انگلیوں کے درمیان گھما رہا تھا۔
”تو آج کل کیا کرتا پھر رہا ہے؟“
”کچھ خاص نہیں، بس قبرستان والے بھوت کے پیچھے لگا ہوا ہوں۔“

”ارے چھوڑو، مجھے نہیں لگتا وہاں واقعی کوئی بھوت ہے۔“
”مجھے بھی نہیں لگتا کہ وہاں واقعی بھوت ہے، مگر میں جانتا چاہتا ہوں کہ وہ بھوت کا ٹانگ کرنے والا کون ہے۔“

”مجھے تو یہ اس جوگی کا کام لگتا ہے۔ بدر کا ایک چیلہ حکیم ماجد کے قتل کے کیس میں پکڑا گیا تھا۔ قبر سے کھوپڑی نکالنے گیا تھا۔ مجھے لگتا ہے یہ جوگی کوئی چلہ کاٹ رہا ہے، جس کے لیے اسے ایسی چیزوں کی ضرورت ہے۔ اور قبرستان میں کھدائی کے آثار ہیں۔“

پل بھر کو سر کے کنارے خاموشی چھا گئی، اتنی خاموشی کہ بدر کو لگان دونوں کے پاس الفاظ ختم ہو گئے ہیں۔ اور اگر ایسا تھا تو وہ ایک ساتھ کیوں بیٹھے تھے؟ کیا نادر نے اسے صرف اسی لیے بلایا تھا کہ اسے ساتھ بٹھا کر راستے پر نگاہ رکھ سکے۔
”تو نے مجھے بلایا کیوں تھا؟“

”آج رات اس راستے سے چند ری سنگھ نے گزرنا ہے، اس کے لیے ناکہ لگایا ہے۔“ چندری سنگھ ساتھ والے گاؤں کا ناہی گرامی ڈاکو اور فراری تھا۔
”وہ باقی انفری کدھر ہے؟“

”وہ پیچھے ناکا ہے، میں ادھر آ بیٹھا ہوں، تجھ سے ایک بات پچھنی کرنی تھی۔“ پھر رک کر تھج کی ”بلکہ

پوچھنی تھی۔“

”ہاں یوں۔“ بدر نے اس کا چہرہ دیکھا۔ نادر نے ایک گہری سانس لی، وہ ابھی تک راستے پر دیکھ رہا تھا۔

”آج بی چھمن تھانے آئی تھی۔“

”کیوں؟“ وہ ایک دم چونکا ہو گیا۔

”تو تو جانتا ہے، وہ ہماری مخبر ہے، ادھر ادھر کی خبریں لا کر دیتی ہے۔ اس نے آج ایک عجیب بات بتائی۔“
”کیا؟“ اس نے محتاط ہو کر سوال کیا۔

”اس نے کہا۔“ نادر نے سرخ اس کی طرف موڈ کر بغور اس کے تاثرات دیکھے ”کہ گویاں راج نے تمہاری سنگیتر کے لیے پیغام بھیجا ہے، رشتے کا پیغام۔“ وہ سناتے میں رہ گیا۔

”وہ پیغام گویاں نے بھیجا تھا؟ اس کی یہ ہمت؟ وہ جانتا نہیں کہ وہ ہندو ہے اور ہم مسلمان۔“ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح کا رد عمل ظاہر کرے، وہ پہلے حیران ہوا، پھر اسے غصہ آیا تھا۔

”وہ کتنا ہے وہ مسلمان ہونے کے لیے تیار ہے۔“
”دیکھ چکے ایسوں کی تبدیلی مذہب۔“ اس نے غصے سے سر جھٹکا۔ ”میں تو پوچھ ہی نہیں سکا کہ ایسا پیغام ڈالا کس نے ہے تو وہ گویاں تھا؟“

”تو نے انکار کیوں کیا، جب تجھے علم نہیں تھا کہ وہ گویاں کا پیغام ہے۔“

”جو یہ جانتے ہوئے بھی کہ زہرہ میری منگ ہے، ایک کٹنی کے ہاتھوں رشتہ ڈالے، وہ شخص اچھے قماش کا نہیں ہو سکتا۔“

نادر شاہ کے اندر جوار بھانا سا پکنے لگا۔ پستول اس کی انگلیوں میں ساکت ہو گیا۔

”مگر گویاں۔۔۔ اس کی یہ ہمت؟ اور وہ زہرہ کو کیسے جانتا ہے؟“

وہ غصے میں بھی تھا اور حیرت زدہ بھی۔

”جانتا تھا، جب ہی تو چند روز قبل زہرہ کو تھا کروں کی حویلی لے کر گیا تھا۔“ بدر طیش سے کھڑا ہو گیا۔
”کیا کبھی اس سے؟“

نادر شاید اطمینان میں روز قبل تھا کہ حویلی لے کے گئے اور۔۔۔

”اٹھائے بولا، اس تھا۔“ زہرہ کہیں ہے۔

”تمہیں میر تھی۔“ بدر سنا۔ ”نہیں نادر عزت بیچ چور اور اسی۔۔۔“

ست روی۔ نگاہ بدر کے اطمینان سے اور گولی چلا دی گھر سوار نے دو سری گر کر خون لگا۔ نادر۔۔۔

گئی۔ پھر اس بدر کی طرف ڈرا۔۔۔

”اؤں۔“

اس۔۔۔ چلا، مگر وہ دلی باتوں میں تھا کہ

”تیرا۔۔۔“

میں۔۔۔

گر آیا اور زہرہ۔۔۔

یقینی سی بے یقینی تھی۔ نادر جو بھی کہہ کر گیا تھا اس یقین کرنے کو اس کا دل نہیں مانتا تھا، بہت بڑا بوجھ تھا جو اسے اپنے کندھے جھکا تا محسوس ہوا تھا۔

درختوں کے پارتوں کے کھڑکنے کی آواز آئی تو اس نے چونک کر سر اٹھایا۔

دو گھوڑے سامنے سے چلے آ رہے تھے۔ ایک یہ نادر شاہ سوار تھا اور دوسرے یہ اس کا اے ایس آئی۔ تیسرا گھوڑا ان سے چند قدم پیچھے تھا۔ جس پہ ایک الہکار سوار تھا۔

”یہ تو ملک بدر ہے۔“ اس کی سماعت سے نادر شاہ کی حیران آواز نکل گئی۔ وہ اپنے اے ایس آئی سے مخاطب تھا۔

بدر نے اچھٹے سے اسے دیکھا۔ اسی پل تیسرے گھوڑے کا سوار الہکار جست لگا کر اتر اور لاش کی سمت گیا۔

”بدر!“ اب نادر شاہ دور سے جیسے آواز دے کر اسے پکار رہا تھا۔

”ہاں!“ بدر کہیں اس کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجی تھی۔ کہیں کچھ غلط تھا۔

”تو ادھر کیا کر رہا ہے؟“

”نہیں؟ تو نے ہی تو۔“ اس کا فقرہ ادھورا رہ گیا۔ تیسرا الہکار بھاگتا ہوا واپس آ رہا تھا۔

”شاہ صاب لاش وہیں بڑی ہے۔“ پھر بدر کو دیکھا اور نگاہ اس کے ہاتھوں کی طرف گئی جو خالی تھے۔

”پستول کدھر ہے؟“

اے ایس آئی بھی اتر کر آ گیا تھا۔ زمین پہ پڑا پستول اس نے ہی دیکھا اور جھک کر رومال سے اٹھایا۔

”یہ کیا کیا تو نے بدر؟ تو نے بندہ مار ڈالا؟“ نادر شاہ گھوڑے سے اتر کر اس کی طرف آیا اور بہت ششدر اور دکھ سے پوچھا۔

”میں نے؟ نہیں نادر۔“ وہ تیزی سے بولا۔ کہیں کچھ بہت غلط تھا۔ ”یہ تم نے مارا ہے، یہ چندری سنگھ ڈاکو تھا۔ تم تاکہ۔ یہ تمہارا پستول ہے۔ یہ میرا پستول نہیں ہے۔“ اے ایس آئی جو اس کا ہاتھ پکڑ رہا تھا

نادر شاہ اطمینان سے اٹھا۔ ”کیا تم نہیں جانتے کہ تین روز قبل تھا کہ تمہاری مکتبہ کو پہلا پہلا کراچی جو بی لے کے گئے تھے، دو تین گھنٹے ادھر رکھا بھی تھا اور۔“

”آگے ایک لفظ نہ بولنا نادر۔“ وہ لب بھیجے انگلی اٹھائے بولا، اس کا چہرہ شدت طیش سے سرخ پڑ گیا تھا۔ ”زہرہ کہیں نہیں گئی، تھا کروں نے بے پر کی اڑائی ہے۔“

”تمہیں میم صاب نے نہیں بتایا۔ وہ بھی تو ادھر تھی۔“ بدر سنا لے میں رہ گیا۔

”نہیں نادر! یہ جھوٹ ہے۔“ اسے لگا اس کی عزت بچ چور ہے یہ تار تار کر دی گئی ہے۔

اور اسی لمحے سامنے کچے راستے پہ ایک گھڑ سوار ست روئی سے گھوڑا چلاتا نمودار ہوا۔ نادر نے ایک نگاہ بدر کے سفید بڑتے چہرے پہ ڈالی اور پھر بہت اطمینان سے رخ سڑک کی طرف موڑ کر پستول اونچا کیا اور گولی چلا دی۔

گھڑ سوار اوندھا ہو کر گھوڑے کے سر پہ آن گرا، نادر نے دوسری گولی چلائی، اب کے گھڑ سوار نیچے زمین پہ گر کر خون میں لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ گھوڑا نہ ہٹانے لگا۔ نادر نے تیسری گولی ماردی تو زخمی کی حرکت رک گئی۔

پھر اس نے اسی اطمینان سے رومال میں لپٹا پستول بدر کی طرف بڑھایا جو چونک کر سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔

”ذرا پکڑنا، میں اتنے میں اے ایس آئی کو لے آؤں۔“

اس نے بظاہر عجلت میں پستول بدر کے ہاتھ میں دینا چاہا، مگر وہ اس پریشانی اور نادر کی ذہن کو ماؤف کر دینے والی باتوں سے ابتر ہوئی وہنی کیفیت کے باوجود اتنا ہوش مند تھا کہ جھنجھلا کر پیچھے ہٹا۔

”تیرا پستول ہے، میں کیوں پکڑوں؟“

”میں آتا ہوں۔“ نادر نے پستول ادھری زمین پہ گرا دیا اور تیزی سے ایک طرف کو نکل گیا۔

”زہرہ کو تھا کہ اپنی حویلی میں لے گئے؟“ عجیب بے

اس سے ہاتھ چھڑا کر وہ جیسے وضاحت دے رہا تھا۔
”میرا پستول؟“ نادر نے حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے پستول نکالا۔ ”میرا پستول تو میرے پاس ہے۔“

”نہیں۔“ اس نے ہتھکڑی لگانے کے لیے بڑھتے اے ایس آئی کے ہاتھ کو پھر جھٹکا۔ ”میں نے قتل نہیں کیا۔ میری بات سنو میں نے۔“
”بس کرو ملک! ہم سب نے دیکھا ہے۔ ادھر گولی کی آواز آئی، ادھر ہم آئے تو یہ پستول تیرے سامنے پڑا تھا تو نے بندہ مارا ہے، ہم سب جانتے ہیں۔“ اے ایس آئی نے ڈیٹ کر اس کے ہاتھ پہ ہتھکڑی لگا دی۔ وہ ساکت رہ گیا۔

یہ سب کیا ہو رہا تھا؟ وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔
”تو نے قتل کیوں کیا بدر؟ تو ایسا تو نہ لگتا تھا۔“ نادر شاہ بہت افسوس سے اسے دیکھتے آہ بھر کر بولا۔ ”اسے قتل لے چلو۔“ پھر ساتھیوں کو حکم دیا۔ ”اور جاؤ، جا کر دیکھو مرنے والا کون ہے؟ کس کو مارا ہے تو نے؟“
اب کے وہ کچھ نہیں بولا۔ اسے معلوم تھا۔ اب ساری وضاحتیں، ساری صفائیاں بے کار ہوں گی۔ وہ پھنس چکا تھا اور دور دور تک پچاؤ کا کوئی راستہ نہ تھا۔
”کیوں نادر؟“ وہ دکھ سے اسے دیکھے گیا۔ ”کیوں؟“
”تو میرا دوست تھا، پھر کیوں؟“ صدمہ، ”دکھ“ افسوس۔ وہ دوستی کی قبر پر فوج بڑھ رہا تھا۔ ”ہم تو اندھیرے جنگلوں کے ساٹھی تھے، پھر کس نے الگ کر دیا ہمیں؟“

”دوست تھا، لیکن تو نے قتل کیا ہے، میں قانون کا محافظ ہوں، قانون کیسے توڑوں؟ ہاں، ابھی لاش کی شناخت ہوئی؟“

وہ بے گانہ سا ہوا اپنے ساتھی سے پوچھ رہا تھا۔

”جی صاب، شناخت ہو گئی ہے۔“

”کون تھا مرنے والا؟“

”ٹھاکروں کا لڑکا گویا تھا۔“

”نادر! تو نے اچھا نہیں کیا۔“ اس نے بے بسی اور نفرت سے نادر کو دیکھا، اس نے بے نیازی سے شانے

اچکا دیے، اور تب بدر نے دیکھا، نادر کے پیچھے درختوں کے بیچ ایک ہیولہ سا حرکت کر رہا تھا۔

اے ایس آئی اور دوسرے اہلکار اسے لے کر چل پڑے تو وہ خاموشی سے چلتا رہا۔ چند قدم آگے جا کر اس نے کن کنکھوں سے دیکھا، وہ ہیولہ اب اٹھ کھڑا ہوا تھا اور جھکا جھکا سا ایک طرف کو تیزی سے چل رہا تھا۔ اس کا سیاہ چنڈ پھر پھڑپھڑا رہا تھا۔ اگلے ہی پل وہ درختوں کے اس پار اندھیرے میں گم ہو گیا تھا۔
تو یہ تھا قبرستان کا بھوت۔

ایک نسلی بخش احساس نے اس کی ڈھارس بندھائی۔

کوئی تھا ادھر جو اس کی بے گناہی کا گواہ تھا۔



رات کا تیسرا پہرا ابھی باقی تھا، جب نیچے سے شور سنائی دینے لگا، اوچی اوچی عورتوں کے رونے کی آوازیں، ماتم مہین۔

اس نے لحاف پھینکا، پلنگ کے پردے ہٹائے، نیچے اترتی، اور جوتے پہنے بغیر ہی شنگے پاؤں دروازہ کھول کر باہر آئی۔

سیڑھیوں کے اوپر کھڑے اس نے دیکھا، نیچے بڑے کمرے میں، راجپوتوں کی دور قریب کی رشتے دار عورتیں جمع ہو رہی تھیں۔ بلند آوازیں، آہوں کا اونچے ٹین۔

”کیا ہو رہا ہے یہ؟“ اس نے کوفت سے بلند آواز میں پوچھا تو ایک لمحے کو سناٹا چھا گیا، بہت سی گردنیں اوپر کو اٹھیں، جہاں وہ کھڑی تھی۔

گلابی ریشمی شب خوابی کا لباس پہنے بیٹے بہ ہاتھ پاندھے وہ بے زاری سے نیچے دیکھ رہی تھی۔ سترے بالی شانوں پہ بکھرے تھے اور موتیوں سے روٹی لٹ دائیں کندھے پہ آگے کو بڑی تھی۔ ستواں ناگ چڑھا رکھی تھی اور پیشانی شکن آلود تھی۔

”بدر غازان نے گویا کو قتل کر دیا ہے۔“ ایک نسبتاً ادھیڑ عمر ٹھاکرا سن بولی اور آچل میں منہ

نادر کے پیچھے دور
رہا تھا۔
اسے لے کر چل
رم آگے جا کر اس
بائٹھ کھڑا ہوا تھا
سے چل رہا تھا۔
نائل وہ درختوں

کی ڈھارس
تھا۔

نیچے سے شور
نے رونے کی

ہٹائے نیچے
رازہ کھول کر

دیکھا نیچے
لی رشتے دار
ہو بکا او نیچے

بلند آواز
ی گردنیں

ہنے یہ ہاتھ
سنہرے
روٹی لٹ
ناک چڑھا

ایک
میں منہ

چھپائے رونے لگی۔ دفعتاً سارے میں ماتم کنال
آوازیں پھر سے گونجنے لگیں۔
”کیا؟“ وہ تجھ میں رہ گئی۔ ”کب ہوا یہ؟ کیسے ہوا؟“
رات کو گویا شکار سے واپس آ رہا تھا۔ ”وہیں
گھات لگائے ملک بدر بیٹھا تھا۔“
”گھیاں کو گولی مار دی۔“
”پولیس کی پیٹرول پارٹی قریب ہی تھی فلاں کی آواز
اے جالیا۔“

”بدر غازان حوالات میں بند ہے۔“
”رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہے پھانسی چڑھ جائے گا۔“
بھانت بھانت کی آوازیں اس کی سماعت سے
نکرائیں جانے کون کیا کہہ رہا تھا۔ وہ بے اختیار بھاگتی
ہوئی ٹنگے پاؤں سیڑھیاں اترنے لگی۔
”بڑے ٹھاکر کہاں ہیں؟“ ایک ملازمہ کو روک کر
پوچھا۔

”وہ مردان خانے میں ہیں، بری حالت ہے ان کی“
ایک بی بی تو پتر تھا ان کا۔
”سنو بدر غازان پکڑا گیا ہے کیا؟“
”ہاں جی میم صاحب سنا ہے وہ تھانے میں بند
ہے۔“ وہ کہہ کر غلت میں آگے بڑھ گئی اور وہ
متذنب سی تاسف سے دیکھتی رہ گئی۔
جو ہو رہا تھا بہت برا ہو رہا تھا۔

اس نے سگریٹ لیوں سے نکال کر میز کے کنارے
سے مسلا اور ایش ٹرے میں رکھ دیا، پھر سپاہی کی جانب
دیکھا۔ ”جاؤ، ملک صیب کو لے کر آؤ۔“ لہجے میں طنز
نمایاں تھا۔

وہ جتنا خوش ہوتا، کم تھا۔ سب کچھ اس کے حسب
نشا ہوا تھا۔ بدر غازان قتل کے جرم میں رنگے ہاتھوں
پکڑا گیا مجرم تھا اور اس کی کم سے کم سزا عمر قید اور زیادہ
سے زیادہ پھانسی تھی۔ وہ حوالات میں بند تھا اور زہرہ
نادر شاہ کو اپنی دوستی میں لگ رہی تھی۔ بدر کی سزا پر
مہراس وقت لگتی تھی جب وہ قبائلی بیان دے دیتا، لیکن

یہ کون سا مشکل تھا، زہرہ کا وجود تریپ کے اس پتے کی
طرح تھا جو نادر شاہ کو ابھی بہت سی جگہوں پہ کھیلنا تھا۔
عرصہ پہلے جب وہ دونوں ایک جتنا حصہ ڈال کر
فرنیچوں کے خلاف راہنی کی وارداتیں کرتے تھے تو
بدر منہ نہیں چھپاتا تھا، کتنے جتنا اس کا نام لوگوں کی
زبان پہ آنے لگا، وہ آن کی آن میں بیلی کا ہیرو بن گیا کہ
کتنی صاحب کو کون پسند کرتا تھا بھلا؟ اور وہ جو منہ
چھپائے، آواز بدل کر بولتا تھا، پس منظر میں چلا گیا، اس
کے دل کے نہال خانے میں ایک احساس کتنی پیدا
ہو چلا تھا، جسے بدر کی دوستی بڑھنے نہ دیتی تھی، لیکن اندر
سے وہ اس سے رشک کرنے لگتا تھا، سارے گاؤں کے
مسلمانوں کے لیوں پہ بدر غازان کا نام ہوتا۔ وہ جو
شہسوار ہے، وہ جو راہزن ہے، وہ جو ایسا بہادر ہے کہ اس
کے ہوتے ہوئے ایسی باتیں سنتا تو کہیں نہ
کہیں اسے اس سے حسد محسوس ہونے لگتا۔

پھر جب بدر نے ایک انگریز عورت سے شناسائی کی
بنا یہ اسے جانے دے کر عرصہ پرانا اصول توڑا تو بات
اتنی بڑی نہ تھی، لیکن نادر شاہ کے دل کو بری طرح لگی
یا شاید اسے کوئی موقع چاہیے تھا بدر کو پکڑنے کا۔ بظاہر
وہ اس کا سب سے بڑا حامی بنا رہا، مایا کے کیس میں اس
کی بہت مدد کی، لیکن جب اس حسین لڑکی نے بدر کا نام
لیا تو اسے لگا، اب وہ اس کی مزید حمایت نہیں کر سکے
گا۔ وہ بیلی کا تھانے دار تھا، تھانے دار بادشاہ۔ اس کے
ہوتے ہوئے کیوں کوئی دوسرا ہیرو بنے؟

اور اس منصوبے سے اس کے سارے مسئلے حل
ہو گئے تھے۔ اسے معلوم تھا گویا شہر سے باہر گیا ہوا
ہے اور بدر اور گویا کی عداوت سے سب واقف تھے
اگر بدر اسے مار ڈالتا ہے تو سب کو یقین آجائے گا۔
لیکن اگر نادر گویا کو مارے گا تو کوئی یقین نہیں کرے
گا۔

سپاہی اکیلا واپس آیا تو وہ چونکا۔
”ملک کہاں ہے؟“
”شاہ صاحب، وہ کتنا ہے۔“ وہ سر جھکائے
خاموش ہو گیا۔

مایا نے دیکھا اس کے دائیں رخسار پہ زخم تھا
بائیں آنکھ تلے نیل پڑا تھا۔ گردن پہ ایک زخم سے
خون ابھی تک ہلکا ہلکا رس رہا تھا۔

وہ دکھ سے اسے دیکھے لگی۔ ”کیسے ہو؟“
”جیسا دکھ رہا ہوں۔“ وہ زخمی سا مسکرایا۔

چند لمحے کو اس تنگ و تاریک کوٹری میں خاموشی
چھا گئی، اسے مایا کی آنکھوں میں کرب سا دکھ تھا۔ وہ
اسے دیکھتی ہی لگی تھی، پیچھے پچھلی شام بجلی کے جھل
میں اس کئے تھے۔ پیچھے لگی تھی، روٹی بھکتی ساہو سی
لڑکی، پہلے والی مغرور، پر اعتماد مہارانی سے چنداں
مختلف۔ اب وہ رو نہیں رہی تھی، مگر آنکھیں ویران
ویران سی تھیں، چہرے پہ زردی گھنٹی تھی اور ڈھیلے
جوڑے سے بال نکل کر چہرے کے گرد بکھرے تھے۔

”بدر۔۔۔“ اس نے خاموشی کو توڑا۔ ”یہ سب اچھا
نہیں ہوا۔“
وہ خاموش رہا۔

”میں بھلے گویاں کو ناپسند کرتی تھی، وہ کتنا ہی برا
کیوں نہ تھا، لیکن اسے قتل کرنا کہاں کا انصاف تھا۔“
”مایا؟“ اس کے دل کو دھچکا لگا۔ ”تم بھی سمجھتی ہو
کہ میں نے گویاں کو قتل کیا ہے؟“
”کیا مطلب؟“ مایا بھڑک اٹھی۔ ”تم نے گویاں کو
قتل نہیں کیا؟“ وہ شکوہ کنناں نگاہوں سے اسے دیکھے
گیا۔

”بدر! مجھے بتاؤ، تم نے گویاں کو قتل نہیں کیا؟ اگر
ایسا ہے تو تم یہاں کیوں ہو؟“
وہ خاموش تھا، سلاخیں خاموش تھیں، دیواریں
خاموش تھیں۔

”خدارا، مجھے بتاؤ، یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“ وہ
سلاخیں پکڑ کر التجا کرنے لگی، وہ تب بھی چپ رہا۔
”بدر! بولو، کس نے مارا ہے گویاں کو؟“
”نادر شاہ نے۔“

مایا کے ہاتھ سلاخوں پر سے گر گئے۔
”تمہارے دار نے؟ مگر کیوں؟“
”کیا تم میرا یقین کرو گی؟“

”کیا کہتا ہے؟“

”وہ کہتا ہے نادر شاہ سے بولو میں تمہارے باپ کا
نوکر نہیں ہوں جو تمہارے بلانے پہ آجاؤں، ملنا ہے تو
خود اندر آؤ۔“

نادر شاہ تلملا کر کھڑا ہوا، اور تیزی سے اندر کی
جانب بڑھا۔ غصے کی ایک لہر اس کے اندر اٹھی تھی، مگر
وہ دیا گیا۔ ابھی اسے ٹھنڈا کر کے کھانا تھا۔

اس پل دروازہ کھلا اور اے ایس آئی کے پیچھے مایا
اندر داخل ہوئی۔ وہ جاتے جاتے ٹھہر گیا۔
”شاہ صاحب! یہ ملک بدر سے ملنے آئی ہیں۔“

سفید ساڑھی میں ملبوس وہ شاید ہمارا منہ ہی اٹھ آئی
تھی۔ ڈھیلا سا جوڑا گردن پہ پڑا تھا، ساڑھی کا پلو فرش پہ
اس کے پیچھے پھیلتا آیا تھا۔ وہ اسے قدرے پریشان لگی
تھی۔

”اچھا۔“ کچھ سوچ کر اس نے واپس نشست
سنبھال لی۔ ”میں اندر لے جاؤ اور ملو! دو۔ پھر وہ مایا
سے مخاطب ہوا، آپ سمجھائیے گا اسے کہ اب چونکہ
رنگے ہاتھوں پکڑا ہی گیا ہے تو اقبالی بیان بھی۔“
”چلو۔“ وہ انسپکٹر نادر شاہ کو نظر انداز کر کے خود ہی
اندازاً ”اندر کی جانب بڑھ گئی تو اے ایس آئی اس کے
پیچھے پٹکا۔
نادر شاہ تلملا کر رہ گیا۔

آہنی سلاخوں کے اس پار زرد دیواروں والا کمرہ تھا،
وہ اسی دیوار کے ساتھ پشت ٹکائے، سر جھکائے زمین پہ
بیٹھا تھا۔

وہ دھیرے سے چلتی ہوئی سلاخوں کے قریب
آئی۔ ”بدر۔۔۔“
اس نے سر اٹھایا۔

”مایا؟ اس کی رت جگے سے سرخ آنکھوں میں
زندگی کی ایک رمتق دوڑ گئی۔

وہ اٹھ کر اس کے قریب آیا۔ اتنا قریب کہ دونوں
کے درمیان بس سیاہ سلاخیں حاصل تھیں۔

یائیں رخسار پہ زخم تھا
گردن پہ ایک زخم سے

دیکھتے ہو؟

نہیں مسکرایا۔

کوٹھری میں خاموشی

کرب سا دکھا تھا۔ وہ

لی شام بجلی کے جنگل

سارو بیلمتی سادہ سی

ہمارائی سے چنداں

مگر آنکھیں ویران

ٹھنڈی تھی اور ڈھیلے

گردن کھڑے تھے

ڈڑا۔ ”یہ سب اچھا

تھی وہ کتنا ہی برا

کا انصاف تھا۔“

”تم بھی سمجھتی ہو

”تم نے گویا کو

اسے اے دیکھے

نہیں کیا؟ اگر

تھیں دیواریں

وہ رہا ہے؟“ وہ

چپ رہا۔

”کیا؟“ وہ بھونچکی رہ گئی۔

”تم نے بھوت ڈھونڈ لیا؟“

نہیں، مگر میں نے اس وقت اسے درختوں کے پار

دیکھا تھا۔ وہ جانتا ہے میں نے قتل نہیں کیا ہے۔ وہ

اصل گواہ ہے۔“

”تمہیں لگتا ہے میں نہیں کروں گی؟“

اور پھر وہ اسے بتانا لگیا، ہر بات، ہر شے، ہر لمحہ گنواتا

گیا۔ ”میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ مت جاؤ مگر۔“

”مجھے بس ایک بات بتاؤ۔ کیا زہرہ ٹھاکروں کی حویلی

گئی تھی؟“

”ہاں وہ آئی تھی مگر میرے سامنے۔ وہ مجھے باتیں

سنانے آئی تھی، نیچے گئی تو بڑے ٹھاکرے شہرت کے

لیے روک لیا، اسی وقت نادر شاہ بھی آگیا، وہ تو گواہ تھا

سارے معاملے کا، اسی کے سامنے تو زہرہ واپس گئی تھی

اور گویا تو نادر شاہ کے بھی جانے کے بعد آیا تھا۔ اس

نے تم سے جھوٹ بولا ہے۔ وہ تو سارے معاملے کا خود

گواہ تھا۔“

”اور تم نے بھی مجھے نہیں بتایا؟“

”میں کیوں بتائی؟ تاکہ تم اس پر گرجو برسو؟ وہ پہلے

ہی مجھے قصور وار سمجھتی ہے۔ میں تنہی بری ہوں اس

کی نظروں میں؟“

”نادر نے ایسا کیوں کیا؟“ وہ تھک سا گیا تھا۔

”کیا تم ابھی تک نہیں سمجھتے؟“

”کیا؟“ وہ چونکا۔

”اس کی نظر زہرہ پر ہے۔ اسی نے اس عورت کو

تمہارے گھر بھیجا ہو گا، گویا ایسی ہمت نہیں کر سکتا

وہ تو جب سے اسے علم ہوا تھا کہ زہرہ تمہاری منگیتر ہے

اس نے اس کو تنگ نہیں کیا تھا۔ نادر تمہیں اس

کیس میں پھنسا کر زہرہ کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔“

”تم۔۔۔ تم ایک کام کرو۔“ وہ سلاخوں کے قریب

آیا اور مایا کے ہاتھ تھام لیے، ”آواز مدھم سرگوشی میں

بدل گئی، ”تم قبرستان کے بھوت کو ڈھونڈو۔ وہ گواہ ہے“

اس نے سب دیکھا تھا۔

”کیا؟“ وہ بھونچکی رہ گئی۔

”تم نے بھوت ڈھونڈ لیا؟“

نہیں، مگر میں نے اس وقت اسے درختوں کے پار

دیکھا تھا۔ وہ جانتا ہے میں نے قتل نہیں کیا ہے۔ وہ

اصل گواہ ہے۔“

”بدر! اصل گواہ تم ہو کہ قتل نادر شاہ نے کیا ہے۔

تم فکر نہ کرو، ہم تفتیش کو اور تنگ لے جائیں گے۔

میں کسی سے بات کرتی ہوں، شہنشاہ برطانیہ کے راج

میں بھلے تم لوگوں کو غلامی ملے مگر انصافی نہیں ملتی، یہ

تم بھی جانتے ہو اور میں بھی جانتی ہوں اور جو بھوت خود

کو چھپا چھپا کر رکھتا ہے، وہ کیوں بھری عدالت میں

گواہی دے گا؟ کیا نادر شاہ کا وکیل اس سے یہ نہیں

پوچھتے گا کہ وہ اس وقت خود وہاں کیا کر رہا تھا، خیر تم فکر

نہ کرو، میں کچھ کرتی ہوں۔“

”شکریہ۔“ وہ تشکر سے کہہ اٹھا تو وہ پھیکا سا مسکرائی۔

”کس بات کا؟“

”جو تم کر رہی ہو اس کا۔“

”تمہارے لیے تو نہیں کر رہی۔ اس محبت کے

لیے کر رہی ہوں، جو مجھے تم سے اور تمہیں مجھ سے ہے

۔ ہے تاہم۔“

اس نے اثبات میں سر ہلایا دیا۔ ملاقات کا وقت ختم

ہونے والا ہے، میں چلتی ہوں پھر آؤں گی۔ تم پریشان

نہ ہونا، وہ چلی گئی اور وہ دور تک نگاہوں سے اس کا

تعاقب کرتا رہا۔

”چاچی! بس دو نوالے کھالے تو نے سویرے سے

کچھ نہیں کھایا۔“ وہ صبح سے تیسری دفعہ کھانا اس کے

سامنے رکھ چکی تھی، مگر چاچی سر جھکائے بے آواز

آنسو بہاتی تسبیح کے دانے کرائے جا رہی تھی۔

”مجھے بھوک نہیں ہے، یہ اٹھالے یا خود کھالے۔“

مگر وہ کیسے بتاتی کہ جب سے بدر کے گرفتار ہونے

کی خبر آئی تھی، بھوک تو اس کی بھی اڑ گئی تھی۔ بس

ایک گہرا سکوت تھا جس نے حویلی کو اپنے پروں تلے

بھانپ لیا تھا، عجیب ویرانی اور وحشت تھی، چاچی بس

بیٹھی روٹی تسبیح پڑھتی رہتی اور وہ سارے میں بولائی

بولائی پھرتی۔

رہتا تو وہ یوں بھی سارا دن گھر پہ تھا، فجر کے وقت نکل جاتا دوپہر میں کھانا کھانے، کبھی بھی سی آتا، واپسی رات میں ہی ہوتی اکثر دیشتر تو رات بھی باہر آ جاتی۔ وہ اور چاچی تنہا ہی ہوتی تھیں مگر ایسی دیرانی تو پہلے نہ تھی جو اس کے گرفتار ہونے کی خبر کے ساتھ ان کے دلوں میں اتر آئی تھی۔ ہر رنگ پھیکا، ہر موسم، خزاں کا بن چکا تھا۔

”کوئی ملنے گیا ہے اس سے؟ ارے کوئی تو مجھے بتائے، پولیس نے اسے کیوں پکڑا ہے؟ میرا بچہ کیسے کسی کا خون کر سکتا ہے۔“ تھانیدار تو اس کا پکا پار تھا، پھر اسے کیوں پکڑا۔ وہ انچل میں منہ چھپا کر پچپک کر رہی اور زہرہ ایک سو دم چونکی۔

”ہاں، تھانیدار تو بدر کا دوست تھا، یہی تو وہ ہمیشہ سے سستی آئی تھی، پھر اس نے کیسے پکڑ لیا اسے؟ کیا اسے جا کر اس سے پوچھنا چاہیے؟“

”میں چلی جاؤں تھانے؟“

”نہیں، نہیں تو نہ جا۔ بدر برامانے گا۔“ چاچی نے فوراً منع کر دیا مگر وہ کسی اور ہی سوچ میں گم تھی۔ چاچی کی بات اس نے سنی ہی نہیں تھی۔

”تو پھر کیا سوچا تم نے؟“

بدر نے سر اٹھایا، سلاخوں کے اس پار نادر شاہ کھڑا تھا، اس کے چہرے پہ وہ مسکراہٹ تھی، جو پہلے کبھی اس نے وہاں نہیں دیکھی تھی۔ اس مسکراہٹ میں ان دونوں کی دوستی کی قبر بھی کاش وہ پہلے اس کا کتبہ پڑھ لیتا۔

”کوئی فیصلہ کیا ہے؟“

وہ اسی طرح دیوار سے کمر نکائے بیٹھا سر اٹھا کر اسے دیکھتا رہا۔

”جناؤ ملک صیب! اقبال بیان دو گے یا نہیں؟“

وہ بے تاثر نگاہیں نادر شاہ پر مرکوز کیے ہوئے تھا۔ اس کا چہرہ نیل اور زخموں سے بھرا تھا فقط ایک روز میں ہی وہ کتنا کمزور اور زرد پڑ چکا تھا۔

”دیکھ بدر! تو اقبال بیان دے ڈال، سب نے تیرے قریب پرتول پڑا دیکھا ہے، تیرے جرم کے سب گواہ ہیں، اب تو بچ نہیں سکتا۔ بیان دے ڈال، میں تو تیرا معاملہ زیادہ خراب ہو گا۔“

وہ مسلسل چپ رہا تو نادر شاہ کو تاؤ آیا۔

”نہ تو کیا سمجھتا ہے؟ تو مجسٹریٹ کے سامنے اقبال ہونے سے پھر جائے گا تو تیری جان پھوٹ جائے گی؟“

پھر ایک لمحے کے توقف سے لہجہ بدل کر، کسی مخلص دوست کی طرح نرمی سے بولا۔

”تم مجھے کیس ٹھیک کرنے دو، میں تمہارا دوست ہوں، تم ایک دفعہ اقبال بیان دے دو، میں استغاثہ میں دو تین کمزوریاں رکھ دوں گا، کیس ایسا بناؤں گا کہ تم تین چار بیٹھیوں میں ہی بری ہو جاؤ گے۔“

”اچھا!“ وہ طنز سے ہولے سے ہنسا، ”نادر! تمہیں لگتا ہے اب میں تمہارا اعتبار کروں گا؟ میں زندگی میں لوگوں پہ بس ایک بار اعتبار کیا کرتا ہوں، وہ اسے توڑ دین تو میں دو سرا موقع کبھی نہیں دیا کرتا۔“

”تیری تو۔۔۔“ وہ کوئی سخت لفظ کہتے کہتے رکالور لہجہ ہموار کر کے بولا، ”ٹھیک ہے، اعتبار نہ کر، مگر معاہدہ تو کر سکتا ہے۔“

”کیسا معاہدہ؟“ اس کا ہاتھ اٹھکا۔

”کچھ لو اور کچھ دو کا معاہدہ۔“

”یہ چاہیے مجھے؟“

”اونہوں۔“ نادر شاہ مسکرایا۔ ”مجھے زہرہ چاہیے تو اسے میرے نکاح میں دے دے، تو نے کون سا ایم کو چھوڑ کر اس سے شادی کرنی ہے اور میں تجھے چھوڑ دوں گا۔“

”اور اگر میں ایسا نہ کروں تو؟“ بہت دیر بعد وہ بولا۔

”پھر تو پھانسی چڑھے گا ہی، میں تیری اس منگیتر کو ادھر تھانے بلا کر تیرے سامنے اپنے قید میں پڑے اشتہاریوں کے حوالے۔“

وہ تیرکی طرح اٹھا تھا اور جھپٹ کر سلاخوں سے ہاتھ گزار کر نادر شاہ کی گردن دیوچلی تھی ”آگے ایک لفظ بھی نہ بولنا ورنہ تیرا خون میرے ہاتھوں لکھا جا چکا

ال سب نے تیرے
جرم کے سب گواہ
ہے ڈال نہیں تو تیرا

او آگیا۔

کے سامنے اقبالی
صوت جائے گی؟
لجہ بدل کر کسی

میں تمہارا دوست
میں استغاثہ میں
سیاہناؤں گا کہ تم
گے۔

نسا "نادر! تمہیں
میں زندگی میں
وں وہ اسے توڑ
نا۔"

نے کہتے رکاو اور لجہ
رنگر معالجہ تو کر

زہرہ چاہیے
نے کون سا ایم
میں نیچے چھوڑ

بر بعد وہ بولا۔
ی اس سنگیتر کو
قید میں پڑے

سلاخوں سے
آگے ایک
وں لکھا جا چکا

نادر شاہ نے اس کے ہاتھوں کو جھٹکا دے کر بمشکل
گربان چھڑایا، اگر سلاخیں بیچ میں حائل نہ ہوتیں تو
شاہد اب تک وہ اس کو مار چکا ہوتا۔

میں بھی دیکھتا ہوں تو کیسے اقبالی نہیں بنتا، تیرا تو
باپ بھی اب قبر سے اٹھ کر بیان دے گا۔ تو نے
نادر شاہ کو بدکار بدنام بولا تھا نا، اب پورا بیلی دیکھے گا کہ
ہم کون ہے اور بدکار کون۔ وہ گربان درست کرتا
بلکہ جھٹکا ہر نکل گیا۔

اسے انگریزوں کی بیشک میں لے جاؤ اور سارا
قصہ اگلاؤ۔ اپنے سپاہیوں کو حکم دے کر وہ گھرے
سانس لیتا بمشکل غصہ قابو کرنے لگا۔

ہندوستانی تھاندار جب تشدد کرتے تھے تو فرنگی
افسر اس طریقہ کار کو تھوڑا ڈگری اور نارچر سیل کو
ڈرائنگ روم کہہ کر پکارنے لگے تھے بعد میں یہ
اصلاحات پورے ہندوستان میں رائج ہو گئیں اور اب
تک رائج ہیں۔

اسی وقت کھلے دروازے سے سیاہ چادر میں لپٹی زہرہ
داخل ہوئی۔ لبوں میں کچھ برہمرا تا نادر شاہ ایک دم حیران
سا کھڑا ہو گیا۔ اس نے تو تصور بھی نہیں کیا تھا کہ سب
کچھ اتنی آسانی سے ہو جائے گا۔

”او آؤ بیٹھو۔“ سارا اشتقاق فراموش کر کے بہت
زری اور عزت سے اس نے کرسی پیش کی۔

وہ بھیجکتی پریشان سی بیٹھ گئی۔
”کو خیریت؟“ وہ بظاہر بہت فکر مند سا اس سے
مخاطب ہوا۔

”داروغہ جی! چاہتی بہت پریشان ہے، بدر کو آپ
نے کیوں پکڑا ہے وہ قتل نہیں کر سکتا۔“

”یہی تو میں حیران ہوں، خیر تم فکر نہ کرو، جا کر اپنی
چاہی کو لے لی دو، وہ بہت جلد گھر آجائے گا۔“

”واقعی؟“ اس کی سیاہ آنکھیں جھلک اٹھیں۔ ”وہ
گھر کب آئے گا؟“

”بہت جلد، تم تسلی رکھو، میں سب سنبھال لوں
گا۔“

”میں۔۔۔“ وہ انگلیاں موڑ رہی تھی میں اس سے
مل سکتی ہوں؟

”ملنا تو قدرے مشکل ہو گا، لیکن میں تمہیں اسے
دکھا سکتا ہوں۔“

”ملنا کیوں نہیں؟“ وہ بے چین ہوئی۔

”قانونی پیچیدگیاں ہیں۔ خیر تم ادھر آؤ۔“ وہ وہی
خوشی پر قابو پا نا اسے اپنے ہمراہ لیے اندر آیا۔

وہ اسی طرح سر جھکائے بیٹھا تھا، آہٹ سر اٹھایا تو
نادر شاہ کے ساتھ آئی زہرہ کو کچھ کرسا کہ گیا۔

”وہ کیجھو وہ ادھر بیٹھا ہے۔ اب آجاؤ۔“

”میں اس سے۔۔۔“

”نہیں، ادھر آؤ۔“ اس سے پہلے کہ بدر اٹھا اور
کچھ کہہ نا، وہ زہرہ کو واپس لے گیا۔

چند لمحے بعد اس کی تھوڑا پیسی ہوئی۔

”اب بتاؤ ملک صیب؟“ لبوں پہ وہی مسکراہٹ
سجائے وہ سلاخوں کے سامنے آکھڑا ہوا۔

”نادر! خدا کے لیے اسے جانے دو۔“ وہ بے بس سا
کھڑا ہوا۔

”تمہاری یہ سندرسی سنگیتر اس وقت میرے
تھانے میں بیٹھی ہے، میں نے اسے ایس آئی کو جو گنڈر

اور شام کو لائے بھیج دیا ہے۔“ اس نے چند نامی گرامی
غنڈوں کے نام لیے ”وہ ایسا تازہ شکار ہاتھ سے کہاں

جانے دیں گے، چند منٹ تک وہ تھانے پہنچ جائیں گے
میں تمہارے ہاتھ پاؤں بند ہوا کر ادھر تمہارے

سامنے۔“

”بس کرو۔“ اس نے بد حال ہو کر سلاخیں تھام
لیں۔ ”میں اقبال جرم کرنے کے لیے تیار ہوں مگر تمہیں

کوئی بھی اسے ہاتھ نہیں لگائے گا، اسے عزت اور
خیریت سے یہاں سے جانے دو، وہ چلی جائے گی تو میرا

بیان لکھ لیتا۔“

اطمینان و سکون نادر شاہ کی رگ رگ میں اتر گیا۔

”نہیں، پہلے تم بیان دو، پھر میں اسے بھیج دوں
گا۔“ وہ کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہ تھا، بدر کا کیا تھا وہ

زہرہ کے جاتے ہی پھر جاتا، اس جیسا سخت جان تشدد

سے قائل ہونے والا تھا ہی کب۔
 ”مجھے منظور ہے مگر اسے جانے دو۔“
 ”ٹھیک ہے۔“ اس نے کسی کو آواز دی۔ ”اسے
 باہر لاؤ اور بی بی کو دوسرے کمرے میں بٹھاؤ۔“

اور اگلی صبح جب ملایا امر تر سے سیدھی تھانے کے
 سامنے سواری سے اتری اور اندر آتے ہی نادر شاہ سے
 بدر کو ملوانے کا کہا تو وہ بہت شائستگی سے مسکرایا۔
 ”آپ کا ہے کو خوار ہوتی پھر رہی ہیں میم صاحب؟
 وہ تو اقبال جرم کر چکا ہے۔“
 وہ دھک سے رہ گئی۔

”نہیں۔۔۔ یہ نہیں ہو سکتا۔“ وہ بھلائی۔ ”بدر ایسا
 نہیں کر سکتا“ اس نے یہ قتل نہیں کیا تو وہ کیوں کرے
 گا اقبال جرم؟“

نادر شاہ کو بے ساختہ وہ شام یاد آگئی۔ جب وہ پرچہ
 کٹوانے آئی تھی۔ اٹھی گردن، شفر بھری نگاہیں
 حکیمہ انداز، وہ اعتماد سی چال اور اب۔۔۔ اب بغیر
 کاجل کے کلی آنکھیں بے پروائی سے چہرے کے
 اطراف میں بکھری لٹیں، ڈھیلی چوٹی وہی کل والی سفید
 ساڑھی خشک سوکھے لب شاید اس نے تب سے اب
 تک ٹھیک سے کچھ نہ کھایا تھا۔ اسے لگا تھا جیسے اس کا
 غور و مشق جھاگ کی طرح بیٹھ گیا ہو اور اس میں سے
 ایک کنور بے بس سی لڑکی نکلی ہو جس کا چہرہ ہر بات پر
 سپاٹ نہیں رہتا جو بات بے بات پہ پریشان ہو جاتی
 ہو۔

”وہ جرم کر چکا ہے ظاہر ہے قتل کیا ہے تو اقبال
 جرم بھی کرے گا۔“ وہ ٹانگ پہ ٹانگ رکھے سرور سا
 بیٹھا تھا۔

”میں۔۔۔ میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔“
 ”ملوائے دیتے ہیں میم صاب۔“ اس نے ایک
 الکار کو آواز دی۔

چند ساعتوں بعد وہ اس کے سامنے کمرے میں بیٹھی
 تھی۔ دونوں کی کرسیوں کے درمیان میز بھی۔

وہ سر جھکائے گود میں رکھے ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا۔
 اس لمحے ملایا کو اس پہ بے پناہ غصہ آیا تھا۔
 ”کیوں کیا تم نے اقبال جرم؟“ وہ چپ چاپ گردن
 جھکائے رہا۔

”بدر! میں تم سے پوچھ رہی ہوں۔ تم نے کیوں کیا
 اعتراف؟ تم نے تو یہ کھل نہیں کیا، تم تو خود گواہ ہو کہ
 نادر شاہ نے۔۔۔“
 اس نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔

”میں نے کیا ہے قتل میں نے ہی مارا ہے گویا
 کو۔ کر لیا ہے اعتراف دے دیا ہے میں نے بیان۔ جاؤ
 تم مجھے میرے حال پہ چھوڑ دو۔“

”میں کیسے چھوڑ دوں تمہیں تمہارے حال پہ۔“
 اس نے بے اختیار بدر کے میز پر رکھے ہاتھوں پہ اپنے
 ہاتھ رکھ دیے۔ اس نے سرعت سے اپنے
 ہاتھ نکال لیے وہ خالی ہاتھ رہ گئی۔

”بدر! ایسے مت کرو۔“
 ”تم جاؤ۔۔۔“
 ”میں نہیں جاؤں گی۔“

”خدا کے لیے جاؤ۔ مت آیا کرو میرے پیچھے تم
 سب مزید مسائل کھڑے کرنے۔“ وہ جیسے تھک گیا تھا۔
 بالائی نہ دیکھا اس کی گردن کے زخم، خون جم چکا تھا۔

”میں تمہیں بہت مضبوط اعصاب کا مالک سمجھتی
 تھی مگر تم اتنے سے تشدد سے ہار گئے؟“
 ”یہ بات نہیں ہے۔“ تیزی سے کہتے کہتے وہ ایک
 دم چپ ہو گیا۔

”پھر کیا بات ہے؟ کس طرح کروایا ہے تم سے
 انہوں نے اقبال جرم؟“

”وہ زہرہ کو بیچ میں لے آیا تھا۔“ وہ بہت دیر بعد بولا
 تو اس کی آواز میں صدیوں کی تھکن تھی۔ ”زہرہ
 تھانے میرا پتہ کرنے آئی تھی، نادر نے کہا وہ اسے
 میرے سامنے بے عزت کرائے گا اگر میں نے اقبال
 جرم نہ کیا تو۔“

”اور تم نے یقین کر لیا؟ تم اتنے بے وقوف تو نہ
 تھے بدر! جس عورت کو حاصل کرنے کے لیے وہ یہ

ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا۔
”کیا تھا۔“

”وہ چپ چاپ گردن

ہوں۔ تم نے کیوں کیا
لیا، تم تو خود گواہ ہو کہ

نے ہی مارا ہے گویا
ہے میں نے بیان۔ جاؤ

تمہارے حال ہے۔“
رکھے ہاتھوں پہ اپنے
سرعت سے اپنے

کرو میرے پیچھے تم
”وہ جیسے تھک گیا تھا۔
تم ناخون جم چکا تھا۔
ماب کا مالک سمجھتی
ہے؟“

ت کتے کتے وہ ایک
کروایا ہے تم سے

”وہ بہت دیر بعد بولا
”علک تھی۔“ زہرہ
نے کہا وہ اسے
کریں نے اقبال

نے وقف تو نہ
نے کے لیے وہ یہ

سب کر رہا ہے۔ اسے ہی کسی اور کے ہاتھ میں دے
دے گا؟ ارے کسی اور کو دینا ہوتا تو تم برسے تھے کیا، وہ
سب کرتا ہی کیوں؟ بلی کا کون سا مرد ہے جو اپنی
عورت پہ کسی دوسرے کی نگاہ بھی برداشت کرے اور
اگر زہرہ اتنے آرام سے تھانے آگئی تو یقیناً پہلے بھی
آئی رہی ہوگی، تم نے نہیں سوچا، وہ کیوں آئی ہے؟
کیونکہ نادر شاہ نے اس کے سامنے خود کو اس کا سچا
ہمدرد ظاہر کیا ہو گا، کیا وہ زہرہ سے بدسلوکی کر کے خود کو
اس کی نظروں میں گرائے گا؟“

پدر شہزاد سارے دیکھے گیا

”پدر! اس وقت بلی کی وہ واحد عورت جس کی
عزت کی حفاظت نادر شاہ خود کرے گا وہ زہرہ ہی ہے پھر
تم نے کیوں کیا اقبال، ”جڑ“ کوئی اور نہیں۔ اگر اس نے
نوذ زہرہ کے ساتھ کچھ۔۔۔“

”تاکہ ساری عمر کے لیے زہرہ کو خود سے نفرت
کرنے پہ مجبور کر دے؟ ہمدردی اور خلوص وہ اس
کے دل میں جگہ بنانے کے لیے ہی تو دکھا رہا ہے۔“
اس نے سر جھکا لیا، شاید اسے مایا کی بات پہ یقین آ
گیا تھا۔

”تم نے میرا انتظار تو کیا ہوتا۔“ نہ چاہتے ہوئے
بھی وہ گلہ کر گئی۔ ”مجھے یہ اعتبار تو کیا ہوتا۔“
”تم کیا کرو گی؟“

”میں کر چکی ہوں، نتیجہ تم جلد دیکھ لو گے۔“ پھر
جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی، ”کل تک مجھے امید ہے
کہ سی آئی ڈی کو یہ معاملہ نفیض کے لیے دے دیا
جائے گا اور صبح تمہاری مجسٹریٹ کے سامنے پیشی ہے۔“

”ہاں مجھے بیان دینا ہے۔“
”پدر! خدا کا واسطہ ہے، تم اقبالی بیان سے پھر جانا
اور کہنا کہ پولیس کے دباؤ میں آکر نکھوایا گیا ہے۔ کل
تک سب تھیک ہو جائے گا۔“

وہ تاکید کر کے چلی گئی اور وہ اس کے جانے کے بعد
بھی اس کی ٹکان بھری سنہری آنکھوں کو اپنے ارد گرد
محسوس کرتا رہا، بہت عرصے بعد اسے لگا تھا کہ وہ فرنگی

شہزادی اپنے خول سے باہر آ رہی ہے۔
مکڑہ کیا تھی، وہ کبھی بھی نہ سمجھ سکا۔ جانے بعض
لوگ اتنے پیچیدہ کیوں ہوتے ہیں۔ انہیں برسوں جان
لو پھر بھی ہر دفعہ ملنے پہ وہ مختلف لگتے ہیں۔

اس نے وہی کیا جو مایا نے کہا تھا، وہ مجسٹریٹ کے
سامنے اقبالی ہونے سے پھر گیا تھا۔

”نادر شاہ کے ذہنی دباؤ اور تشدد کی وجہ سے مجبور ہو
کر میں نے اقبالی بیان یہ دستخط کیے تھے، اس نے
دھمکی دی تھی کہ وہ میرے گھر کی عورتوں کو بیچ چور ہے
پر بے عزت کرے گا، میں مجبور ہو گیا تھا۔“

کیس سی آئی ڈی کے پاس چلا گیا، سی آئی ڈی کے دو
افسران جن میں ایک انگریز انسپٹر اور دوسرا مسلمان تھا
، کیس کی نفیض کے لیے بی بی راہیو تال آگئے، نادر شاہ
کو فی الحال کام کرنے سے روک دیا گیا۔ کمدار جس کو
نادر نے پدر کو بلوانے کے لیے پیغام دلوایا تھا اور بی
چھمن کے بیان نئے سرے سے لکھوائے گئے،
نفیض از سر نو شروع ہوئی تو دوسرے ہی روز جب ابھی
کوئی فیصلہ نہیں ہوا تھا مگر پدر ضمانت پر رہا ہو گیا۔

وہ جب تھانے اسے لینے آئی تو اسے وہ پہلے سے
قدرے بہتر لگا تھا۔

”تم کیوں آئیں؟ کسی ملازم کو بھیجا دیا ہوتا۔“
وہ دونوں ایک ساتھ باہر نکلے تھے۔

”ملازم کس کا؟ تمہارا یا میرا، تمہارا تو علم نہیں مگر
اپنی تو ساری حویلی خالی پڑی ہے۔“
”کیوں؟ بڑے ٹھاکر کہاں گئے؟“

”وہ۔۔۔“ مایا نے رنجیدہ سی گہری سانس لی ”ان کی
طبیعت خراب رہنے لگی ہے، جو گڑھا انہوں نے
تمہارے لیے کھودا تھا، وہ کھاس کا ڈھکن اوڑھ ان کے
قدموں تلے آ گیا۔ اب حویلی میں میں ہوتی ہوں یا چند
خادما میں بڑے ٹھاکر تو کمرے میں بیمار ہی پڑے رہتے
ہیں بے چارے۔ خیر اگر کبھی آتا چاہو تو آ جانا۔“

”مایا۔۔۔!“ دور فصلوں کو دیکھتے اس نے پکارا ”تم

نے یہ سب کیسے کیا؟
”میں نے ایک افسر سے بات کی تھی۔“
”کس افسر سے؟“ وہ خاموش رہی تو بدر کو اپنا سوال
دہرائے۔

”جان کارلس۔“
”ایسا؟“ وہ دنگ رہ گیا۔ وہ ناخن کھرچتی نیچے دیکھ
رہی تھی۔
”جان کارلس نے میرے لیے اتنا کچھ کیوں کیا؟“
”میں نے اس سے کہا تھا، میں شیکھو کا کپٹن
بھول جاؤں گی، مگر وہ تمہیں رہائی دلائے۔“
”تم نے۔۔۔“ وہ شدید حیرت کے باعث بول نہیں
پا رہا تھا۔ ”تم شیکھو کے قاتلوں کو بھول جاؤ گی؟“
”تمہارے لیے؟“ اس نے ہاتھ سینے پہ باندھ کر
سنجیدگی سے اسے دیکھا ”ہاں بھول جاؤں گی چلو، شام
ڈوبنے کو ہے۔“

وہ آگے چل دی تو وہ۔۔۔ اس کے پیچھے چلنے لگا۔
جانے اس کے کتنے اور روپ ابھی اس نے دیکھنے تھے۔



وہ گھر واپس آیا تو خزاں آلود حویلی میں جیسے عید اتر
آئی تھی۔

سارے میں چراغاں ہوا، دلیکس پکیں، خیرات بیٹی
بھٹی روز تک نظر چلتا رہا، قرآن خوانی اور درس کی
محفلیں جیتی رہیں مگر چاچی تھکتی نہیں تھی۔
وہ بار بار اس کے سر کا صدقہ دیتی، کبھی دودھ میں
بلدی ڈال کر پلاتی تو کبھی زخموں کی ٹکڑ کر تھی۔

”کیا حال کر دیا ہے ظالموں نے میرے بچے کا۔“ وہ
اس شام اس کی ٹکڑ کرتے ہوئے دکھی سی کہہ رہی تھی۔
”میں نے تو کبھی سخت ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ جا زہرہ
اسے گرم کر کے لے آ۔“ اس نے کنواری دروازے
سے لگی زہرہ کی طرف بڑھا دی تو وہ ہچکچاتے ہوئے
اندر آئی۔

وہ جب سے آیا تھا، اس سے کوئی بات نہیں کر رہا

تھا، بس کبھی کبھی ایک خاموش مگر سنجیدہ نگاہ ڈال دیتا
لبوں سے کچھ نہیں بولتا۔

اب بھی جب وہ کنواری لے رہی تھی تو بس ایک
نظر اس پر ڈالی پھر رخ پھیر لیا۔

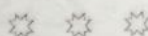
”کتنی خدمت کرتی ہے بے چاری، آدھی رات
تیری فکر میں۔“ اس نے چوکھٹ پار کی ہی تھی کہ
چاچی بولی، دروازے کے دوسری جانب اس کے قدم
رک گئے۔ ”تیرے پیچھے رو رو کر بلکان ہو گئی تھی۔“
اب تو کر لے قدر اس کی بدر، اب نہ دیکھنا اس میسر کی
طرف۔ ارے جس دن اس نے اپنا قدم رکھا تھا حویلی
میں اس دن سے ہی برا وقت آیا ہے، ہم پر۔“

”برا وقت تیری اس چیمٹی کی وجہ سے آیا ہے نہ کہ
میں صاب کی وجہ سے۔“ وہ جیسے پھٹ پڑا تھا۔
”اس کی کیا کہہ رہا ہے؟“

”اماں! پوچھ زہرہ سے کہ یہ کیوں گئی تھی ٹھاکروں
کی حویلی؟ نہ یہ جانی ادھر نہ وہ مینہ تھانے دار اسے
دیکھتا نہ وہ جھمن کو رشتہ دے کر بھیجتا اور ذلیل کر کے
نکالنے پہ مجھ سے بدلے کی خاطر مجھے کیس میں پھنساتا
اور یہ بے وقوف لڑکی پھر تھانے چلی گئی۔“ وہ بولتا گیا۔
چاچی حق دق سنتی رہی اور زہرہ اس کے توجہ سے
جیسے سارا المیہ بخیر گیا تھا۔

”مایا نے بھی مجھ سے شکایت نہیں کی کہ زہرہ حویلی
آئی تھی اور یہ مایا ہی تھی جس نے صاحب لوگوں سے
بات کر کے میری ضمانت کروائی ہے۔ مت کوٹنے دیا
کر واسے اماں! وہ اتنی بری نہیں ہے جتنی تم دونوں
اسے سمجھتی ہو۔“

اس نے ”دونوں“ کہا تھا، شاید اسے علم تھا کہ زہرہ
تک آواز جا رہی ہے، چاچی بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ اور
وہ اٹھ کر باہر نکل گیا۔ زہرہ کو بت بنا دیکھ کر کابھی نہیں
بس باہر چلا آیا۔



روزہ تھانے جاتا تھا، تفتیش شروع تھی، نادر شاہ
کو حراست میں لے لیا گیا تھا مگر معاملہ ابھی دبا نہیں تھا

رسخیدہ نگاہ ڈال دیتا،

ہی تھی تو بس ایک

باری، آدھی رہ گئی

پار کی ہی تھی کہ

شب اس کے قدم

لگان ہو گئی تھی۔

دیکھنا اس میم کی

قدم رکھا تھا حویلی

مپر۔

سے آیا ہے نہ کہ

پڑا تھا۔

نئی تھی ٹھاکروں

تھانے دار اسے

اور ذلیل کر کے

بس میں پھنساتا

۔ وہ بولتا گیا۔

کے تو جسم سے

ما کہ زہر حویلی

ب لوگوں سے

یت کو سنے دیا

قتی تم دونوں

علم تھا کہ زہرہ

رہ گئی۔ اور

ر کا بھی نہیں

خی، نادر شاہ

دیا نہیں تھا

اند بھی تک مشتبہ تھا کہ اس کی گویاں سے پرانی دشمنی

تھی۔ صرف اور صرف ایک شخص اس قصے سے اس

کی گلو خلاصی کروا سکتا تھا اور وہ تھا قبرستان کا بھوت۔

وہ پھوڑے آگیا۔ دیوار کے ساتھ ایک کونے میں

اس کا شکاری کتا شیرو بندھا تھا۔ زنجیر سے وہ اپنے پاؤں

اور دم کو چالے جا رہا تھا۔

”رکھے۔ رکھے!“ بدر نے ملازم کو آواز دی۔

رکھا دوڑتا ہوا آیا۔

”جی مالک۔“ اس کیلے ہاتھ قیص کے دامن سے

پانچے۔

”یوں کرو مری۔“

اسی پل شیرو نے رکھے کو دیکھتے ہی بے تحاشا بھونکنا

شروع کر دیا۔ بدر نے بات روک کر اسے دیکھا۔ ”کیا

ہوا؟“

”گوشت ڈال رہا تھا دیگ کے لیے۔ ہاتھ دھو لیے

تھے پھر بھی اس کو بو آ جاتی ہے۔“ وہ جیسے پھنچلا کر شیرو

کو دیکھنے لگا۔ ”بڑی ناک ہے اس کی، دور سے ہر شے

سوناٹھ لیتا ہے۔ اچھی قسم کا گوشت ہو تو زیادہ بھونکتا

ہے۔“ رکھا کہہ رہا تھا اور وہ جیسے خواب سے جاگا۔

”اُوہ خدا! میں نے پہلے کیوں دھیان نہیں دیا اس

بات پر؟“

”یوں کرو اس کا گوشت وغیرہ ساتھ لو اور اسے

برے ساتھ لے کر آؤ، جلدی سے۔“ وہ تیزی سے

ہدایت دیتا اصطبل کی طرف بڑھ گیا۔

اور جب وہ تینوں پرانے قبرستان پہنچے تو رکھا ڈر کے

پچھے ہٹا ”صاحب! میں اندر نہیں جاؤں گا۔“

”اندر جانا بھی نہیں ہے۔“ وہ چڑ کر بولا اور زنجیر اس

کے ہاتھ سے لے لی۔

”پھر کیا ہے؟“

”شیرو کو ادھر باندھ رہا ہوں، صبح کھول دیں گے۔“

”مگر کیوں صاب یہ تو۔“

”میرے باپ مت بنو۔“ اس نے جھڑکا، پھر شیرو

کی زنجیر خستہ حال پھانگ کے ساتھ ایک جگہ سے

باندھ دی۔ ”اب جو بھی اندر جائے گا، اسے شیرو کو

پھلانگ کر جانا ہو گا اور ایسے میں اس کی بوتو دھپائی لے

گا۔“ وہ اس کو کھلا بھی چھوڑ سکتا تھا مگر اس صورت

میں شیرو شاید اس بھوت کا قیمہ ہی کر دیتا، جبکہ بدر یہ

نہیں چاہتا تھا۔

کتے کو باندھ کر اس نے ایک الوداعی نگاہ پرانے

قبرستان پہ ڈالی۔ ستیاہ حال قبریں، ٹوٹے پھوٹے کتبے

ان پہ جھکا سایہ کرنا برگد کا وہ بوڑھا اس درخت اور

قبرستان کی خاموشی پر اسرار فضا۔ ان دیکھی سفید

لبادوں میں ادھر ادھر اڑتی روہیں۔ گو کہ وہاں کچھ

بھی نہ تھا مگر اس کا خیال اسے دور لے گیا۔

”شیرو میری بات سنو، کسی کو اندر نہیں جانے دیتا،

مارنا بھی مت مگر اندر مت جانے دیتا۔“ وہ اسے

سمجھاتا گیا اور شیرو دم مٹی پہ مارنا زمین پہ بیٹھ گیا۔

☆ ☆ ☆

”ملک صاب۔۔۔ ملک صاب!“ کسی نے صبح

سویرے اس کا دروازہ پیش ڈالا تھا۔

وہ ہڑبوا کر اٹھا۔

رکھا اس پکارنے کے ساتھ ساتھ دروازہ زور زور

سے بجا رہا تھا۔ وہ تیزی سے پلنگ سے اتر اور دروازہ

کھولا۔

”سب خیر تو ہے؟“

”خیر نہیں ہے ملک صاب۔۔۔“ حواس بانٹتے

رکھے کا سانس پھولا ہوا تھا۔

”ہوا کیا ہے؟“

”شیرو کو کسی نے قتل کر دیا ہے اس کی لاش پرانے

قبرستان کے باہر پڑی ہے۔“

وہ اسے دیکھتا رہ گیا۔ شاید وہ کچھ کہنے کے قاتل ہی

نہ رہا تھا۔ صدمہ بہت شدید تھا۔

”یوں لگتا ہے کہ زبردست مارا ماری ہوئی ہے جی،

شیرو جوان منڈا تھا، شاید جم کر مقابلہ کیا تھا مگر ظالموں

نے ٹوکے سے گردن ہی کاٹ دی اس کی۔“

”چلو!“ اس نے قیص کے مٹن بند کیے، جوتی پسی

اور باہر نکل آیا۔

”بدر۔۔۔ ناشتہ تو کر لے۔“ اماں پکارتی رہ گئی مگر وہ تقریباً ”بھانگتا ہوا پاپا ہر جا رہا تھا۔“

وہ ان بڑے قبرستان کا پھانک بند تھا، پھانک کی طرف سیر کی لاش پڑی تھی۔ وہ پھلو کے بل گرا رہا تھا، گردن پہ کسی تیز دھار آلے کا نشان تھا شاید کلہاڑی کے دو چار وار کیے گئے تھے، قریب ہی ڈھیر سارا خون پڑا تھا۔

اس کے قدم ست بڑ گئے۔ دل میں ڈھیروں دکھ اتر آیا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا سیرو کے قریب آیا اور بچوں کے بل زمین پر بیٹھا دکھ سے اسے دیکھ گیا۔

وہ اس کا بہت پرانا بہت وفادار دوست تھا۔ وہ ہمیشہ اس کے لیے بہترین گوشت، بہترین دودھ منگواتا تھا۔ وہ بہت خوشخوار تھا، مگر بدر کی آنکھ تک کا اشارہ سمجھتا تھا۔ اسے یاد تھا جب وہ اسے ادھر باندھ کر گیا تھا تو اس کی ہدایت سن کر وہ کتنی سمجھ داری سے بیٹھ گیا تھا جیسے واقعی وہ کسی کو اندر نہیں جانے دے گا۔

وہ ایک دم چونکا، اسے یاد آیا، اس نے سیرو کو قبرستان کے باہر باندھا تھا تاکہ وہ کسی کو اندر داخل نہ ہونے دے، اسے اندازہ تھا کہ قبرستان کا بھوت پھانک کھول کر اندر داخل ہوتا تھا، وہ چاہتا تو چھوٹی سی چار دیواری کو پھاند بھی سکتا تھا، مگر جانے کیوں وہ ہمیشہ پھانک استعمال کرتا تھا۔ اس نے اس لیے کتے کو باہر باندھا تھا جبکہ اب اس کی زنجیر کھلی پڑی تھی۔ جیسے کسی نے ہاتھ سے کھولی ہو نہ کہ سیرو نے نرالی ہو۔ قریب ہی تازہ مٹی کی کھدائی کا نشان تھا۔

بات کچھ سمجھ میں نہ آتی تھی۔ کیا وجہ تھی کہ کتے کو بھوت نے کھول دیا تھا؟

اس نے بغور دیکھا۔ سیرو کی لاش سے چند قدم دور گوشت کا ایک ٹکڑا پڑا تھا۔ اس کے ساتھ ایک فاخستہ اور دو گلبریاں مری پڑی تھیں۔ بات اس کی سمجھ میں آنے لگی۔

چغہ پوش کو یقیناً ”کتے کی بابت علم ہو گیا تھا، سو وہ زہر آلود گوشت ساتھ لایا تھا، اس نے یقیناً اس کے سامنے گوشت پھینکا تھا سیرو گوشت کو دیکھ کر ترب کر

آگے بڑھا ہو گا اور گوشت کو شاید اس نے سونگھا بھی ہو مگر جیسے ہی چغہ پوش نے اندر داخل ہونا چاہا ہو گا اسے مالک کی ہدایت کے پیش نظر وہ لپک کر اس کو روکنے لگا ہو گا۔ تو اپنے دفاع میں بھوت نے اسے مار ڈالا ہو گا۔ گوشت پڑا کا پڑا رہ گیا اور گلبریاں اور فاخستہ اس کا شکار بن گئیں۔

”پھر یہ مٹی؟ اور کھلی زنجیر؟“ وہ غور سے مٹی کو دیکھنے لگا۔

پھانک کے قریب مٹی کی چھوٹی ڈھیری تھی، ساتھ کھدائی کا نشان تھا۔ جسے پچھلی رات تازہ کھدائی کی گئی ہو یعنی کہ بھوت نے کتے کو مارنے سے پہلے کھدائی بھی کی اور جب کتا بھونکنے لگا یا اس کے پیچھے بڑ گیا تو اس نے جاتے جاتے کتے کا کام تمام کرنا مناسب سمجھا مگر کیوں؟ اسے کتے سے کیا خطرہ تھا؟ وہ آرام سے دیوار پھاند کر بھی تو جا سکتا تھا، اس نے کتے کو مارنا کیوں ضروری سمجھا؟ شاید اسے ڈر ہو کہ کتا اس کی بو بگایا ہے، اس نے کتے کو زہر آلود گوشت سے مارنا چاہا اور کتے نے حملہ کر دیا ہو تو اس نے اپنے بچاؤ میں کتے کو قتل کر ڈالا ہو۔

وہ ادھر ادھر زمین پہ غور سے دیکھتا پھانک تک واپس آیا۔ چو نہیں سیرو کی لاش کے ارد گرد رینگ رہی تھیں۔ سیرو کی گردن پہ خون جم چکا تھا۔ اس نے جھک کر سیرو کا منہ کھولا۔ کچھ معلوم نہ ہوتا تھا کہ اس نے چغہ پوش کو کتنا ہے کہ نہیں۔ کیا کرے؟ اور پھر وہ ٹھہر گیا۔

سیرو کے بچوں پہ ناخنوں کے اندر گوشت کے ریشے پھنسنے تھے اور معمولی خون بھی جما تھا۔ یعنی سیرو نے بھوت پہ بچوں سے حملہ کیا تھا اور یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ خون رس کر سیرو کے بچوں پہ بھی لگ گیا تھا۔ یہ خون اس کا اپنا خون نہ تھا کہ اس کے ساتھ ریشے بھی تھے۔ یعنی اس وقت چغہ پوش کے جسم پہ کتے کے کانٹے کا نشان موجود تھا۔

وہ ادھر ادھر پھر سے دیکھنے لگا۔ اس کے نوکروں کے قدموں نے کھرے تباہ کر ڈالے تھے ورنہ اسے امید

نے سو گھا بھی
اغل ہوتا چلا ہوگا
وہ لپک کر اس کو
بت نے اسے مار
یاں اور فاختہ اس

غور سے مٹی کو

ہری تھی ساتھ
نہ ہدائی کی گئی
ہلے ہدائی بھی
چھپے پڑ گیا تو اس
سب سمجھا مگر
آرام سے دیوار
تے کو مارنا کیوں
سکی بویا گیا ہے
رنا چلا اور کتے
کے کو قتل کر

بھانک تک
روگرد رنگ
تھا۔ اس نے
وتا تھا کہ اس
نے؟ اور پھر وہ

ت کے ریشے
نی شیرو نے
اتا شدید تھا
گیا تھا۔ یہ
ریشے بھی
پہ کتے کے

نو کروں کے
اسے امید

تھی کہ اس صورتحال کے بعد چغہ پوش کو کھرے مٹانا
یاد نہیں رہے ہوں گے۔ پھانک کے باہر دائیں طرف
ملا خراسے تین قطاروں میں کھرے نظر آ گئے۔ اس
نے آگے پیچھے کے کھرے تباہ ہو چکے تھے۔

وہ غور سے انہیں دیکھنے لگا۔ وہ قدموں کے کھرے
تھے، جو تکی کے نہیں دائیں پاؤں کا کھرہ صاف تھا، بائیں
پاؤں کا کھرا آدھا تھا جیسے چغہ پوش بس اڑی ہی نہ زور
دے کر پنجہ اٹھائے چل رہا ہو۔ کیا وہ لنگڑا تھا؟ مگر نہیں
شاید وہ لنگڑا کر چل رہا تھا یقیناً "شیر و نے اس کی ٹانگ
پر زخم دیا تھا اور وہ زخم یقیناً "ٹانگ کے خاصے پچلے حصے
پاؤں تھا کیونکہ بائیں ٹھروں پہ خون کے تین چار
نقطے گرے تھے۔ زخم شدید تھا یا وہ کھر اس کا تھا؟ یہ
صرف کوئی کھوجی بنا سکتا تھا مگر کھوجی پولیس کا آدمی تھا
۔ وہ نادر شاہ کے اب کسی بندے پہ بھروسہ نہ کر سکتا
تھا۔

بہر حال مرتے مرتے بھی شیر و اپنا کلام کر گیا تھا۔
اسے اب گاؤں میں کسی ایسے شخص کو ڈھونڈنا تھا جس
کے پاؤں یا پنڈلی پہ تازہ زخم ہو، یا جو لنگڑا کر چلتا ہو۔
شیر و نے مرتے مرتے بھی وفا واری نبھادی تھی۔

"حکیم جی اندر ہیں ماسی؟"

اس نے سب سے پہلے ماسی نذیراں کا دروازہ
کھٹکھٹایا تھا۔ دروازہ کھولا اور آنکھیں ملتے ہوئے اسے
دیکھا شاید وہ ابھی سو کر اٹھی تھی۔

"بدر بایو؟" وہ حیران ہوئی، وہ بہت کم ادھر آیا کرتا تھا
"آہاں، حکیم جی اندر ہیں، آؤ اندر آؤ۔"

وہ اسے بیٹھک میں لے آئی۔
"بیٹھو ملک صاب۔" وہ کپڑے سے جگہ بھاڑنے
لگی "خیر ناں آئے ہو؟"

"ہاں جی۔" وہ سوچتے ہوئے بیٹھ گیا۔ "بس حکیم
جی سے کام تھا۔"

ماسی نذیراں دروازے تک جاتی ٹھٹک کر پلٹی "کیسا
کام؟"

"ایک مریض کا پوچھنا تھا، وہ ادھر آیا تھا شاید۔"

"کس ویلے؟"

"کل رات۔"

"کل رات؟" وہ حیران سی سوچ میں پڑ گئی۔

رات تو بس مولوی غفور کی بیوی آئی تھی بچے کی دوائی

لینے اسے برقان تھا۔

"تم حکیم جی کو بلاؤ شاید انہیں علم ہو۔" اس نے

بے چینی سے پہلو دلا۔

وہ ادھر اس لیے آیا تھا کیونکہ بجلی میں حکیم جی کتے

کانے کا علاج کرنے والے واحد حکیم تھے۔ اگر چغہ

پوش بھوت کو شیر و نے کاٹا تھا تو وہ یقیناً "ادھر ہی آیا ہو

گا۔ وہ سری صورت یہ تھی کہ وہ شہر چلا جاتا، وہ یہ بھی کر

سکتا تھا۔ لیکن اگر وہ بھوت جو کسی شہکھو ہی تھا تو لازماً

ادھر ہی آتا۔

دروازہ کھلنے کی آہٹ ہوئی تو وہ بے اختیار کھڑا ہو گیا۔

حکیم جی اندر داخل ہوئے۔ پچاس سے اوپر کا سن

تھا، ڈھلکے کندھے، سر پہ ٹوپی اور شانے پہ صاف لانا

سراستخوالی وجود۔ اسے دیکھ کر گرجو شے مصافحہ کیا۔

"کیسے آئے پیر؟" پھر بیٹھتے ہوئے بولے "نیک

بخت تیرا رہی تھی کہ کسی مریض کا پوچھنا تھا۔"

"ہاں جی۔" وہ بے چینی سے بولا۔ "کل رات کوئی

شخص کتے کے کانے کا زخم پنڈلی یا پاؤں پہ لیے آیا

تھا۔"

"کل رات؟" وہ حیران ہوئے "نہیں۔ ہرگز نہیں۔"

"پھر سے سوچ کر بتائیے۔" اسے ڈر تھا کہ اس نے

رشتہ دے کر حکیم کا منہ بند نہ کر دیا ہو۔

"نہیں، کل رات تو کوئی نہیں آیا۔ بس چاچی غفور

کے بچے کو برقان۔"

وہ پوری بات نے بغیر اٹھ کھڑا ہوا۔

"شکر یہ حکیم جی! چلتا ہوں۔" حکیم جی "میں ہیں"

کرتے رہ گئے وہ تیزی سے باہر نکل گیا تھا۔

اگر وہ حکیم جی کے پاس نہیں آیا تو یقیناً "اس کے

پاس خود کوئی توڑ ہو گیا وہ شہر گیا ہو گا۔ یہ بھی ممکن ہے جوگی شیکھو کے پاس توڑ ہو وہ دوڑا دینے کا کام بھی کرنا تھا، لیکن اگر وہ شہر گیا ہے تو وہ جان کارلس ہو سکتا تھا۔ جانے کیوں پاربار۔ اس کا ذہن بھٹک کر جان کارلس کی طرف جاتا تھا۔ وہی تھا جو شیکھو کے قتل میں ملوث تھا، وہی تھا جو اس رات قبرستان میں تھا۔ اسی نے بلیا کو دھکی دی تھی اور یہی دھکی بھوت نے بھی دی تھی۔

اسے اب ان دونوں افراد کو از سر نو چیک کرنا تھا۔ حویلی واپس آکر اس نے ایک رقعہ لکھا۔

”میں قبرستان کے بھوت تک پہنچ چکا ہوں۔ شام تک۔ حاضر ہو کر بتاؤں گا رقعہ ملازم کو دے کر مایا کی طرف روانہ کیا۔

اب اس کا سر جوگی شیکھو کی کُتیا کی طرف تھا۔

آج پھر اس کا چیلایا ہر بیٹھا تھا۔ وہ اس کے قریب گیا۔

”بلیا سے ملتا ہے۔“
”یہ عمل کا وقت ہے، منگل کو آنا۔“ چیلے نے رعب سے ڈنکا۔

”منگل تو کل گزر گئی۔“ اس نے کہتے ہوئے چند کتے نکالے اور انہیں ایک ہتھیلی سے دوسری میں منتقل کیا۔ کتے ٹھٹھک اٹھے۔ چیلے نے بے اختیار ادھر دیکھا اس کی آنکھوں میں چمک اٹھی۔

”کو تو اگلی منگل کو آجاؤں؟“
”نہیں، نہیں، تمہارے لیے وقت نکل سکتا ہے۔“

”بہت بہتر۔“ اس نے کتے اس کی جھولی میں ڈالے اور اندر کی جانب بڑھ گیا۔

خیمے میں آج بھی وہی تعفن پھیلا ہوا تھا، کپڑے کی دیواروں پر الٹے سیدھے حروف لکھے تھے۔ ایک کوٹنے میں ہنڈیا چل رہی تھی جانے اندر کیا پک رہا تھا۔

شیکھو بلیا چوڑی مارے گھٹنوں پہ ہاتھ رکھے

آنکھیں موندے بیٹھا تھا۔ وہ ایک نظر اس کے چہرے کے اندر چھپے پاؤں والے کر مڑوب سا بیٹھ گیا۔
”بول کیا ملتا ہے۔“

”اپنی بیوی کو حضور کے پاس علاج کے لیے لانا چاہتا ہوں۔ اس دن لایا تھا، اگر سرکار کو یاد ہو۔“ جوگی نے آنکھیں کھولیں اور اگلے ہی بل اسے پہچان گیا۔ اس کی لال انگارہ آنکھوں میں ریشمی دوڑ گئی۔

”ہاں ہاں یاد ہے۔ آگے بول۔“ پھر اس کے پیچھے خیمے کے دروازے کو دیکھا ”بیوی کہاں ہے؟“

”وہ نہیں آئی، وہ آپ سے علاج کروانے سے ہٹ چکی ہے حضور۔“

اب کے جوگی نے آنکھیں سکوڑ کر اسے دیکھا۔

”سرکار۔“ وہ قدرے آگے کو ہوا ”میری بیوی کہتی ہے میں جسم کو دوانے والے سے اپنا علاج کیونکر کروا سکتی ہوں؟“

”ہائیں؟ ہم اپنا جسم نہیں گودواتے!“

”پر سرکار! وہ کہتی ہے کہ اس نے خود دیکھا تھا، آپ نے اپنی پائیں ران گودا رکھی ہے، وہ کہتی ہے جب تک اسے تسلی نہ ہو جائے کہ ایسا نہیں ہے، وہ نہیں آئے گی۔ اسے وہم ہوتے ہیں۔“

”نہیں۔۔۔ کدھر؟ جوگی نے پریشان ساہو کر چہرہ بنا کر اپنی سوکھی سڑی پائیں پٹلی۔ سامنے کی بدر نے بے اختیار گردن اونچی کر کے دیکھا۔

اس کی پٹلی بالکل صاف تھی نہ کتے کے کالے کا کوئی زخم تھا نہ ہی گودوانے کا نشان (Tattoo)

”ٹھیک ہے سرکار۔“ وہ جیسے نتیجے پہ پہنچ گیا تھا ”میں اسے شام کو لے آؤں گا اجازت دیجئے۔“

تو اس کا اندازہ ٹھیک تھا، وہ چہرہ پوش کوئی اور نہیں، بلکہ جان کارلس تھا اب اسے صرف اور صرف اپنے شک بلکہ یقین کی تصدیق چاہیے تھی۔

☆ ☆ ☆

آج شاید قسمت اس کا ساتھ دے رہی تھی، وہ جیسے ہی گھوڑے پہ سوار گاؤں سے نکلنے لگا، جان

ہمارے اس کے چنے
گیا۔

کے لیے لانا چاہتا
وہ۔ ”جوگی نے
چان گیا۔ اس
ن۔

اس کے پیچھے
ہے۔“

روانے سے

دیکھا۔

یہ یوی کہتی
تھی کیونکر کروا

صاف تھا، آپ

ہے جب
ہے وہ نہیں

اہو کر چنے
کی بدر نے

کالے کا

(T

ج گیا تھا

”

ور نہیں

ف اپنے

تھی وہ

کا جان

کارلس اپنے گھوڑے پر سوار سامنے کچی سڑک سے
آتا دکھائی دیا۔ بدر کو لگا، آج ساری گتھی سلجھ جائے گی۔

”آہ۔ ڈی سی ہمارے۔“ اس نے گھوڑا روک لیا
اور مسکرا کر اس کا استقبال کیا ”یقین کیجئے مہاراج! میں
ابھی آپ سے ملاقات کے لیے ہی جا رہا تھا۔“
”کوئی خاص کام تھا۔“ جان کارلس نے
بھی گرم خوشی دکھائی۔

وہ دونوں کچی سڑک کے وسط میں آئے سامنے
گھوڑوں پر تھے ”اطراف میں بیلے کے درخت سرواچھا
کے کھڑے تھے۔

”آپ کو کچھ دکھانا تھا مہاراج!“ اس نے ذرا کی ذرا
نگاہ جان کارلس کی پتلون میں چھپی بائیں ٹانگ پر ڈالی
پاؤں میں بوٹ اور جرائیں تھیں اور اوپر کوٹ اور سریر
ہیٹ۔

”ارے وہ کیا؟“ کارلس متحس ہوا۔

”نہر میں مجھے کچھ دکھائی دیا ہے، تھانہ اریہ بھروسہ
نہیں ہے سو آپ کو زحمت دوں گا، یوں لگتا ہے جیسے
کسی وادرات کا سراغ مل گیا ہو۔ آپ میرے ساتھ
چلیے۔“ وہ بار بار ایک چورنگاہ اس کی ٹانگ پر ڈالتا تھا۔
”کیوں نہیں۔“ کارلس تیار ہو گیا۔ ”تجھی چلو۔“
وہ دونوں اپنے گھوڑے آگے پیچھے نہر کے قریب
لے آئے۔ کارلس متلاشی نگاہوں سے ادھر ادھر

دیکھنے لگا۔

”شما کیجئے مہاراج! آپ کو زحمت ہوگی، مگر آپ کو
اتنا بڑے گا۔“

”ہاں کیوں نہیں۔“ کارلس ہیٹ سنبھالتا گھوڑے
سے اتر آیا۔ اس کی چال سے کچھ ظاہر تو نہ ہوتا تھا، مگر
اصل اندازہ اس کی پنڈلی دیکھ کر ہی کیا جاسکتا تھا۔

”ادھر آئیے۔“ بدر نہر میں اتر آیا اور پانی میں ہاتھ
مارنے لگا جیسے کچھ ڈھونڈ رہا ہو۔ کارلس متذبذب سا
کنارے پر کھڑا رہا۔

”آجائے مہاراج، مجھے یہاں خون نظر آیا تھا،
یقیناً کوئی لاش قریب ہی ہے۔“ اس سے آگے

کارلس کو کچھ کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ ”اچھا،“ کہہ کر
وہ پانی میں اترنے کے لیے تیار ہو گیا۔

بدر پانی میں ہاتھ روک کر اسے دیکھنے لگا، اسے
معلوم تھا کہ جان کارلس جیسا فرنگی ہمارے پتلون اوپر
چڑھا کر ہی پانی میں اترے گا اور ہی اسے دیکھنا تھا۔
کارلس جھکا اور پتلون اوپر موڑنے لگا۔ دائیں پنڈلی
سامنے آئی، اب وہ جوتے اتار کر بائیں طرف کی پتلون
اوپر تہہ کر رہا تھا۔

بدر ہاتھ روکے دم ساڑھے اسے دیکھتا رہا اور پھر
اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ کارلس کی سرخ و سفید
ٹانگ بالکل صاف تھی۔ ہلکے سے سنہری بالوں کے
روئیں کے علاوہ کسی قسم کا کوئی نشان نہ تھا۔
اس کا دل غ ہلکے سے اڑ گیا۔

پھر وہ کون تھا؟؟؟

کارلس اب پانی میں اتر رہا تھا۔ بدر کو ایک دم ہی وہ
بے حد معصوم نظر آنے لگا۔ وہ تو بے قصور ہی تھا۔
بھوت تو کوئی اور تھا اور یقیناً اب تک گاؤں سے
بھاگ چکا تھا۔ اب وہ مایا کو کیا بتائے گا، اس نے تو
بھوت پکڑنے کا دعوا کر دیا تھا۔

شدید شرمندگی، زک اور مایوسی نے اسے ایک آن
گھیرا۔ وہ پھر سے وہیں کھڑا تھا جہاں پہلے دن تھا۔ کوئی
سراغ، کوئی سرا، کوئی نشان اس کے ہاتھ نہ تھا۔

بہت مشکل سے کارلس سے جان چھڑا کر وہ
راجپوتوں کی حویلی آیا تھا۔ حویلی خاموش اور ویران
پڑی تھی۔ اس کے کلین اندھی دشمنیوں اور
سازشوں کی نذر ہو چکے تھے اس لمحے اس عالی شان
حویلی کے سامنے کھڑے اسے ٹھاکر گھوٹا تھا۔ بے پناہ
ترس آیا تھا۔

کتنی ہی دیر وہ بڑے پھانک کے سامنے کھڑا رہا، یہ

دلہیز اس نے بھی پار نہ کی تھی، پھر آج کیسے کرتا؟

اور تب اسے بالکونی میں وہ سوگوار سی بیٹی سنہری

بالوں والی لڑکی نظر آئی۔ وہ بالکونی میں کرسی ڈالے گود

میں اون کے گولے لیے سلاخیوں پر کچھ بن رہی تھی،
یکبارگی نگاہ اٹھا کر نیچے دیکھا تو چہرہ خوشی سے بھل اٹھا۔

نور زور سے وہ کسی کو آواز دینے لگی اور پھر مسکرا کر
بدر کو دیکھا۔ وہ جواباً مسکرا بھی نہ سکا۔ اسے عجیب سی
خفت ہو رہی تھی۔ وہ مایا کو کیا جواب دے گا؟
روپنی بھاتی ہوئی آئی اور چھانک کھولا۔
”میم صاب آپ کو اوپر بلاتی ہیں۔“
اور اس سے انکار نہ ہو سکا۔ وہ کسی معمول کی طرح
چلتا ہوا روپا کے پیچھے اندر آیا۔

خوبی ویران ہو گئی تھی، فضا سوگوار اور درود پوار مائتم
کنائیں تھیں۔ یہی یہ مہاراجہ بلند پونگھ کا محل ہوئی تھی
اب بس ایک خوبی رہ گئی تھی مگر مہاراجہ کی عظمت اور
شان و شوکت آج بھی اس کے میناروں کے کنٹروں
سے ٹپک رہی تھی۔

وہ میڑھیاں عبور کر کے مایا کے کمرے تک آیا تو
روپا واپس پلٹ گئی۔

دھیرے دھیرے چلتے کرہ عبور کر کے وہ بالکونی تک
آیا۔ سلاخیاں ابھی تک مایا کے ہاتھ میں تھیں، وہ اس
کے استقبال کے لیے اٹھ کر کھڑی ہوئی تو اون کا گولا
زمین پر گر گیا۔

”او ٹھو۔“ وہ یقیناً اس کے آنے سے خوش تھی
بدر بمشکل مسکرا پایا، پھر وہیں منڈیر سے ٹیک لگا کر
کھڑا ہو گیا۔

”کیسے ہو؟“ وہ واپس کر سی پہ بیٹھ گئی، اون کا گولا
جھٹک کر زمین سے اٹھا کر گود میں رکھا، سلاخیاں بھی
چھوڑ دی تھیں۔

”ٹھیک ہوں؟“ اس نے سر جھکا لیا۔ وہ اسے کیا
جواب دے گا؟

”تم نے بھوت کا سر لگ لگایا؟“ وہ بے صبری سے
پوچھنے لگی۔

”میں نے پیچھا تو کیا، مگر۔۔۔“ وہ سر جھٹک کر منڈیر
کے اس پار دیکھنے لگا۔

دور کھینوں کے اوپر سورج کی سرخی گیند نیلے
آسمان پر واضح تھی، چڑیوں کے غول اڑ کر اپنے
آستانوں کو واپس پلٹ رہے تھے وہ اڑتی چڑیوں کو
دیکھ گھبرا گیا۔

مگر کیا؟ تم نے کسی کا پیچھا کیا؟ شیکھو کا؟“
”ہاں مگر میں جان کارلس سے بھی ملا۔“ وہ اب بھی
دور ہوئی چیزوں کو دیکھ رہا تھا۔
”تو کیا وہ بھوت کارلس ہے۔“ وہ بے صبری سے
کھڑی ہوئی تو اون کا گولا زمین پر لڑھکتا چلا گیا۔ دھماکا
کھٹکا گیا، مایا نے جھنجھلا کر اسے پھرتا چاہا مگر گولا دور جا رہا
تھا۔

”ٹھہرو۔“ وہ گولے کے پیچھے گئی جو بالکونی کے
کونے پہ جا کر رکھا تھا اور جھٹک کر اسے اٹھایا۔ بدر گروں
موڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

”ہاں، تم کیا کہہ رہے تھے؟“ وہ گولا اٹھا کر واپس آ
رہی تھی اور بدر بھول گیا کہ وہ کیا کہہ رہا تھا، وہ کیا کہنے
آیا تھا وہ سارا دن کیا کرتا رہا تھا اسے سب کچھ بھول گیا
تھا، وہ بس ایک ٹک سامنے کا منظر دیکھ گیا۔

مایا اون کا گولا اٹھائے اس کے قریب آ رہی تھی۔
بدر نے دیکھا، وہ لنگڑا کر چل رہی تھی، دائیں پاؤں پہ
زور دیتی، پایاں پاؤں قدرے نیچے ٹھارہ کر چلتی وہ واپس
کر سی۔ یہی گولا پھر سے گود میں دھرا اور ٹانگ پہ
ٹانگ رکھ لی تو تائی قدرے اوپر ہو گئی، اس کی بائیں
پنڈلی جھلکی، جہاں تختے سے ذرا اوپر پٹی بندھی تھی۔
وہ جیسے پتھر کا ہو کر رہ گیا۔

”ہاں۔ تم کیا کہہ رہے تھے؟ کون ہے وہ بھوت؟“
وہ اسی طرح عام سے انداز میں پوچھ رہی تھی اور۔۔۔
ساری گھٹیاں سلجھ گئی تھیں۔

”بدر۔۔۔!“ اس نے پکارا تو وہ جیسے خواب سے
جاگا۔

”وہ بھوت تم ہو مایا، وہ جھٹ پوش تم ہو۔ تم ہو جو روز
رات کو جاتی تھیں پرانے قبرستان۔ وہ جھٹ ہمارا ہے
تم تھیں جس نے منگل سنگھ کو مرتے دیکھا تھا اسے
اگر زندگی موقع دیتی تو وہ مجھے بتا دیتا کہ وہ بھوت دراصل
شیکھو کی میم صاب ہے مگر وہ کہہ نہ سکا۔ وہ تم تھیں
مایا، وہ ہمیشہ سے تم ہی تھیں تم نے کل رات شیرو کو مارا
اور یہ بھی جانتی ہو کہ شیکھو کو کس نے مارا ہے تم
جانتی تھیں کہ وہ بھوت نہ گویا ہے اور نہ ہی جوئی مگر

کھڑ کا؟
بلا۔ وہ اب بھی

بے صبری سے
لٹا چلا گیا۔ دھاکا
ہاگھڑ گولا دور جا رہا

جو یا لکونی کے
ٹھایا۔ بدرد گردن

اٹھا کرواپس آ
تھا، وہ کیسے
کچھ بھول گیا

آری تھی۔
اٹس پاؤں پہ
چلتی وہ واپس
اور ٹانگ پہ
سید کی بائیں

بھوت؟
تی اور۔

واب سے

م ہو جو روز
نہارا ہے
تھا، اے
دراصل
تم تھیں
یرو کو مارا
اے، تم
جو کی مگر

تم نے مجھے غلط راستے پہ لگایا تاکہ میں تم پہ شک نہ کر
سوں اور اس رات جب گویا کا خون ہوا تو وہ تم تھیں
میا جس نے نادر شاہ کا جرم دیکھا تھا، وہ تم تھیں مایا۔
اس کا دماغ ابھی تک سائیں سائیں کر رہا تھا اتنا بڑا

دھوکا؟
وہ خاموشی سے اس کا کہا گیا ایک ایک لفظ سنتی رہی
پھر مری سانس لے کر بولی، تو تمہیں جان کارلس نے
سب کچھ بتا دیا؟

تو کارلس سب جانتا تھا، مگر وہ یہ سوچ کر حیران نہیں
ہوا اب کوئی چیز اسے مزید حیران نہیں کر سکتی تھی۔
”جان کارلس تمہارا کیا لگتا ہے؟“ وہ بولا تو اس کی

آواز میں عجیب سی خشکی اور اجنبیت تھی۔ مایا نے
ہولے سے استہزائیہ سر جھٹکا۔
”وہ خبیث بڈھا میرا باپ ہے!“ اور وہ اسے دیکھ کر

رہ گیا۔
سامنے کڑی عورت کون تھی، وہ نہیں جانتا تھا۔ وہ
بہمی جان ہی نہ سکتا تھا۔
”تم کون ہو مایا؟ تم کون ہو؟“

وہ اسی طرح سامنے کھینچتوں کو دیکھ رہی تھی۔ نارنجی
بالوں کے سامنے سے اکاؤ کا پرندے اڑ رہے تھے۔
”تم کیا جانتے ہو میرے بارے میں پیر؟“ وہ بہت

دیر بعد بولی تو آواز میں صدیوں کی تھکن تھی۔
”یہی کہ تمہارا نام مایا فرینڈس ہے تم۔ تم فرنگی
شہزادی ہو، اور اور تم شہکھڑ کی محبت میں ہندوستان

آئیں۔“ مایا نے آہستہ سے چہرہ اس کی طرف موڑا۔
”نہ میں شہزادی ہوں، نہ ہی میں شہکھڑ کی محبت
میں ہندوستان آئی تھی اور نہ میرا نام مایا فرینڈس

ہے۔“ اس کی شہری آنکھوں میں بے پناہ تھکاوٹ
تھی۔ ”میں تو لندن کے تھپڑ کی ایک اواکارہ ہوں بدر!“
میں نے تو بچھم کا شاہی محل آج تک اندر سے نہیں

دیکھا۔“
وہ پھر سے سامنے دیکھنے لگی تھی۔
”میں میرین جان کارلس عرف مایا واتی کون ہوں،
ہندوستان کیوں آئی ہوں، یہی تم سے چھپانے کے لیے

میں نے تمہیں ہر ممکن طریقے سے غلط راستے پہ لگایا،
اس لیے نہیں کہ مجھے تم سے خطر تھا، بلکہ میں
کچھ نہ بگاڑ سکتے تھے۔“ وہ بائیت سے مسکرائی، بدر کو
لگا اس کی آنکھیں بھگنے لگی تھیں۔

”بلکہ صرف اس لیے کہ میں جانتی تھی جس دن تم
جان جاؤ گے، میں تمہارا اعتبار ٹھوہوں کی پھر بھلے
تمہیں اپنی محبت کا لٹنا یقین دلاؤں، تم بھی نہیں مانو
گے کہ اتنے عرصے سے تمہارے ساتھ اداکاری کرنے

والی لڑکی کو واقعی تم سے محبت ہے۔“
اس نے اضطرابی انداز میں بالوں میں انگلیاں
چلائیں، موتیوں کی لڑی سے ہاتھ ٹکرایا تو اس نے
چونک کر اسے انگلیوں کے بیچ تھاوا اور کرب سے

مسکرائی۔
”میں نے بہت چھوٹی عمر میں چاقو دکھا کر لندن کی
ایک سنسان گلی میں ایک امیر ذکیر عورت سے یہ
موتیوں کی مالالونی بھی بعد میں ملا تو کراسے بالوں
میں پرو دیا۔ چوریاں۔ ہاں بہت چوریاں کی ہیں میں

نے۔“
وہ پھر سے وہی ٹوٹی بکھری عام سی ساہی لڑکی لگنے
لگی تھی جو اس یوز جنگل میں درخت کے کٹے تنے پہ
بیٹھ کر رو رہی تھی۔ شاہزادوں کا نقاب جو اس نے
چڑھار کھا تھا، جانے کدھر کھو گیا تھا۔

”تم میری کہانی سننا چاہو گے؟“ وہ جیسے خود پہ
ہنسی۔ بھگی سی ہنسی۔ آنکھوں سے آنسو ٹوٹ کر
چہرے پہ پھسل گیا۔

وہ چپ چاپ اسے دیکھ گیا۔ اس کی سمجھ میں
نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے مگر ایک بات طے
تھی اسے اب اس کے کسی آنسو کا اعتبار نہیں رہا تھا۔
اس کی خاموشی پہ وہ خود سے کہنے لگی۔

”میرا نام میرین جان کارلس عرف مایا واتی ہے۔
میرین کے نام سے میرا۔ بسمہ ہوا تھا یہ نام مجھے میرے
باپ جان کارلس نے دیا تھا اور مایا واتی میری ہندوستانی

ماں نے۔ ہندوستان میں فرنگیوں کی ہندوستانی عورتوں
سے اولادوں کے دو نام ہوتے ہیں۔ میری ماں کارلس

کی بیوی نہیں تھی وہ صرف اس کی ”بی بی“ تھی کارلس میراپ نہیں ہے یہ کارلس کو بہت دیر سے علم ہوا۔

میری ماں اپنے حقوق کے لیے ساری عمر کارلس کی منت کرتی رہی کہ وہ اس سے شادی کر لے، انگریز سرکار کی عدالت میں مگر کارلس نے ایسا نہ کیا، پھر جب اس کی پوسٹنگ واپس برطانیہ ہوئی تو وہ مجھے ساتھ لے گیا۔ میری ماں مجھے روٹی رہی، بلکٹی رہی، اور پھر اڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گئی۔ اسے جگر کا سرطان تھا، اس نے مجھے سے کارلس کو بہترے خط لکھے مگر وہ واپس نہ آیا، نہ اس نے مجھے میری ماں کے حوالے کیا۔ حالانکہ فرنگیوں کے حرم میں داخل ہونے والی ہر بی بی کی طرح میری ماں بھی جانتی تھی کہ اس کی اولاد بھی اس کی نہیں رہے گی مگر اس وقت دولت کی ہوس میں وہ اتنی اندھی تھی کہ اس نے یہ نظر انداز کر دیا۔ جب کارلس واپس نہ آیا تو اس نے اسے ایک آخری خط لکھا جس میں بہت سی گالیوں کے علاوہ یہ بھی بتایا کہ میں کارلس کی اولاد نہیں بلکہ اس کے ایک فرنگی دوست کی اولاد ہوں جو اکثر ہمارے گھر آیا کرتا تھا۔ اس خط کے پینچنے کے تیسرے روز میری ماں مر گئی۔

تب میں نو برس کی تھی۔ جب کارلس کو یہ علم ہوا، اس نے مجھے ایک بوجھ کی طرح بالا۔ وہ مجھے دن رات میری ماں کے طعنے دیتا تھا، مگر کبھی کبھی اسے لگتا تھا کہ میری ماں نے آخری وقت یہ جھوٹ اس لیے بولا تاکہ وہ تنگ آکر مجھے ہندوستان واپس اس کو دے آئے مگر پھر جب وہ میرے نین نقش دیکھتا تو اسے لگتا میں اس کی بیٹی نہیں ہوں۔ اس کے لیے میں بوجھ تھی۔ بہت بڑا بوجھ۔

وہ مجھے بورڈنگ میں داخل کرا کے دوبارہ ہندوستان چلا گیا۔ سال میں ایک آدھ بار جانے کس جذبے کے تحت ملنے آتا تھا، میں کبھی نہ جان سکی۔ میں یتیموں کی طرح بڑی ہوتی گئی۔ نہ میں بڑھائی میں اچھی تھی، نہ کھیل کود میں، میری شکل بھی معمولی سے ذرا اچھی تھی میں غریب لڑکی تھی یہاں تک کہ وہ دن آن پہنچا

جب میری سرایڈ منڈ سے پہلی ملاقات ہوئی۔

وہ اتنا کہہ کر چپ ہو گئی۔ تاریخی بادل شام کی گرمی ٹیلا ہٹ میں بکھرتے جا رہے تھے۔ اس کے لیول پر مغموں سی مسکراہٹ تھی۔ وہ یہاں نہیں تھی وہ کہیں دور بہت دور، بہت پیچھے تھی کھوٹی ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں ایک منظر بھللا رہا تھا۔ اسکول کی ایک راہداری میں سے گزرتا وہ کوٹ اور ہیٹ میں ملبوس ادھیڑ عمر شخص جو ساڑھی ٹیچر سے مصروف انداز میں بات کرتا ایک دم راہداری کے سرے پہ ٹھٹک کر روک گیا تھا۔

”سرایڈ منڈ تھیر کے بہت بڑے اداکار و ہدایت کار تھے، ان کی میرے اسکول کے ایک استاد سے دوستی تھی، اس سے کسی کام کے سلسلے میں وہ اسکول آئے تو راہداری میں سے گزرتے انہوں نے میری آواز سنی۔ میں دوسری طرف پیڑھیوں پہ بیٹھی اپنے خرگوش سے باتیں کر رہی تھی، کبھی بی بی کی آواز نکالتی، کبھی شیر کی، کبھی ہاتھی تو بھی طوطے کی، کبھی مٹی بن کر ڈالتی، کبھی ڈیڈی بن کر ہلاتی، تو کبھی سٹھیانی ہوئی بوڑھی لینڈ لیڈی بن کر کراہی مانتی۔“

میں خرگوش سے عادتاً ”کھیل رہی تھی“ وہ بھلا کہاں سمجھتا تھا، مگر سرایڈ منڈ نے سمجھ لیا۔ وہ لپک کر میرے پاس آئے اور مجھ سے پوچھنے لگے کہ میں نے یہ فن کہاں سے سیکھا ہے۔ میں ڈر گئی، میں نے کہا، میں نہیں جانتی۔ انہوں نے مجھ سے میرے ماں باپ کے متعلق سوالات کیے تو میں نے بہت مہارت سے

پے در پے جھوٹ بولے۔ وہ سن کر سمجھ کر چلے گئے اور بعد میں میرے کانڈزات نکلائے تو تمام معلومات اس کے برعکس نکلیں۔ وہ واپس میرے پاس آئے، غصہ کرنے نہیں بلکہ یہ بتانے کہ میں ایک دن تھیر اور فلم کی ایک بہت بڑی اداکارہ بنوں گی اور یقین مانو میں نے ان کا اعتبار نہیں کیا۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ اگر مجھے تھیر میں کبھی چالس چلا سے ہو تو ان کے پاس آجاؤں، میں نے ان کا پتہ لے لیا۔ اس وقت میں چودھویں برس میں تھی۔ مجھے معلوم تھا میں ان کے پاس کبھی

تہ ہوئی۔

فی بادل شام کی گرمی
اس کے لبوں پہ
نہیں تھی فہمیں
ہوئی۔ اس کی
اسکول کی ایک
بیت میں ملبوس
موقوف انداز میں
پہ تھک کر رک

کار وہدایت کار
ستار سے دوستی
اسکول آئے تو
ہری آواز سنی۔
بے خرگوش
لٹی، کبھی شیر
ن کر ڈالتی،
ہوئی بوڑھی

تھی وہ بھلا
وہ لپک کر
میں نے یہ
نے کہا میں
پاپ کے

سے

گئے اور

ات اس

نے غصہ

نراور فلم

میں نے

اگر مجھے

جاؤں

بھویں

کبھی

نہیں جاؤں گی۔

وہ رک کر ہو لے سے ہنسی، پھٹکی، ماتم کناس سی ہنسی۔

سورج اب ڈوب رہا تھا، سرخی مائل روشنی میں بدور
رکھ سکتا تھا اس کی آنکھوں کے گوشے ابھی تک بھیجے
تھے۔

”اور پورے دو برس بعد میں ان کے تھپڑ کے باہر
کھڑی تھی۔ مجھے اسکول سے خارج کر دیا گیا تھا،
میرے پاس کھانے کو پھولی کوڑی نہ تھی تب میں نے
پل دفعہ چوری کی اور یہ موتی چرائے۔

پھر بھی مجھے ہاتھ نہ آیا تو میں نے سر ایڈمنڈ کے تھپڑ
چلی گئی۔ وہاں کسی نے مجھے داخل نہ ہونے دیا۔ معلوم
ہوا کہ سر ایڈمنڈ کو تو مرے ڈیڑھ سال ہو چلا تھا۔ میں
نے کئی مہینے تھپڑوں اور اسٹوڈیو کے چکر لگائے، مگر
وہاں کوئی مجھے اندر داخل نہ ہونے دیتا تھا۔ کارلس
بھی واپس آیا ہی نہیں، میں چھوٹی موتی چوریوں پہ
گزارا کرتی رہی۔ پھر ایک روز مجھے ایڈ کر ملا۔ لوئی
ایڈر۔ وہ فرانسیسی ماں کا بیٹا تھا۔ تھپڑ کا بہت پرنام۔
میں روز اس کو دیکھتی تھی پھر ایک دن میں نے اس کے
گھر تک اس کا پیچھا کیا اور رات دیر تک انتظار کرتی
رہی، پھر جب چوکیدار کو خبر ہوا تو میں دیوار پھاند کر
اندر چلی گئی اور سوتے ہوئے لوئی کی گردن پہ چاقو رکھ کر
اسے اٹھایا۔

وہ بہت بڑا اداکار تھا، بالکل نہ گھبرایا، پرسکون سا مجھے
دیکھنے لگا۔

اس نے مجھ سے پوچھا: ”مجھے کیا چاہیے میں نے کہا
تو مجھے اپنے ساتھ ڈرائے میں رول دلوائے۔ لوئی نے
ہائی بھری، اور ایک رتھ مجھے دیا اسے لے کر کل
اسٹوڈیو آجاؤں۔ میں خوشی خوشی چلی گئی اور اگلے روز
اسٹوڈیو آگئی، مگر رتھ کے باوجود جب دو دن تک کسی
نے مجھے داخل نہ ہونے دیا تو مجھے احساس ہوا کہ لوئی
نے مجھے محض ہلکا دے کر جان چھڑائی تھی۔ اگلی
رات میں پھر اس کے گھر چلی گئی۔ اس دفعہ میں نے
اسے نہ دکھایا، بلکہ اس کی ایک قیمتی ہیرے کی گھڑی جو

میں نے پہلے بھی اس کے گھر دیکھی تھی، اٹھالی اور اس
کی جگہ وہی رتھ رکھ دیا۔

وہ گھڑی لوئی کو اس کی محبوبہ نے دی تھی، وہ اس کا
دووانہ تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح مجھے ڈھونڈتا رہا، اسے وہ
گھڑی واپس چاہیے تھی، اس نے پولیس کو نہ بتایا کہ
وہ جانتا تھا، میں اداکاری کی دہائی اس کی گھڑی تباہ کر
دوں گی۔ ہفتے بھر بعد میں تھپڑ لٹی اور گھڑی لوئی کو لوٹا
دی اس روز مجھے اپنا پہلا کردار مل گیا۔

بادل سیاہ بڑگئے تھے، طے آسمان پہ تارے جگمگانے
لگے تھے، شام ٹپس ڈھلنے کو تھی۔

”میں چند برسوں میں لندن کے تھپڑ کی کامیاب
ادا کاراؤں میں سے ایک ہو گئی۔ میں نے بہت سے
کردار کیے، ایجنٹنری جادوگرنی کا کردار، پاگل عورت کا
کردار۔ میں نے کون سا کردار نہیں کیا۔ ہر کردار میں
خود کو ڈھالا، یہاں تک کہ تین برس پہلے جب میں نے
ایک اطالوی شہزادی کا کردار کیا تو ٹانگے کیٹنے والوں میں
کھڑے ہو کر تالیاں بجانے والا جان کارلس بھی تھا۔
اس نے مجھے پہچان لیا تھا، میں تو خیر اسے برسوں سے
پہچانتی تھی۔ وہ تھپڑ کے بعد مجھ سے ملا مگر میں نے
اس سے رکھائی برتی وہ مایوس سا چلا گیا۔ جانے وہ کس
رشتے کے تحت آیا تھا؟ پھر وہ اکثر چلا آتا، میں اس کے
ساتھ بے رخی برتی، مگر وہ برانہ ماندا۔ اس نے مجھے اپنا
پتہ دے رکھا تھا مگر میں کبھی اس سے ملنے نہیں گئی۔
مجھے جان کارلس سے ذرا بھر بھی دلچسپی نہ تھی۔“

وہ یاد کر کے بول رہی تھی، بہت سی الجھی یادوں کے
سرے ایک دوسرے میں پھنسے تھے، وہ جیسے تھہر تھہر کر
انہیں سمجھا رہی تھی۔

”میں جب کردار کرتے کرتے تھک گئی تو سوچتی
تھی کہ کبھی تو ایک دن ایسا آئے گا جب میں کوئی ایسا
کردار کروں گی جو صدیوں تک امر ہو جائے گا اور وہ
کردار اسٹیج پر نہیں عام انسانوں کے بیچ پر فارم ہو گا۔
اس کے داد دینے والے، اس کو سراہنے والے، اس
کے لیے تالیاں بجانے والے ارد گرد کے لوگ ہوں
گے۔ میں برسوں اس کردار کی تلاش میں رہی اور پھر

ایک شام کارلس نے مجھے وہ کردار دکھائی دیا۔ تب میری سمجھ میں آیا وہ کیوں میرے پاس پلٹ پلٹ کر آتا تھا۔

”اسے تلاش تھی ایک ایسی چیز کی جس کے بارے میں جاننے والی ہندوستانی نسلیں کب کی مرکھپ گئی تھیں، مگر وہ برسوں ہندوستان میں رہا تھا، اسے یہاں کے بہت سے غیر سرکاری رازوں کا پتہ تھا، جانے کہاں سے اس کے ہاتھ ایک خط کا آدھا ٹکڑا لگا تھا جس میں ”ماہ ملکہ“ کا ذکر تھا وہ جو چاند سے زیادہ خوب صورت ہے اس کا ذکر تھا، مگر وہ خط کس نے کس کو لکھا تھا، وہ جانتا نہ تھا اور سرائے رسائی اس کی طبیعت میں نہ تھی۔

اس خط میں مہاراجہ بلدیو سنگھ کا ذکر تھا جس نے ”ماہ ملکہ“ کو گاؤں کے برائے قبرستان میں ایک لکڑی کی چھوٹی سی ٹانڈ میں کوئلوں کے بیچ رکھ کر دفن کر دیا تھا۔ مہاراجہ بلدیو سنگھ کون تھا، نہ وہ جانتا تھا نہ میں اور میں تو تب یہ بھی نہ جانتی تھی کہ یہ ”ماہ ملکہ“ کیا ہے۔ میں نے تو جھٹ کارلس کو انکار کر دیا تھا کہ میں ہندوستان جا کر اس فضول قصے کہانیوں کے پیچھے خوار نہیں ہو سکتی۔ وہ چاہتا تھا میں اس کی مدد کروں، مگر میں نے توجہ نہ دی یہاں تک کہ کئی مہینے گزر گئے اور جب میرے کیریئر پر برا وقت آنے لگا۔ پیسے کی تنگی ہوئی اور کرداروں کی کمی تو میں نے کارلس کی مدد کرنے کی ہائی بھرلی، اسی شرط پر کہ ”ماہ ملکہ“ میں آدھا حصہ میرا ہو گا۔

دو برس میں نے برٹش لائبریری اور بعد میں ہندوستان آکر یہاں کی لائبریریوں اور کالغذات کو کھنگالنے میں گزارے۔ شاید دو برس سے بھی زیادہ گزر گئے۔ میں کھوجتی رہی، سرکھپاتی رہی اور پھر مجھے علم ہوا کہ مہاراجہ بلدیو سنگھ کو مرے عرصہ بیت چکا ہے وہ اٹھارویں صدی کے وسط میں دشمنوں کے ہاتھوں مارا گیا تھا اس کا تعلق نیلی راجپوتانہ نامی گاؤں سے تھا جو اب ایک مختلف سرکاری نام سے موجود ہے۔ میں نے اور کارلس نے مہاراجہ بلدیو سنگھ کے جانیشینوں کو کھوجنے میں عرصہ گزارا، یہاں تک کہ ہمیں شیکھو

مل گیا۔

تھا کہ شیکھو راج بھی نیلی کے دوسرے لوگوں کی طرح ”ماہ ملکہ“ کے وجود سے لاعلم تھا، وہ اسے ایک فرضی داستان گردانتا تھا۔

”وہ فرضی داستان ہی ہے مایا!“ بدر کہہ اٹھا ”ماہ ملکہ ایک myth ہے، ایک فرضی لیجنڈ اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ مہاراجہ بلدیو سنگھ کی پگڑی میں جو ہیرا جڑا تھا، وہ ایک عام سا ہیرا تھا اس میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ بعد میں لوگوں نے اسے ”ماہ ملکہ“ کا نام دے کر اس سے کہانیاں منسوب کر ڈالیں۔“

وہ کرب سے مسکرائی ”کاش کہ ایسا ہوتا۔“ پھر اندر کمرے میں چلی آئی۔ دیوار پر وہ قد آدم تصویر آویزاں تھی۔ وہ بوڑھا مہاراجہ بہت حکمت سے سامنے دیکھ رہا تھا۔ اس کی پگڑی میں پڑا سا ہیرا جڑا تھا، جس سے شعاعیں سی پھوٹ رہی تھیں۔ نیچے کونے میں لکھا تھا۔

”شعبہ حقیقی مہاراجہ بلدیو سنگھ۔“

”کاش ایسا ہوتا جیسے تم کہہ رہے ہو ہندوستانی نیزہ باز اگر ایسا نہیں ہے۔“ ”ماہ ملکہ“ کے بارے میں بہت کم لوگ جانتے ہیں، میں نہیں جانتی کہ یہ مہاراجہ بلدیو سنگھ کے پاس کیسے آیا، مگر شاید تم نے آندھرا پردیش کے غار سے نکلنے والے اس دوسرے ہیرے کے متعلق سنا ہو، جسے دنیا کوہ نور کے نام سے جانتی ہے، جو کبھی مغلوں کے پاس رہا تو کبھی رنجیت سنگھ کے پاس اور جب کمپنی بہادر نے ہندوستان پر قبضہ کیا تو یہ ہیرا ملکہ عالیہ کے تاج کی زینت بنا۔ اسی غار سے نکلنے والا دوسرا ہیرا ”ماہ ملکہ“ مہاراجہ بلدیو سنگھ کی ملکیت میں آیا۔

میں نے تم سے کہا تھا، مجھے شیکھو میں وہ نظر آیا تھا جس کی قیمت تم ایک بلند وبالا چار دیواری کو بیسوں جواہرات سے بھر کر بھی پوری نہیں کر سکتے۔ قدیم کتابوں میں لکھا ہے کہ اگر کوئی تو مندر تو ہی اپنے چاروں اطراف چار پتھر بھینکے اور ریاضی کی کسی تصویر کی طرح ان چار کونوں کو ملا دے، اور اس قطعے کو

کے دوسرے لوگوں کی
علم تھا وہ اسے ایک

بدر کہہ اٹھا "ماہ ملکہ
نند اس کا کوئی وجود
زی میں جو ہیرا بڑا
کوئی خاص بات نہ
کہ "کانام دے کر

اہو تاکہ

اوپر یہ وہ قد آدم
رہت حکمت
ن پراسا ہیرا بڑا
نچے

ہندوستانی نیزہ

ے میں بہت

یہ مہاراجہ

نے آندھرا

رے ہیرے

جاتی ہے

لکھ کے پاس

لیا تو یہ ہیرا

نکلنے والا

لیکت میں

وہ نظر آیا

کو ہیروں

قدیم

اپنے

ی تصویر

قطعہ کو

ہیرے جو اہرات سے بھر دے تب بھی وہ کوہ نور کی
بہت پوری نہیں کر سکتے اور آندھرا پردیش کے غار
سے نکلنے والے پتھروں یہ وہ Curse ہے جس کے
باعث کارلس کو میری مدد دینی پڑی۔

جانتے ہو کوہ نور کو برطانیہ کے شاہی خاندان کی
پورتوں کو ہی کیوں دیا جاتا ہے؟ کیونکہ مقدس کتابوں
میں درج ہے "کوہ نور کو صرف عورت پہن سکتی ہے یا
ہنگوان۔ یہ مرد کے لیے مناسب نہیں ہوتا" یہ اسے
بہ کر دیتا ہے اس کے ٹوٹن ڈائمنڈ "ماہ ملکہ" نے
مہاراجہ بلدیو سنگھ کو اتنا تباہ کیا کہ وہ جب دشمن کی بلیغار
سے گھبرا کر بھاگا تو اس منحوس ہیرے کو قبرستان میں
دفن کر کے بھاگا۔

"ہیرے محض پتھر ہوتے ہیں لیڈی شیکھر!" وہ
اجنبیت سے بولا "مہاراجہ یہ برا وقت اس کی حرکتوں
اور غداروں کے باعث آیا تھا" میں مسلمان ہوں اور
ہم پتھروں کی کرامات کو ماننے میں نہ پتھر کے بتوں کی مگر
"ماہ ملکہ" کی داستان وہ فرضی کہانی ہے جو بیلے کے ہر
بے کو بچپن میں ہی سنا دی جاتی ہے تاکہ وہ اپنے گاؤں
پر فخر کر سکے اور بڑے ہو کر اس کو علم ہو تا ہے کہ وہ ہیرا
بعض ایک عام سا ہیرا تھا جو جانے کہاں کھو گیا کسی کو
علم نہیں۔ "ایسا نہیں ہے بدر!" مضحکہ خیز میں
ہلکا۔

"یہ مہاراجہ کا خوف تھا جس نے اسے ایسی کہانیاں
عام کرنے پر مجبور کیا تھا" مگر جب بیلے کی ریاست اس
کے قبضے سے نکل گئی اور وہ وہاں سے ہزاروں میل دور
کمپری کے عالم میں ایک کشیا میں مرا تو اس کی بیوی
نے اپنی موت سے قبل اپنے بیٹے کو خط لکھا جو بیلے میں
غلام بنالیا گیا تھا کہ وہ "ماہ ملکہ" کو قبرستان سے نکال
لے۔ اس کے بیٹوں نے بعد میں بغاوت کی اور
ریاست واپس تھیلی، مگر وہ خط ان تک نہ پہنچ سکا۔
کئی سال بعد وہ خط جان کارلس کے ہاتھ لگا اور وہاں
سے کارلس نے ایک منصوبہ بنایا۔ "ماہ ملکہ" کے
حصول کا ایسا بے جھول منصوبہ جس کے ذریعے ہم
لاٹوں دنیا کے سب سے امیر کبیر لوگ بن سکتے تھے۔"

آنسو اسی طرح بے آواز اس کے گالوں پہ لڑھک
رہے تھے۔

"شیکھر اور میں نے انگلستان میں شادی نہیں کی
تھی، ہم انگلستان میں کبھی نہیں ملے تھے۔ ہماری
ملاقات دہلی میں ہوئی تھی۔ میں بطور ایک فرنگی
شہزادی اس دعوت میں گئی تھی، چو پکنی کے ایک افسر
نے اپنے بیٹے پہ منعقد کر رکھی تھی اور بھلا مجھے بطور
شہزادی متعارف کروانے والا وہ فرنگی افسر اور کون ہو
سکتا تھا سوائے کارلس کے اسے جب سے علم ہوا تھا
کہ شیکھر کا تعلق مہاراجہ بلدیو سنگھ کے خاندان
سے ہے اس نے اس سے شناسائی پیدا کر لی تھی۔
شیکھر سے میرا تعارف بھی اسی نے کر لیا تھا۔

شیکھر برا آدمی نہیں تھا وہ بس قدرے عیاش تھا۔
مگر میں نے اسے کبھی جج نہیں کیا۔ مجھے یاد ہے اس
روز وہ مجھ سے بہت دیر تک باتیں کرتا رہا تھا۔ میں
میرین کارلس عرف مایا دتی سے اس کے لیے محض
میرین فرینڈس عرف مایا فرینڈس بنا دی گئی تھی۔
فرینڈس اس برطانوی شہزادی کا آخری نام تھا جو کچھ
عرصہ قبل روپوش ہو گئی تھی غالباً کسی کے ساتھ
بھاگ گئی تھی۔ میں وہی شہزادی بن کر شیکھر سے ملی۔

میری اداکاری اور اس خول کے باعث جو میں نے
خود پہ چڑھا رکھا تھا وہ بہت جلد چاروں شانے چت ہو
گیا۔ ہم دونوں نے کلکتہ جا کر شادی کی اس نے دنیا
والوں کے سامنے یہ ظاہر کیا کہ ہماری شادی انگلستان
میں ہوئی تھی۔ کارلس بطور ہمارے فیملی فرینڈ شیکھر
کے آس پاس ہی رہتا۔ ہمارا منصوبہ شیکھر کے
ذریعے مگر اسے آگاہ کیے بغیر "ماہ ملکہ" حاصل کر کے
واپس انگلستان بھاگ جانا تھا۔ سو جب وہ مجھے بیلے لایا تو
میں ہر رات اسے نیند کا شرموت دے کر وہ سیاہ چغہ پہن
کر قبرستان چلی جاتی تھی اور ایک ایک جگہ کو کھودتی۔
وہ سیاہ چغہ میں خود کو اندھیرے میں گم کرنے کو پہنچتی
تھی مگر آہستہ آہستہ مجھے احساس ہوا کہ بیلے کے تو ہم
پرست لوگ مجھے بھوت بھجنے لگے ہیں۔ سو جب بھی

کوئی قبرستان کے قریب سے گزرتا تو میں عجیب و غریب آوازیں نکالتی تھی جتنا لوگوں نے قبرستان کے نزدیک آنا بھی چھوڑ دیا اور اس کی کھدائی کے لیے مجھے یہی چیز درکار تھی۔ لوگ ڈرنے لگے، طرح طرح کی باتیں بنانے لگے، یہاں تک کہ شیکھر کے کانوں میں بھی یہ بات پڑ گئی۔

یہ اس کی موت سے چند دن پہلے کی بات ہے، وہ اس روز گھر آیا تو بہت چپ چاپ تھا میں نے پوچھا مگر اس نے جواب نہ دیا۔ میں اس وقت تو نہ جان سکی مگر مجھے بعد میں علم ہوا کہ اسے کسی نے بتا دیا تھا کہ یہ جو شہزادی اس کی بیوی ہے، وہ جان کارلس کی بیٹی اور لندن کے ٹھیٹھوں میں کام کرنے والی ایک اداکارہ ہے۔ اس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا اس نے کارلس کو خط لکھا کہ وہ اس سے ملے۔ جس دن ملاقات طے ہوئی، اس نے مجھے ایک سرکاری کام سے امر ترسیج دیا۔ میں چلی گئی اور پیچھے وہ اور کارلس شام میں ملے۔ یہ اس کی موت سے ایک دن پہلے کی بات ہے۔ روپائے اسے اس روز کچے راستے یہ دیکھا تھا۔ وہ کچے راستے سے ہو کر جنگل تک گیا تھا اس نے کارلس کو کہا کہ وہ مجھے طلاق دے رہا ہے اور یہ کہ میں اسے سب کچھ بتا چکی ہوں۔

”ماہ ملکہ کے بارے میں بھی؟“ کارلس پوچھ بیٹھا اور شیکھر جیسے ذہین آدمی نے ساری کڑیاں ملا لیں۔ یقیناً ”ماہ ملکہ“ پرانے قبرستان میں دفن تھا تب ہی تو وہ چغہ پوش ادھر پھرتا تھا اس نے گھر جا کر میرا سامان تلاش تو چغہ اسے مل گیا۔ اگلی صبح وہ کارلس سے قبرستان میں ملا اور اسے اس کا سارا منصوبہ کھول کر بتا دیا۔ کارلس چکر اکر رہ گیا۔

وہ جیسے تھک کر خاموش ہو گئی اور کرسی کی پشت سے سر نکا کر آنکھیں موند لیں۔

”شیکھر کو لالچ نے گھیر لیا۔ اس نے کارلس سے ”ماہ ملکہ“ میں اپنا حصہ مانگا، دونوں کا بھگڑا ہوا اور شیکھر جب ملتا جھلتا واپس گھر آیا تو کارلس نے بہت مہارت سے اسے قتل کر دیا۔

دو چیزیں ہمارے منصوبے کا حصہ نہیں تھیں، ایک شیکھر کا قتل اور ایک بدرغازان۔

وہ آنکھیں بند کیے آہستہ آہستہ بولتی جا رہی تھی۔ رات ڈھل چکی تھی، آسمان تاروں سے جھنک لگا تھا۔

”دو روز قبل ہی کارلس نے اپنا تبادلہ منصوبے کے مطابق اس علاقے میں کرایا تھا شیکھر کا قتل ہوا اور

مجھے علم تک نہ ہو سکا۔ میں جب تک واپس آئی، اس کی چتا جلائی جا چکی تھی۔ مجھے راجپوتوں پہ شک تھا مگر ان کے خلاف گاؤں میں خبریں میں نے اس شک کے باعث نہیں پھیلانی تھیں۔ وہ تو ہمارے منصوبے کا حصہ تھا۔ مجھے اپنے حوالے سے ٹھاکروں کو انتہا بدنام کرنا تھا کہ وہ مجھے روک ہی نہ سکیں، آخر ایک روز تو مجھے ”ماہ ملکہ“ لے کر واپس انگلستان بھاگ جانا تھا! سو ایک طرف تو میں نے ٹھاکروں کو بدنام کیا اور دوسری طرف خود سے ہر ممکن شک ہٹانے کے لیے خود ہی اس بھوت کا سراغ لگانے کی ٹھانی۔ نوکروں کے سامنے، تمہارے سامنے، ہر کسی کے سامنے خود کو اس بھوت کی سب سے بڑی دشمن ثابت کیا، مگر پھر منگل سنگھ کا قتل ہو گیا۔

وہ مجھے دیکھ چکا تھا اور میں مطمئن تھی کہ وہ جلد ہی مرجائے گا، مگر اگلی صبح روپائے یہ بتا کر میرے ہوش اڑا دیے کہ وہ بھوت کا ذکر کم سے کر چکا ہے۔ میرے دل

میں چور تھا، سو میں نے روپاہے ظاہر کیا کہ مجھے تم پر شک ہے اور وہ یقین کر بیٹھی۔ مجھے معلوم تھا اگر کوئی اور بھوت کا سراغ لگانے نکلے گا تو یہ خبر اس کے کانوں تک ضرور پہنچے گی کہ بدرغازان ہی وہ بھوت ہے، روپاہے

پیٹ میں بات کہاں رہنی تھی۔ لیکن یہ بے چینی کہ منگل سنگھ نے تمہیں کیا بتایا ہے، مجھے تمہارے پاس

کھینچ لائی۔ تمہارا رویہ مبہم تھا میں اندازہ نہ کر سکی کہ تم کیا جانتے ہو، مگر اس روز میں نے تمہارا اعتماد لینے

کے لیے تمہیں گویاں والا قصہ بتایا۔ اس کے اپنے کمرے میں آنے سے مجھے یہی ڈر تھا کہ وہ میرا چغہ نہ

دیکھ لے، جو اس وقت پٹنگ کی پابندی کے ساتھ پڑا تھا، تب مجھے شیکھر بہت یاد آیا تھا۔ وہ میرے لیے ایک

نہیں تھیں۔

جاری تھی۔

کئے لگا تھا۔

نصوبے کے

قل ہو اور

آئی اس

ل تھا، مگر

شک کے

صوبے کا

انتہا نام

روز تو

تا تھا تا

دوسری

خود ہی

ما کے

لو اس

مشکل

دی

ازا

دل

ل

ور

ل

ل

ل

ل

ایک اٹھال سا دس دس دس میں اپنا کام یا آسانی کر

کتی تھی۔

میں نے تم سے کالی چادر والے شخص کے متعلق

جھوٹ بولا تاکہ تم مجھے کچھ تو بتاؤ اور جب تم نے

شیکھر کا نام لیا تو ایک لمحے کو تو میں چکر اکر رہ گئی۔ مجھے

لگا وہ واقعی زندہ ہے۔ میں کچھ دن تو متذبذب رہی کہ

معاہدہ کیا ہے اور خوش گمان بھی کہ چلو وہ زندہ ہے۔

ٹھاکروں کو بھی خوب خوب بتایا مگر جب عقل سے کام

لیا اور سوچا کہ آخر منگل سنگھ نے اس کا نام کیوں لیا ہو

گا تو خیال آیا کہ وہ یقیناً "شیکھر" کی میم صاحب کنا

چاہ رہا ہو گا۔ تب میں پھر سے تذبذب میں پڑ گئی۔ مجھے

ڈر تھا کہ اگر تم ذرا سا بھی دماغ استعمال کرو گے تو جان

جاؤ گے، سو مجھے تمہاری توجہ کسی اور طرف مبذول

کرانی تھی۔

ان دنوں سے اسی روز مجھے تمہارے اور شیکھر کے

ایک تنازعے کا علم ہوا۔ پہلے تو میں حیران ہوئی کہ مجھے

یہ پہلے بتا کیوں نہیں چلا اور مجھے کھیلنے کو ایک اور بتا مل

گیا۔ میں اس چیز کو بنیاد بنا کر تم پر مقدمہ کرنے ہی والی

تھی کہ میں نے جوگی شیکھر کا نام سنا۔ میرا کام اور

آسمان ہو گیا۔ نہ صرف میں نہیں یہ سوچنے پر مجبور کر

کتی تھی کہ وہ شیکھر وہی جوگی ہے، بلکہ نہیں کچھ

عرصے کے لیے کہیں اور مصروف بھی کر سکتی تھی۔

نادر شاہ کو تھانے میں دیکھ اور پہچان کر مجھے اندازہ ہوا کہ

بیلی کے ڈاکوؤں کو کوئی کیوں نہیں پکڑتا تب مجھے پہلی

دفعہ شیکھر کی موت کا معمہ حل ہوتا نظر آیا، مجھے

شک گزرا کہ تم ہی لوگوں نے اسے مارا ہے۔ سو میں

نے پرچہ کٹوا دیا۔ مگر جب میں نے کھوجی کو تمہارا کھرا

دکھایا اور اس نے تصدیق کی کہ یہ وہ کھرا نہیں تھا، جو

شیکھر کے ساتھ قبرستان سے ملا تھا تو مجھے تم

بے تصور لگے۔

رائی گال جاتی دکھائی دی۔

دوسری جانب تم ہاتھ دھو کر کر بھوت کے پیچھے

پڑے تھے۔ میں نے ایک اور پتا کھلیا۔ تمہارے نام

قبرستان میں رات ٹھہرنے کا رقعہ لکھ کر دیا کوہ دیا،

مجھے علم تھا وہ گویال کو دکھائے گی اور گویال اپنی فطرت

کے باعث میرا پیچھا کرتا قبرستان تک آئے گا اور

تمہیں یقین ہو جائے گا کہ بھوت گویال ہی ہے اور ایسا

ہوا بھی مگر گویال کی بزدلی نے سارا معاملہ خراب کر ڈالا۔

دوسری جانب کارلس میرے اور تمہارے تعلق

سے بے زار تھا۔ سو سمجھتا تھا میں کام یہ توجہ نہیں دے

رہی اور تمہارے ساتھ عشق بکھار رہی ہوں۔ ہم اکثر

جنگل میں ملتے تھے، وہ مجھے بار بار دھمکی دیتا کہ اگر بنی

راجپوتوں کی ملکہ (یعنی ماہ ملکہ) اسے نہ ملی تو وہ مجھے بھی

پرانے قبرستان میں دفن کر دے گا اور یقین کر بدرا وہ

ایسا ہی کرے گا۔

میں اپنے تئیں پوری کوشش کر رہی تھی مگر اس

روز تو جیسے میرا تاش کے پتوں کا گھر زمین پر آن گرا

جب کھوجی نے مجھے وہ کھرا دکھا دیا، جو شیکھر کے

ساتھ ملا تھا اور جب میں نے اس کھرے کے آگے چلے

کارلس کو دکھا تو زمین آسمان میری نگاہوں کے سامنے

گھومنے لگ۔ کیا میرے ساتھ بھی کوئی گم ہو رہا تھا؟

میں یہی سوچتی رہی اور اس رات جب وہ غصیت بڑھا

قبرستان آیا تو مجھے یقین آ گیا کہ وہ میرے ساتھ وہیل

کر اس کر رہا ہے۔ قبرستان کا معاملہ مجھے سنبھالنا تھا، مگر

وہ خود بھی چپکے چپکے "ماہ ملکہ" ڈھونڈنے آ جاتا تھا۔

میں جانتی تھی اگر اسے بیلی کی ملکہ ملی تو وہ اسے لے

کر خود ہی واپس بھاگ جائے گا مجھے چھوڑ کر اور اگر ہیرا

مجھے پہلے ملا تو وہ شاید مجھے مار کر اسے لے کر چلا جائے۔

اس شخص کا لالچ کبھی ختم نہیں ہو سکتا میں جانتی ہوں۔

صرف اس کا کیوں ملایا؟ وہ سرد مری سے اسے

دیکھ رہا تھا۔ "تمہارا لالچ بھی تو اس میں شامل تھا۔

شیکھر کا قتل تم لوگوں نے اسی لیے تو کیا تھا۔"

”بدر!“ اسے جیسے دھکا لگا تھا۔ ”ایسے مت کہو۔ کرپولی۔

میں کبھی نہیں چاہتی تھی کہ شکھو قتل ہو، وہ تو بہت۔۔۔“ میں اگر راہنی کی واردات کرتا ہوں تو وہ صرف۔۔۔

”اگر ایسا ہے تو تم کارلس کے خلاف رپٹ کیوں نہیں کراتیں؟“ وہ تیزی سے بولا۔

”میں نے اسے یہ دھمکی دی تھی، جب اس نے جنگل میں مجھے یہ سب بتایا تھا، مگر تم جانتے ہو میں نے تمہارے لیے۔۔۔“ مگر اس کی ہر دلیل ضائع جا رہی تھی وہ کچھ بھی نہیں سنا چاہتا تھا۔

”تم نے میرے لیے کچھ نہیں کیا مایا!“ وہ ایک دم زور سے چلایا۔ ”تم نے سب کچھ اپنے لیے کیا۔ میری ماں ٹھیک کہتی تھی۔ تم فرنگی ہوتے ہی چور، غاصب اور لیبرے ہو۔“

”نہیں بدر!“ وہ اٹھ کر اس کے سامنے آئی اور بے قراری سے اس کے بازو کو پکڑ کر اس کا رخ اپنے سامنے کیا۔ ”ایسے تو مجھے جج مت کرو۔ تم مجھے یوں کس طرح جج کر سکتے ہو؟ میں نے تمہیں سب کچھ بتا دیا ہے، میں نے تو کچھ نہیں چھپایا۔“

”تم نے یہ سب تب بتایا ہے۔ جب میں خود ہی جان گیا تھا کہ تم وہ بھوت ہو۔“ وہ زہر خند ہوا۔

”مگر اس سے زیادہ تو تم کچھ بھی نہ جانتے تھے، میں نے تمہیں ”ماہ ملکہ“ کے بارے میں خود بتایا ہے، نہ بھی بتاتی تو تم کیا کر لیتے۔ مجھے تو ”ماہ ملکہ“ مل گیا ہے۔ کل رات تمہارے کتے نے ہی مجھے وہ ڈھونڈ کر دیا ہے۔ وہ قبرستان کے باہر دفن تھا بلکہ دفن تو قبرستان کے احاطے میں ہی تھا، مگر یہ چار دیواری تو چند برس پہلے اوہرنی ہے، ایسے کہ وہ دفن ناند پھانک کے قریب ہی باہر کی طرف تھا۔ شیر اس جگہ کو کھودنا چاہ رہا تھا، میں اسے مارنا نہیں چاہتی تھی مگر جب اس نے مجھ پر حملہ کیا تو مجھے اسے مارنا ہی پڑا، پھر وہ جگہ کھودی اور ناند نکال کر۔“

”مجھے تمہاری کہانیاں نہیں سننی۔“ وہ تلخ ہوا۔

”میں صرف یہ جانتا ہوں کہ تم ایک چور ہو، فرنگی چور۔“ ”تو کیا تم نہیں ہو؟ ہاں؟ تم ڈاکو نہیں ہو؟“ وہ تلملا

”کس مقدس کتاب میں لکھا ہے بدر غازان کہ بغاوت میں ڈاکے ڈالنا جائز ہوتا ہے؟ ہاں؟ کدھر لکھا ہے؟ چوری تو بس چوری ہوتی ہے۔ میں چور ہوں تو تم کیا ہو؟ مگر میں نے تو تمہیں بھی اس طرح جج نہیں کیا۔“

”تمہاری ہر دلیل بے کار ہے مایا، میں بس چاہتا ہوں کہ تم اپنا یہ ناپاک وجود لے کر یہاں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلی جاؤ۔“ وہ کہہ کر جانے لگا۔ وہ تیزی سے اس کے سامنے حائل ہوئی۔

”نہیں بدر! لیا نے اسے کہنی سے پکڑ کر روکا۔“ تم یوں مجھے چھو ڈر نہیں جاسکتے میں تم سے محبت کرتی ہوں، بہت زیادہ اور تم بھی مجھ سے محبت کرتے ہو نا میں ”ماہ ملکہ“ کارلس کو دے دوں گی، میں اسے نہیں رکھوں گی، کیا تب ہم دونوں ایک ہو سکتے ہیں۔“ ”تم میرا اعتبار کھو چکی ہو، مجھے اب تم سے کوئی سروکار نہیں ہے، میرا راستہ چھوڑ دو۔“

”تم ایسے نہیں جاسکتے۔ تم۔۔۔ تم تو مجھ سے محبت کرتے تھے، تم تو مجھ سے شادی کرنا چاہتے تھے۔“ بدر نے دیکھا وہ رو رہی تھی، آنسوؤں سے، ہچکیوں سے، مگر اس کا دل نہیں پھٹا۔ وہ اسے ہٹا کر جانے لگا۔

”نہیں بدر!“ اس نے بے اختیار دونوں ہاتھوں سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”دیکھو میری بات سنو، میں مانتی ہوں میں نے لالچ میں یہ سب کیا مگر میں یہ بھی اعتراف کرتی ہوں کہ یہ غلط تھا۔ میں اپنے عمل کو اگر Justify نہیں کر رہی تو یہ بھی نہیں چاہتی کہ تم مجھے جج کرو۔ میں۔۔۔ میں اب۔۔۔ اب میرے لیے وہ ہیرا کوئی حیثیت۔۔۔ نہیں بدر! پلیز دیکھو۔۔۔ اس طرح مجھے مت چھوڑو۔“

اور اس طرح بھیگا چہرہ لیے اس کی منت کرتی وہ فرنگی لڑکی اسے کیس سے بھی تو سیلی کی وہ ملکہ نہیں لگ رہی تھی، جسے وہ جانتا تھا، لیکن وہ سیلی کی ملکہ بھی ہی

تا ہوں تو وہ صرف..

ہے بدر عازان کہ
ہاں؟ کدھر لکھا
ہیں چور ہوں تو تم
طرح جج نہیں کہا

میں بس چاہتا
سے ہمیشہ
وہ تیزی سے

کر روک۔ تم
عہدیت کرتی
نیت کرتے
میں اسے
تے ہیں۔
اسے کوئی

بت کرتے
بدر نے
سے مگر

ہا تھوں
میں مانتی
تے بھی
ی کو اگر
تم مجھے

وہ میرا
طرح

تی وہ
لگ
سی

کب؟ وہ اسے جب بھی بلی کی ملکہ کہتا تھا تو اس کے
ذہن میں ہمیشہ "ماہ ملکہ" کی اس کہانی کا تصور آتا تھا جو
ہاؤس کے بڑے بوڑھے سنایا کرتے تھے۔ بلی کی اصل
ملکہ تو وہ پتھر تھا۔

"تم نے میرے ساتھ فریب کیا ہے مایا! تم نے مجھے
دھوکے میں رکھا ہے۔"
"کیا دھوکا کیا ہے میں نے؟ ماہ ملکہ تمہاری ملکیت تو
نہیں تھا، تمہارے بزرگوں کی میراث تو نہ تھا، وہ
شیکھر کی میراث تھا اور شیکھر اپنی جائیداد میرے
ہام کر کے مرا ہے۔ گویا بھی مرچکا ہے بدر! میں اس
دھوکے کی قانونی وارث ہوں۔ تمہارے ساتھ تو کوئی
دھوکا نہیں ہوا۔"

وہ جواب دیے بنا آگے بڑھ گیا، مایا نے تڑپ کر
اسے روکنا چاہا مگر وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر اسے پرے
دھکیلتا کرے سے باہر چلا گیا۔

"بدر! بدر!" وہ اسے پکارتی دیوار سے لگی نیچے
بیٹھتی چلی گئی مگر وہ نہیں سن رہا تھا۔ وہ سننے کی حد سے
باہر جا چکا تھا۔ اسے لگا اب وہ کچھ بھی نہیں سنا چاہے
گ۔

وہ اسی طرح زمین پہ بیٹھی روتی رہی۔

"خیر تو ہے پتھر!" چاچی اس کے پاس آئی، جو
برآمدے میں چارپائی پہ نیم دراز تھا، سر گاؤں تک پہنچے رکھے
وہ بے تاثر لگا ہوں سے چھت کو گھور رہا تھا۔

"بدر! میں کیا خیر تو ہے، بکاؤں کہہ رہا تھا صبح
سے تین دفعہ میم صاب تیرا پوچھنے آئی ہے، پر تو نے
کہلوا دیا ہے کہ تو گھر پہ نہیں ہے۔" وہ پریشان سی
چارپائی کی پائنتی پہ بیٹھ گئی۔

"میں کسی میم صاب کو نہیں جانتا۔" وہ اسی طرح
بھت کو گھور رہا تھا۔

"پر ہوا کیا ہے؟"

"کیا ہونا ہے؟"

"تو اس کو کیوں نہیں مل رہا؟"

وہ جھلا کر اٹھ بیٹھا۔ "جب ملتا تھا تب بھی تجھے یہی
اعتراض تھا، اب چھوڑ دیا ہے، تب بھی تو پریشان ہے
میں کدھر جاؤں اماں؟"

"ہائے نہیں میرا پتھر!" چاچی بوکھا گئی۔ "میں
صدے واری تو نے اسے چھوڑ دیا، چکا کیا پتھر، تجھے
اسے چھوڑ دینا چاہیے تھا۔ اب تو جب کے گا میں
تیری شادی کر دوں گی۔ دیر سویر کی کوئی چتا نہیں پتھر!
جب تیری مرضی ہوگی۔"

"پھر اسی جمعہ کر دے اماں" وہ اٹھ کر تیزی سے
باہر نکل گیا۔

چاچی ہکا بکا بیٹھی رہ گئی، پہلے تو اسے یقین ہی نہ آیا
کہ وہ لیا کہہ کر گیا ہے، پھر ذرا حواس واپس آئے تو وہ
خوشی اور فکر مندی کی ملی جلی کیفیت میں نوکروں کو
آواز میں دینے لگی۔

"رکھی جتنے! ارے، سنتے ہو کوئی؟"

"کیا ہوا چاچی؟" زہرہ بھاگتی ہوئی برآمدے میں آئی
'اس نے آستینیں اوپر چڑھا رکھی تھیں اور ہاتھوں پہ
گیلا آٹا لگا تھا۔

"جی! جا کر صندل سے ہاتھ منہ دھو، اور آرام کر۔ یہ
کام جتنے کو دے دے۔ اب تیرے یہ کام کرنے کے دن
نہیں ہیں۔" خوشی اور خوش چاچی کے چہرے سے
پھوٹ رہا تھا۔

"پر ہوا کیا ہے چاچی؟" وہ قدرے پریشان سی ہو گئی۔

"بدر شادی کے لیے مان گیا ہے اس جمعہ کو کہتا ہے
کہ بیاہ کر دو، چلو اچھا ہے مگر پنڈی سے رشتے داروں کو
نہ بلایا میں گے، مگر خیر ہے وید بعد میں دے دیں گے،
اب مانا ہے تو ہم بھی اس کی مانیں۔"

"اور... اور میم صاب؟" اس نے خود سے
منصوبے بنائی چاچی کو قدرے ہراساں آواز میں چونکایا۔

"ارے وہ چھوڑ آیا ہے اسے کہتا ہے میں اسے
نہیں جانتا۔ اچھا ہی ہوا تو جا کر آرام کر جتنے آری او
جتنے!"

وہ جتنے کو بھاتی رسوئی کی طرف بڑھ گئی۔ اور زہرا سی طرح آنے میں تھکے ہاتھ لیے متذبذب سی برآمدے میں تھکا کھڑی رہ گئی۔



وہ مضطرب سی والائن میں ادھر ادھر ٹھہر رہی تھی۔ بار بار بند پھانک کو دیکھتی، پھر کھاتی پہ بندھی گھڑی کو سنہری بال ڈھیلے سے جوڑے میں باندھ رکھے تھے اور سفید ساڑھی کا پلو گھاس کو چھو رہا تھا۔ اسی بل پھانک کھلا، چرچاہٹ کی آواز پہ وہ فوراً رک کر ادھر دیکھنے لگی۔

روپوتی ساڑھی کے پلو سے سڑھکے تیزی سے اس کی طرف آ رہی تھی۔ مایا کی نگاہیں بے اختیار اس کے ہاتھوں پر ٹک گئیں، جن میں وہی رقعہ دیا تھا، جو اس نے اسے دے کر بھیجا تھا۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔

”وہ حویلی میں نہیں ہیں میم صاب! ملازم یہی بتاتے ہیں، پیغام بھی نہیں لیتے۔“ روپا نے قدرے شرمندگی اور تاسف سے بند رقعہ اس کی جانب بڑھایا۔ اس نے آہستہ سے اسے اٹھا۔

”ملازم کہہ رہا تھا کہ ملک صاب یہ پیغام دے کر گئے ہیں کہ۔۔۔۔۔“

وہ ہچکچا کر رکی تو مایا چوکی۔

”کیسا پیغام؟“

”یہی کہ۔۔۔۔۔“ وہ پھر متذبذب سی رکی۔

”کیا؟“

”یہ کہ مایا دیوی سے کہو، اس کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ پہلی راجپوتوں سے چلی جائے اس سے پہلے کہ اسے انگریز سرکار کو خط لکھنا پڑے، آخر انگریز سرکار ملکہ عالیہ کے تاج کو مزید سجانے کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہے۔“

”اچھا۔“ ایک مغموم مسکراہٹ اس کے لبوں کو چھو گئی۔ وہ جانتی تھی کہ بدر کی بات ایک طرح کی دھمکی تھی کہ اگر وہ نہ گئی تو وہ ہیرے کے متعلق سرکار

کو بتادے گا اور سرکار اسے گرفتار کر کے ہیرا ملکہ کے تاج میں سجادے گی۔

”یہ چھوٹا ملک ایسا کیوں کر رہا ہے؟“ روپا خود کو روک نہ سکی۔

مایا نے شانے اچکا دیے۔

”اسے انسانوں کی اچھائیوں پر انہوں کو قتل کر بھاری پلوں کے مطابق فیصلہ کرنے کی عادت ہے روپا! اور یوں انسانوں کو بچ کرتے وقت وہ یہ بھول جاتا ہے کہ ابھی وہ دن بہت دور ہے، جب انسان بچ کیے جا میں گئے۔ خیر جانے دو۔“ وہ سر جھٹک کر افسردہ سی اندر کی جانب بڑھ گئی۔

”چھوٹے ملک کی شادی ہو رہی ہے۔“

”کیا؟“ وہ بے یقین سے پوچھی۔

”جی میم صاب!“ روپا قریب آئی۔ ”زہرا مایوں بیٹھ گئی ہے، جمعہ کو نکاح ہے اور پچھلی رات ہندی۔ پوری حویلی سجائی جا رہی ہے، تمہارے فرشی فانوس، چھت کی قندیلیں، بتیاں، دیے اور ایسی ایسی رنگ برنگی کلیاں شہر سے منگوائی ہیں چھوٹے ملک نے۔ خوب چراغیں ہو گئے۔ صرف حویلی نہیں، پورا علاقہ سجا رہے ہیں۔“

روپا کہہ رہی تھی اور اس کا رنگ سفید بڑا جا رہا تھا۔ وہ اسے ایسی سزا دے گا کہ کب اندازہ تھا۔

ڈلوڑی کی وہ ڈھلتی شام اس کی انگلیوں سے جانے کب ریت کی طرح پھسل گئی تھی اسے خبری نہ ہوئی تھی۔



وہ اپنی سنگھار میز کے سامنے بیٹھی آئینے میں خود کو دیکھ رہی تھی۔

پتلا انگر کھا، نیچے پانچامہ اور سر پہ یہ بڑا سا گوند کناری سے بھرا پیلا دوپٹہ، سیاہ لمبے پالوں کا پرانہ دائیں شانے پہ پڑا تھا، اس میں موتیاں کے پھول انکٹائے گئے تھے۔ کلا یوں میں بھر بھر کر کچ کی زرد چوڑیاں تھیں اور ماتھے پہ موتیوں کے پھول کا ننھا سا تھکا۔

نار کر کے ہیرا ملکہ کے رہا ہے؟ روپا خود کو

رائیوں کو قتل کرنے کی عادت سے وہ یہ بھول جاتا۔ انسان بچ گئے۔ کرا افسردہ سی

”زہرہ مایوں ت مند۔ شی فانیوس“ ایسی رنگ سنے۔ علاوہ سجا

آج رہا تھا۔

جلنے نہ ہوئی

فود کو

وہ

نہ

نے

ا

ایک آسودہ مکان اس کے لبوں کو چھو گئی۔ کیا کوئی اتنا بھی خوب صورت لگ سکتا تھا؟ جتنی آج وہ لگ رہی تھی تین دن سے وہ مایوں بیٹھی تھی۔ کسی کی نظر تک اس پہ نہ پڑی تھی۔ بدر نے بھی نہ دیکھا تھا کہ اس کا دل چاہا تھا کہ وہ ایک نظر تو اسے دیکھے، بس وہ ایک نظر ڈالے اور پھر وہ اس کا مہسوت ہونا دیکھ سکے۔ اسے کاش کہ ایسا ہو سکتا۔

وہ یہ سوچ کر غمگین ہو گئی مگر یہ کوئی بڑا مسئلہ توڑی تھا؟ بس دو دن بعد وہ اس کا ہو جانا تھا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پھر کوئی میم صاب ان دونوں کے درمیان نہ آتی تھی۔ ویسے یہ میم صاب گئی کہاں؟ وہ ابھی تک اس بات پہ حیران تھی کہاں وہ اس کے لیے دیوانہ ہوا جا رہا تھا؟ اور کہاں وہ اب اس سے ملتا تھا؟ اس نے سنا تھا وہ روز کتنے ہی چکر حویلی کے لگاتی مگر بدر اس سے نہ ملتا۔ پھر جب سے ان دونوں کی شادی کا شور اٹھا، دھولک بجنے لگی، اس دن کے بعد میم صاب حویلی نہیں آئی۔ اچھائی ہوا جو بھی ہوا۔

وہ خوش تھی، مطمئن تھی، بے فکر تھی۔ اس کی کل کائنات بدر ہی تو تھا وہ اسے مل رہا تھا اسے اور کیا چاہیے تھا بھلا۔

وہ گمن سی چاندی کی منقش رات میں پاؤں ڈالے بیٹھی تھی، جو عرق گلاب سے بھری تھی اور سطح پہ گلاب کی پیتیاں بکھری تھیں، اتنی کہ ننھے سے نیچے اس کے پاؤں پتلیوں سے ڈھک گئے تھے۔ وہ ہولے ہولے گلاب کے پانی میں انگلی سے لیکر کھینچتی تو زرد چوڑیاں کھنک اٹھتیں۔ ان کی کھنک کے دوران ہی اسے دروازے پہ ہونے والی بو تک سنائی دی تھی۔

وہ چونک کر سیدھی ہوئی۔ رات کے اس پہر اس کے دروازے پر کون آ سکتا تھا؟ چاچی؟ مگر وہ تو عشاء کے فوراً بعد سو جایا کرتی تھی۔ تو کیا بدر؟

اس کا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ دعائیں ایسے بھی قبول ہو جاتی ہیں اسے اندازہ نہ تھا۔

وہ آچل سر پہ درست کرتی، کیلے پاؤں پر ات سے نکال کر بھاگتی ہوئی گئی اور دروازہ کھولا۔

وہاں کوئی نہ تھا۔

زہرہ نے سر نکال کر حیرت سے ادھر ادھر دیکھا۔ رائداری سنسان پڑی تھی، سامنے برآمدہ تھا، اس کے آگے والان، وہ بھی خالی پڑا تھا۔ پھر دروازہ کس نے کھٹکھٹایا؟

وہ چوکھٹ پہ کھڑی پریشانی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھ رہی تھی جب اسے برآمدے میں ستون کے ساتھ ٹیک لگائے کوئی کھڑا نظر آیا۔ سیاہ بڑا سالباہہ جس میں چہرہ تنک واضح نہ تھا۔ وہ ڈر کر پیچھے ہٹی، اسی پل اس نے دیکھا، وہ جو کوئی بھی تھا، اسے اشارے سے اپنی جانب بلا رہا تھا۔

وہ گھبرا کر واپس اندر ہونے لگی۔ چاچی نے اسی لیے تو حایراں سے کہا تھا کہ اس کے ساتھ رہے، ورنہ مایوں بیٹھی دلہن کو جن بھوت ستانے لگتے ہیں، مگر حایراں کی ماں بیمار تھی سو وہ شام کو ہی چلی گئی تھی۔

”شش۔۔۔ ادھر آؤ۔۔۔“ سیاہ لبائے میں سے آواز آئی، ساتھ ہی اس نے چہرے پر سے سیاہ ٹوپی اوپر اٹھا کر سر کے پیچھے پھینک دی اور وہ جو خوف زدہ سی ہو کر دروازہ بند کرنے لگی تھی، ساکت رہ گئی۔

”میم صاب۔۔۔! آپ؟“

وہ آہستہ آہستہ چلتی اس کے قریب آئی، زہرہ حیران سی اسے دیکھنے لگی۔ اس نے لباسا سیاہ جیفہ پہن رکھا تھا اور سنہری بال کچھ جفے کے اندر اور کچھ باہر تھے۔ چہرہ ہر طرح کے سنگھار سے بے نیاز اسے قدرے کمزور اور زردی مائل سالگا تھا، وہ ممکنات وہ سحر سب غائب تھا، یہ تو کوئی عام سی لڑکی تھی۔

”اچھی لگ رہی ہو۔“ وہ زہرہ کا چہرہ اور پیلا جوڑا دیکھ کر مغموم مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ”تم اتنی حسین ہو کہ کوئی تمہارے لیے قتل ہو بھی سکتا ہے، اور کر بھی سکتا ہے۔ ایسے ہی تو کل نادر شاہ نے پھانسی کی سزا نہیں سنی۔“

”اسے پھانسی ہو گئی؟“

”بھی نہیں ہوئی مگر جرم تو ثابت ہوئی چکا ہے سزا بھی جلد ہی مل جائے گی۔“

اس نے گہری سانس لی۔ ”شادی کب ہے تمہاری؟“

”دو روز بعد جمعہ کو۔ آپ آؤ گی میم صاب؟“ وہ سادگی سے پوچھ رہی تھی۔ اسے اب وہ اپنے لیے ذرہ برابر بھی خطرہ نہیں لگ رہی تھی۔

”نہیں۔ میں کل کلکتہ جا رہی ہوں وہاں سے انگلستان چلی جاؤں گی۔ تم سناؤ تم خوش ہو؟“ زہرہ کو لگا اس کی آواز آنسوؤں سے رندھی ہوئی ہے۔

”جی۔“ وہ بد وقت مسکرائی۔

”اور بدر وہ خوش ہے؟“

اس نے یونہی اثبات میں سر ہلادیا، حالانکہ وہ تو تین روز گزرے اس سے ملی بھی نہ تھی۔

”اچھا۔“ وہ پھکی سی ہنسی ہنس دی۔ ”بدر سے اب کب ملو گی۔“

”معلوم نہیں۔“ وہ جھجکی۔

”ہوں۔“ وہ خاموش ہو گئی۔

”آپ اس طرح رات کو کیوں آئی ہیں؟“ زہرہ دل میں مچلتا سوال زبان پہ لے آئی۔

”دن میں تمہارے ملازم کہاں آنے دیتے ہیں زہرہ بتول؟“ وہ غم زدہ سا مسکرائی۔ زہرہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔

”تم میرا ایک کام کرو گی؟“

”جی ہمتائیے۔“

”بدر کو میرا ایک پیغام دے دو گی؟“

زہرہ کے دل کو کچھ ہوا۔ اب جب وہ اس کا ہونے جا رہا تھا اب بھی وہ؟ مگر وہ انکار نہ کر سکی۔

”ہتائیے۔“

”تم فکر نہ کرو میں اسے تم سے چھین نہیں رہی۔ وہ تمہارا ہی ہے، تمہارا ہی رہے گا۔ بس اس سے کہنا، مایا اس کی شادی سے اگلی رات ادھر اس جہاز پہ اپنے باپ سے ملے گی۔“ اس نے ایک چٹ اس کی طرف بڑھائی جس پہ انگریزی میں دو تین الفاظ لکھے تھے۔

”اچھا۔“ زہرہ نے نا بھیجی کے عالم میں چٹ پکڑی۔

”اور اس سے کہنا، انسانوں کو بیچ نہیں کیا کرتے، ان سے محبت کیا کرتے ہیں، اگر تم لوگوں کو بیچ کر لگ جاؤ گے تو ان سے محبت نہیں کر سکو گے، بس اس کو کہنا، وہ کبھی تمہارے ساتھ وہ نہ کرے، جو میرے ساتھ کیا ہے۔“ وہ زخمی سا مسکرائی۔ ”جب کسی سے محبت کی جاتی ہے تو دل میں ایک قبرستان بھی بنایا جاتا ہے، اس میں اپنے محبوب کی تمام خامیاں دفن کر دی جاتی ہیں اور پھر ان کے کتبے نہیں لگائے جاتے۔ بس اس کو یہی کہہ دینا۔“

زہرہ کچھ سمجھ پائی اور کچھ نہیں، مگر ابھی الجھی سی سر ہلادیا۔

”اور کچھ؟“

”ہاں۔“ ایک آنسو اس کی آنکھ سے ٹوٹ کر گرا۔ ”یہ اسے دے دینا اس کی شادی کا تحفہ ہے۔“

اس نے ایک سرخ ٹمبلین پوٹلی زہرہ کے ہاتھ پہ رکھی جس کا منہ سنہری ڈوری سے بند تھا۔

”دے دوں گی اور کچھ میم صاب؟“

”نہیں زہرہ!“ اس کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔ ”میرے پاس دینے کو اور کچھ نہیں ہے۔“ اس نے جغ کی ٹوپی سر پہ ڈال لی اور پلٹ کر بھاگتی ہوئی باہر چلی گئی۔

زہرہ شش و پنج میں مبتلا کبھی برآمدے کے اس ستون کو دیکھتی اور کبھی اپنے ہاتھ میں پکڑی پوٹلی کو۔ وہ بہت ہلکی نہ تھی تو زیادہ بھاری بھی نہ تھی۔ جلنے اندر کیا تھا۔

وہ واپس آئی اور سنگھار میز کے ایک خانے میں اسے رکھ کر تالا لگا دیا۔

اس کا دل عجیب سا ہوا رہا تھا۔ ساری خوشی ہوا ہو گئی تھی۔ جانے کیوں اسے میم صاحبہ بری نہیں لگ رہی تھی۔

”میں کچھ کروا دوں میم صاب؟“

سر جھٹک کر دوسرے صندوق کو بھرے گئی۔
”آپ واپس کیوں جا رہی ہیں مایا دیوی؟ کیا
چھوٹا ملک آپ سے اس لیے تھا ہے؟“ پوچھا
ہوئے وہ پوچھ بیٹھی۔

”کاش کہ وہ اسی لیے تھا ہوتا۔ یہ صندوق گاڑی
میں رکھوا دو۔ رام ناتھ سے کوئی تیار ہو جائے میں
تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔“

وہ آئینے کے سامنے کھڑی بال بتا رہی تھی روپا نے
کچھ کر سہلادیا اور باہر چلی گئی۔

اس نے سنہری آنکھوں میں کابل ڈالا، پال
سنوارے، گردن سے چمکا نازک سا ہیروں کا ہار
درست کیا اور آئینے کے سامنے سے ہٹ کر اس بڑی
سی تصویر کے سامنے آئی۔

”شبیبہ حقیقی ہمارا راجہ بلدیو سنگھ۔“
بوڑھا ہمارا راجہ ہمیشہ کی طرح مسکرا رہا تھا۔ وہ اسے
دیکھ کر مسکرائی۔

”اے راجوں کے مہاراجہ! تمہیں لگتا تھا کہ
تمہارے اوپر ساری مصیبتیں اس پتھر کے باعث آئیں
سو تم نے اسے قبرستان میں دفن کر دیا تاکہ کبھی کوئی
اسے قبر سمجھ کر نہ کھودے، تم جانتے تھے کوئی قبرستان
کی حرمت پامال نہیں کرے گا، سو وہ منحوس مکر دنیا کا
سب سے قیمتی پتھر ہمیشہ کے لیے مٹی میں دفن رہے گا۔“
نہ کوئی اسے کھوجے گا، نہ وہ کسی کو ضرورے گا، مگر اے
راجوں کے مہاراجہ! پتھر تو پتھر ہوتے ہیں۔ وہ جسے تم مرد
کے لیے تباہی مگر عورت کے لیے خوش بختی کی
علامت سمجھتے تھے، وہ جس دن میری دسترس میں آیا،
مجھے تباہ کر گیا۔ کاش! تم نے وہ پتھر دفنانے کے بجائے تباہ
کر دیا ہوتا اور کاش! میں لالچ نہ کرتی۔“

وہ سر جھٹک کر باہر آئی اور بیڑھیاں اترنے لگی۔
نیچے روپ وئی اس کا سلمان ملازموں سے اپنی
نگرائی میں اٹھوا رہی تھی۔ وہ ٹھاکر رکھو ناتھ کے
کمرے کی طرف آئی۔

دروازہ نیم ہوا تھا، مایا نے آہستگی سے اسے دھکیلا۔
سامنے پینک یہ وہ نحیف، کمزور سا بوڑھا تھا کر لینا

اسے کپڑے صندوق میں رکھتے دیکھ کر روپا جھٹ
آئے برمی۔

”نہیں روپا! میں نے اپنے لیے یہ سارا پھیلاوا خود
ی اکٹھا کیا تھا، اسے مجھے ہی سمیٹنا ہے۔“ وہ مغصوم سا
مسکرائی۔

سامنے پینک جس کے پردے ایک طرف نفاست
سے بندھے تھے کپڑوں کا ایک ڈھیر بڑا تھا، مایا است
روپا سے ایک ایک کپڑا اٹھا کر تہہ کر کے صندوق میں
رکھ رہی تھی۔

”یہ ساڑھی بہت خوب صورت ہے میم صاب! آپ
بہت سندر لگتی ہے۔“

وہ سرخ ساڑھی اٹھا کر تہہ کرنے لگی تو روپا کہہ
اٹھی۔ ”مایا نے ایک نظر ہاتھ میں پھسلتی ریشمی سرخ
ساڑھی کو دیکھا اور دوسری نظر گردن موڑ کر دیوار پر
ٹنگی اپنی اور شیکھو کی شادی کی تصویر پر ڈالی۔“

”کاش! شیکھو نہ مرنے۔“ وہ تو ایسا ہرگز نہ چاہتی
تھی۔

”اس تصویر کو یہاں سے ہٹا دینا روپا! اور سنو یہ
ساڑھی بھی تم رکھ لو۔“

”میں؟“ روپا حیران رہ گئی۔ دعائیں ایسے بھی قبول
ہوتی ہیں کیا؟ اچھی تو وہ سوچ رہی تھی کہ ایجے سے کہہ
کر امر کمرے اپنے لیے بھی ایسی ہی ریشمی ساڑھی
منگوائے گی، چاہے اس کے لیے اسے کانوں میں پڑی
بالیاں ہی بیچ ڈالنی پڑیں۔

”ہاں، تم اسے پننا اور پن کر مجھے یاد کرنا۔ چلو کوئی
توجھے بھی یاد کرے۔“ اس نے کپڑے رکھ کر صندوق
کامنہ بند کیا۔

”اسے تالا لگا دوں گی؟“

”رہنے دو، میرے پاس کھونے کو کچھ بھی نہیں ہے۔“

”راستے میں بلی کا جنگل ہے وہاں ڈاکو روک لیتے
ہیں مایا دیوی!“

اور وہ روپا کو دیکھ کر رہ گئی۔
”کاش! کہ وہ مجھے روک لیں، روپا! پھر اسی سے

سانوں کو بچ نہیں کیا کرتے،
اگر تم لوگوں کو بچ کرنے
نہیں کر سکو گے، پس اس
تھوڑے نہ کرے، جو میرے
مسکرائی۔ ”جب کسی سے
لب قبرستان بھی بنایا جاتا
نام خامیاں دفن کر دی
س لگائے جاتے۔ پس

مگر ابھی ابھی ی

سے ٹوٹ کر گرا۔
”ہے۔“

نہرو کے ہاتھ پہ

آنسو گر رہے
”ہے۔“ اس

تی ہوئی باہر

کے اس
ٹلی کو وہ

نے اندر

نے میں

سوئی
لگ

تھا۔

وہ دھیرے دھیرے چلتی ان کے پلنگ کے قریب آئی۔

”بڑے ٹھاکر۔“

اس نے آہستہ سے پکارا تو انہوں نے آنکھیں کھولیں۔

”کون؟ گوپال؟“ وہ اٹھنے لگے تو اس نے اشارے سے انہیں روکا۔

”میں ہوں، ملایا!“

”ملایا۔۔۔؟“ وہ تڑھال سے واپس لیٹ گئے۔ ”جیسے آج تم آئی ہو، کیا کبھی وہ ایسے نہیں آئے گا۔“

”چھوڑ کر جانے والے واپس نہیں آتے بڑے ٹھاکر! میں نے سمجھوتہ کر لیا ہے، آپ بھی کر لیں۔“ وہ اواسی سے بولی۔

”انتا چھوٹا سا تھا جب وہ کہتا تھا میں اسے گھوڑا لے کر دوں۔ گھوڑے کے لیے وہ شیکھر سے لوٹا بھی تھا۔“

وہ چھت کو تکتے کہہ رہے تھے۔ ”مگر اس نے شیکھر کو نہیں مارا، وہ تمہیں قید کر کے بھی نہیں رکھنا چاہتا تھا گاؤں والے جھوٹی باتیں کہتے ہیں۔“

”میں جانتی ہوں۔“ اس نے گہری سانس لی۔

”میں آپ کو الوداع کہنے آئی تھی میں جا رہی ہوں۔“

”کاش تم نہ آتیں ملایا۔! جب تم آئیں تو شیکھر بھی مر گیا اور پھر گوپال بھی۔۔۔ میرا گوپال بھی۔۔۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے تھے۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ صحیح کہہ رہے تھے۔ شیکھر بھی اس کی وجہ سے مرا تھا، گوپال کی موت بھی اس کی وجہ سے ہی ہوئی تھی۔

وہ انہیں روٹا چھوڑ کر تیزی سے یاہر نکل آئی۔

بکھی اس کے انتظار میں کھڑی تھی۔

وہ آہستہ سے چلتی قریب آئی رام ناتھ نے بیڑھی بکھی کے ساتھ لگائی، وہ دھیرے دھیرے زنبوں پہ قدم رکھتی اوپر چڑھنے لگی۔ اس کی سفید چوٹی کے شہری پکھراج شام کی بدھم روشنی میں ماند پڑ گئے تھے۔

اس نے بکھی کا دروازہ کھولا، پردہ ہٹایا، اندر بیٹھی

ایک آخری نگاہ حویلی پہ ڈالی۔ روپا کو ہاتھ ہلایا اور پردہ گرادیا۔ رام ناتھ نے دروازہ بند کر دیا اور اپنی نشست سنبھال لی۔

روپوٹی بکھی کو دور ہوتے دیکھتی رہی اس کا ہاتھ فضا میں بلند رہ گیا تھا۔

بکھی درختوں کے بیچ گہری سڑک پہ دوڑتی جا رہی تھی۔ وہ بکھی کے جنگل کے درخت، اونچے کٹے ہوئے کہ روشنی ٹھاس کو چھو نہ پاتی تھی۔

اندھیرا ڈھنسنے لگا تھا جب بیچ سڑک پہ بکھی کا راستہ چند گھر سواروں نے روک لیا۔ رام ناتھ نے سرعت سے لگام کھینچی، گھوڑے ہنسنے اور بکھی رُک گئی۔

”تیجے اترو۔“ تین گھوڑوں سے سوار اتر کر پہل بان رام ناتھ کے سامنے آئے۔ رام ناتھ تذبذب سے ایک نظر پیچھے دیکھ کر نیچے اتر۔

”ساتھ کون ہے؟“ برہمچیت اپنی برچھی بلند کیے غرایا۔

”میم صاب ہیں، شہر جا رہے ہیں۔“ اسے پچھلا تجربہ یاد تھا سو فر فر گئے۔

”ہوں۔“ برہمچیت نے دستی بردار کو دیکھ کر آنکھ سے اشارہ کیا۔ پھر رام ناتھ کی طرف متوجہ ہوا، ”میم صاب سے بولو، اپنا زیور اتار کر ہمارے حوالے کر دے۔“

اسی بل بکھی کا دروازہ اندر سے کھلا، اس ممر میں ہاتھ نے پردہ ہٹایا اور گہرے ہوتے اندھیرے میں اس کا چہرہ دم سا نظر آیا۔

”کون ہے رام ناتھ؟“

”راہزن ہیں، مالکن! کہتے ہیں زیور اتار دیں۔“ رام ناتھ بے بس سا کھڑا تھا۔

ملایا کے لبوں پہ مغموم سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ اس نے دونوں ہاتھ گردن کے پیچھے لے جا کر اپنے ہار کا بک کھولا اور اسے گردن سے علیحدہ کر کے رام ناتھ کی طرف بڑھایا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور ہار لے لیا۔

اسی بل وہ سفید گھوڑا گاؤں کے رستے سے بھاگتا ہوا ان تک آیا جس کو ملایا کی عادت پڑ گئی تھی۔

ٹھہرے۔ رو۔ آنے والے نے چہرہ سیاہ دھلائے
میں چہرہ لکھا تھا اور انداز میں تلخی تھی۔ اس نے ایک
نظر ہل پان کے ہاتھ پہ ڈالی جس میں ہار تھا اور دوسری
نیمگیں نگاہ اپنے ساتھیوں پر۔

”ابنی مالکن کو واپس کر دو۔“ وہ سامنے دیکھ کر
خستہ جسم میں بولا تو مالکی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔
”تم مجھے کیا کیا واپس کرو گے بدرعازان؟ تمہارے
لوہ میرے بہت سے قرض ہیں بہت سی لمانتیں ہیں۔
کس کس کو لوٹاؤ گے؟“

”میں عورتوں سے سر نہیں کھاتا۔ تم جاسکتے ہو
گاڑی پان۔“ وہ گھوڑے کا رخ موڑ کر کھڑا ہو گیا۔
رام ناتھ نے تذبذب سے مایا کو دیکھا وہ استہزائیہ
مسکراہٹ سے اس کی پشت کو دیکھ رہی تھی۔
”تم میرے بہت سے قرض ہیں بدر! کاش کہ تم
ان کو چکا کھو۔“

”آپ کو جانے دے رہے ہیں یہی عنایت بہت
ہے ہماری۔ ہم جانتے ہیں۔ آپ کدھر جا رہی ہیں۔
سنا ہے ڈی سی ہمارو بھی اسلئے دے کر کب کے نکل
چکے ہیں اب آپ بھی ان کے پیچھے ہو لیجئے۔ چلو۔“ وہ
طنز بہ لہذا اپنے ساتھیوں کو اشارہ کرنا گھوڑا بھگا کر لے
گیا اور وہ تڑپ کر ہونٹ کاٹی رہ گئی۔

”چلو رام ناتھ ہم بھی چلیں۔“ اس نے تھک کر
سر نشست کی پشت سے لگا دیا۔ رام ناتھ اپنی باہری
نشست پہ آ بیٹھا۔
”سنو رام ناتھ!“

”جی مالکن!“ وہ موڈب بھی تھا اور قدرے افسردہ
بھی۔

”میری ایک بات مانو گے؟“
”کیسے مالکن!“ اس نے گھوڑوں کی لگام کو جھٹکا دیا
”بھئی ست روی سے چل پڑی۔“

”اگر میں ہندوستان میں ہی مر جاؤں تو مجھے بلی کے
اسی پرانے قبرستان میں دفنانا جہاں ایک بھوت پھرا کرتا
تھا۔ کچھ پتا چلا وہ بھوت کون تھا؟“
”سایہ تھا وہ مالکن! ہوائی چیز تھا۔ ابھی تک قبرستان

میں ہے۔“
”ہاں۔“ وہ دکھ سے ہنسی۔ ”وہ شاید قبرستان میں ہی
رہ گیا ہے۔“

”آپ ایسی باتیں نہ کریں مالکن! آپ تو دو دن بعد
ہندوستان سے جا رہی ہیں، پھر ادھر مرنے کی باتیں
کیوں کرو ہو؟“

”دو دن میں بہت سے کھٹے ہوتے ہیں رام ناتھ!
کچھ علم نہیں ہوتا کس گھڑی میں کیا بیت جائے کیا تم
میری بات مانو گے۔“

”میرے بس میں کچھ نہیں ہے مالکن! وہ
مسلمانوں کا قبرستان ہے اور آپ عیسائی ہو۔ مسلمان
ایسا نہیں کرنے دیں گے۔“

”کتنے ظالم ہو تم بلی والے، کسی کی آخری خواہش
کا احترام بھی نہیں کرتے مگر جانے دو تم بھی ٹھیک ہی
کہتے ہو۔ مجھے قبرستان کے بھانگ کے بارہ دفنا دینا۔“
اس کی آواز اتنی آہستہ تھی کہ وہ بمشکل ہی سن پارہا
تھا۔

”بکھی اب سرعت سے کچی پکی سڑک پر دوڑ رہی
تھی۔“



وہ بالکونی میں منڈیر پر ہاتھ رکھے جھکا کھڑا نیچے حویلی
کے دالان کو دیکھ رہا تھا۔ حویلی کی دیواریں منڈیریں
چھت اور نیچے درخت روشن قمقموں، قیوں اور
دلوں سے سجائے گئے تھے۔ اندھیری رات میں
روشنیاں آسمان پہ بکھرے تاروں کی مانند لگ رہی
تھیں۔

اس نے ایک لمحے کو اپنے کمرے میں جملہ عروسی
میں بیٹھی زہرہ کے بارے میں سوچا جو جانے کب سے
اس کا انتظار کر رہی تھی، پھر اسی طرح نیچے مہمانوں کی
چمل پھل کو دیکھنے لگا۔

کچھ لوگ اندر جا اور آرہے تھے، کچھ رشتہ دار بچے
بھاگتے پھر رہے تھے۔ ایسے ہی اس کے ذہن میں یادیں
بھاگتی پھر رہی تھیں۔

ڈھونڈی کی ایک ڈوبتی شام جب درختوں کے نیچے شاخیں اُدھر اُدھر ہٹاتی، پتوں پہ پاؤں رکھتی وہ سنہری بالوں والی لڑکی اس کی طرف چلی آ رہی تھی۔
”یہ شادی خاندانوں کا دستور ہوتا ہے کہ جس نے جس پہ ہاتھ رکھا وہ اسے دے دیا جاتا ہے۔“
”یہ لڑی میری تیرہویں سالگرہ پہ مجھے کوئین بدر نے دی تھی۔“

”تم ایک شہزادی کو ایک نو آبادی کے اس باغ کی قیمت گوارا ہے ہو؟“

”جھوٹ۔“ اس نے دکھ سے سر جھٹکا۔ ”سب جھوٹ سب اداکاری تھی۔ وہ ہریل، ہر وقت اداکاری کرتی رہی اور میں اس کے تھپڑ کا تماشا بن کر اسے سراہتا رہا۔ وہ تو اول روز سے ہی اداکارہ تھی میں کیوں بے وقوف بنتا رہا۔“

اسے اس سے نفرت نہیں ہوتی تھی اسے اس پہ غصہ آتا تھا۔ یا شاید زیادہ غصہ اسے اپنے بے وقوف بننے پہ تھا، یا شاید اپنے اتنے لاعلم رہنے پہ۔ پتوں اس کی انا پر پڑی تھی۔ جلنے لگا کتنی قصور وار تھی اس سب میں۔

رات ڈھلنے لگی تھی۔ نیچے کی گھاگھی ماند پڑنے لگی اور سب اپنے اپنے کمروں میں دیک کر سونے لگے، تو وہ ست روی سے چلتا اپنے کمرے کے دروازے تک آیا۔

ہولے سے اس نے دروازہ دھکیلا۔ وہ کھلتا چلا گیا۔ باہر راہداری تاریک تھی، وہ اندھیرے میں کھڑا تھا، دروازہ کھلا تو روشن کمرے سے روشنی آنے لگی۔ یہاں تک کہ پورا دروازہ کھل گیا اور وہ روشنی میں نما گیا۔

اس کا پلنگ تازہ سرخ گلاب کی لہروں سے سجایا گیا تھا۔ پلنگ کے عین وسط میں کھوٹکھٹ چہرے پہ گرائے وہ بیٹھی تھی۔ سرخ کھوٹکھٹ کے کنارے پہ سنہری تاریں لگی تھیں اور وہ خاصا نیچے تک گرا تھا، اتنا کہ اس کی گردن بمشکل دکھائی دیتی تھی۔ گھٹنوں کے گرد اس نے بازوؤں کا حلقہ بنا رکھا تھا، آستین کہنی

تک ختم ہو جاتی تھی اور آگے کلائی تک سونے کی چوڑیاں لٹکن بھرے تھے۔ ہاتھوں کی پشت پر منہری کے تیل بوئے بنے تھے۔ بدر کی نگاہ اس کے سینے پر پڑی، جھک گئی، وہاں بھی ایزدوں تک منہری کے نقش دیک رہے تھے۔

وہ بہت حسین تھی، یقیناً ”وہ دونوں ہنسی خوشی ساتھ نباہ کر لیں گے۔ اس نے دل کو تسلی دی۔ اور محبت کا کیا ہے یہ تو بعد میں بھی ہو جاتی ہے۔“

وہ دھیرے دھیرے چلتا پلنگ کے قریب گیا، ہاتھ سے پھولوں کی لڑیاں ایک طرف کیں اور اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

”کیسی ہو؟“ اس نے گھونٹکھٹ الٹا تو وہ حسین ہٹاؤ سنگھار سے آراستہ چہرہ سامنے آیا۔

”میں ٹھیک ہوں، آپ کیسے ہو؟“ وہ قدرے جھجکتے ہوئے بولی۔

”میں اچھا ہوں زہرہ؟“ اس نے اس سے زیادہ خود کو تسلی دی تھی۔ ”امید ہے تم پچھلی باتوں کو بھلا دو گی، اور ہم نئے سرے سے اپنی زندگی کا آغاز کریں گے۔“ اس کا سنائی ہاتھ اپنے گرم ہاتھوں میں لے کر وہ میکا کی آنداز میں کہہ رہا تھا۔ ”اور ہاں۔“ یاد آئے اپنے اس نے شیر والی کی جیب سے ایک ڈبیا نکالی۔

”تمہاری رونمائی کا تحفہ۔“ اور زہرہ اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیتے دیتے چوٹکی۔

”تحفہ؟“ اس کے لبوں سے پھسلا۔ ”میم صاب نے کچھ دیا تھا آپ کے لیے وہ۔“ وہ یکدم چپ ہو گئی۔ شادی کی پہلی رات اور رونمائی کا تحفہ ملنے سے بھی قبل وہ ایک دم ساری جھجک اور حیا بھلا کر پرانے انداز میں بولنے پہ قدرے شرمندہ ہوئی۔

”کیا دیا تھا؟“ وہ تیزی سے بولا۔

”معلوم نہیں۔ سرخ پوٹلی تھی، نیچے کمرے میں رکھی ہے۔ لے آؤں؟“

”ہاں جاؤ۔“ وہ بے چین سا کھڑا ہو گیا۔ زہرہ ایک لمحے کو جھجکی، پھر پلنگ سے پاؤں نیچے اتارے، جوتی کی تلاش میں اُدھر اُدھر دیکھا، پھر ایسے

”وہ مجھے مار دے گا بدر اگر اسے ہیرو نہ ملتا تو وہ مجھے مار ڈالے گا۔“ اس نے بے اختیار تھلیں سرخ پکڑے پے پڑے ہیرے کو دیکھا۔

”ماہ ملکہ۔۔۔ نیلی راجپوت کی ملکہ۔۔۔ وہ تو اس کے پاس تھی، پھر کیا کارس کو کیا دے گی؟“

”تم مجھے کیا کیا دلوں کو دے گے بدر عازان؟“ اس نے تیزی سے پوٹلی کی کمرہ پھر لگائی، اسے جیب میں ڈالا اور کاغذ اسی طرح مٹھی میں دبائے باہر کی طرف لپکا۔

”میں جلد آ جاؤں گا، فکر نہ کرنا۔“ بس ایک فقرہ اس کے لیے چھوڑ کر وہ باہر نکل گیا اور وہ پتنگ کے پائے کے ساتھ بیٹھتی چلی گئی۔

وہ مہارانی پھر سے دونوں کے درمیان آگئی تھی۔ اگر اسے علم ہو تاکہ بدر اس کا تحفہ دیکھ کر یوں دیوانہ وار کیا ہر بھاگے گا تو وہ اسے بھی وہ تحفہ نہ دیتی۔ کیوں کر دیا اس نے ایسا؟

وہ ٹھنوں پہ سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اسے معلوم تھا اب اسے بہت سے دن اور رات انتظار کرنا ہو گا اور تب بھی شاید ہمیشہ کا سکون اسے نہ ملے۔ وہ جو سمجھتی تھی کہ شادی کر کے بدر اس کا ہو جائے گا اور وہ اسے پابند لے گی، اس پہ آج اور اک ہوا تھا کہ زور زبردستی سے کسی کو اپنا کب بنایا جاسکتا ہے؟

اس کی بلند ہوتی ہچکیاں روشن کمرے میں لگی پھولوں کی بیج سے ٹکرا رہی تھیں۔

اس کو اپنی منزل مقصود کی طرف جاتی جو پہلی ٹرین ملی تھی، وہ اس میں سوار ہو گیا تھا۔

ٹھنڈا آنسو بے کاراؤ پکڑے وہ ایسے ہی گم صم سا کھڑا رہا، ہلاکت نہیں، نہ ہی بیٹھا۔ اس کا ذہن کہیں بہت دور کھویا ہوا تھا۔

”میرے بہت سے قرض ہیں تم پر۔۔۔ تم کس کس کو چکاؤ گے۔“

یہ سچے پاؤں چلتی کمرے سے باہر راہداری میں آئی۔ پوری حویلی خاموشی اور نیم تاریکی میں ڈوبی تھی۔ وہ دونوں اطراف سے سرخ کاغذ غرارہ ہاتھوں میں پکڑے وہ تیزی سے نیگے پاؤں میڑھیاں اترنے لگی۔ بار بار زپور کی چھن چھن ہوئی اور چوڑیاں ٹھکتیں۔ وہ نیچے اتر کر راہداری میں تقریباً ”دوڑتی ہوئی“ ایک ہاتھ سے غرارہ پکڑے، دوسرے سے ڈھیلا ہوتا دوشہ سنبالے اپنے کمرے میں آئی، بستر کے تکیے کے نیچے سے چابی نکالی اور تیزی سے سنگھار میز کا تالہ کھولنے لگی۔

چند ثانیے بعد وہ بدر کے روشن کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو رہی تھی۔

”یہ دیا تھا۔“ اس نے سرخ پوٹلی اس کی طرف بڑھائی جس کا تہہ سنہری ڈوری سے بندھا تھا۔

بدر نے تیزی سے پوٹلی تھامی اور سنہری ڈوری کی گرہ کھولی۔ سرخ پکڑا کھل کر، نیلی پھیل گیا۔ اس کے اوپر ایک بڑا سا سیرا جگمگا رہا تھا۔

”یہ میرا ہے؟“ زہرہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

وہ ایک ٹک ہیرے کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اتنا چمک دار تھا اور اس سے ایسی نگاہوں کو خیرہ کر دینے والی روشنی پھوٹی تھی کہ آنکھیں چند حیا جاتی تھیں۔

”یہ کب دیا تھا اس نے؟“ کچھ دیر بعد وہ بولا تو آواز کیکپاری تھی۔

”تین روز پہلے۔۔۔ چاچی نے آپ کے سامنے آنے سے منع کیا تھا تو اسی لیے دے نہیں سکی ساتھ یہ کاغذ بھی دیا تھا، وہ کہہ رہی تھیں کہ انہیں اپنے باپ سے اوھر ملنا ہے شاید کل رات۔۔۔ ملایا پرسوں رات کسی جہاز پر۔۔۔“

اس نے کھٹی میں دیا کاغذ دینا چاہا تو بدر نے جھپٹ کر وہ کاغذ پکڑا اور کھول کر پڑھا۔

اس پہ ایک جہاز کا نام اور جگہ کا پتہ لکھا تھا۔ وہ تیزی سے لرزتی انگلیوں سے کاغذ تھامے پڑھ رہا تھا۔ ذہن میں دور ایک آواز گونج رہی تھی۔

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوتلی ہیر آئل

SOHNI HAIR OIL



- ☆ گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے۔
- ☆ نئے بال اکاٹاتا ہے۔
- ☆ بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے۔
- ☆ مردوں اور بچوں کے بالوں کے لئے
- ☆ کیسا مفید۔
- ☆ ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔

سوتلی ہیر آئل قیمت = 80 روپے

- 12 بڑی بوتلوں کا مرکب ہے اور اس کی تیار کی مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ تھوڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے۔ یہ بازار میں ان کی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں۔ کراچی میں دستی خریدنا جاسکتا ہے۔ ایک بوتل کی قیمت صرف 70 روپے ہے۔ دوسرے شہروں کے لئے ڈاک بھیج کر ہنر پارسل سے منگوائیں اور ہنری سے منگوانے والے کسی آواز اس حساب سے بھیجائیں۔
- 1 بوتل کے لئے = 100 روپے
2 بوتلوں کے لئے = 180 روپے
3 بوتلوں کے لئے = 270 روپے
- نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارج شامل ہیں۔

مئی آؤر بھیجے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس 53 اورنگزیب مارکیٹ، سیکٹر فور، راولپنڈی، جسٹس روڈ، کراچی
دستی خریدنے والے حضرات کوئی ہفتہ آگے ان باتوں سے حاصل کریں
بیوٹی بکس 53 اورنگزیب مارکیٹ، سیکٹر فور، راولپنڈی، جسٹس روڈ، کراچی
مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37 اردو بازار، کراچی۔

فون نمبر 32735021

وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔
”مایا! آج مجھے ڈائمنڈ دو۔“

اس نے قریب رکھی ایک سیاہ مخملی پوٹلی اس کی ہتھیلی پر رکھی جس کا منہ سفید چمکیلی ڈور سے بندھا تھا۔
کارلس نے پوٹلی کو مضبوطی سے تھاما اور ڈوری کھولی۔

اندروہ بڑا سا ہیرا پرہا جگمگا رہا تھا۔
کارلس نے اسے اٹھایا، انگلی اور انگلیوں کے درمیان رکھ کر اوپر کیا اور غور سے دیکھا۔
”اس ٹائڈ میں یہی تھا۔“ وہ بغور کارلس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لے رہی تھی۔
کارلس نے ہیرا واپس اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔
”مجھ سے دھوکا مت کرو۔ میں قیمتی پتھروں کو دور سے پہچان جاتا ہوں۔ یہ نقلی ہے۔“
مایا کا رنگ فق ہو گیا۔

”بیابا! یہ۔۔۔۔۔“
”میں تمہارا باپ نہیں ہوں۔ مجھے ہیرا چاہیے مایا! ہیرا۔ وی ڈائمنڈ! وہ دلی دلی آواز میں غرایا۔
”مجھے ٹائڈ میں سے یہی ملا تھا“ تم دو بارہ دیکھو یہ شاید۔“

”جسٹ اسٹاپ اٹ۔“ کارلس نے سبزی برساتی کی جیب سے پستول نکالا اور اس کی ٹھنڈی ٹال مایا کی پیشانی پر رکھ دی۔
”اب بتاؤ ہیرا کہاں ہے؟“

☆☆☆

اس نے دور بحری جہازوں اور کشتیوں کی قطار کو دیکھ کر ایک نظر اپنے ہاتھ میں پکڑی پوٹلی پر ڈالی۔
سرخ مخملی پوٹلی جو خاصی ڈنڈی تھی یہ وہ اس کے دل پر پڑا بوجھ تھا اور قطار میں کھڑے آخری جہاز کی طرف بھاگا۔

وہ آخری جہاز کسی حادثے کا شکار ہو کر آواٹھوٹ چکا تھا اور عرصے سے اوھر کھڑا تھا۔ اس کا عرشہ دن میں

وہ ان ہوتا تھا اور رات میں عموماً جواری یا نشئی ادھر محفل جماتے تھے۔

وہ تیزی سے دوڑتے ہوئے جہاز کی طرف بڑھ رہا تھا۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ وہاں کیوں آیا تھا، بس وہ مایا کو کارلس سے بچانا چاہتا تھا۔ وہ اس سے نفرت کہاں کر سکتا تھا؟ اس پر اسرار سی مہارانی کو وہ بھلا بھی نہ سکتا تھا۔

وہ جہازوں کے قریب ہی تھا، جب اس نے کوئی چلنے کی آواز سنی کیے بعد دیکرے تین گولیاں چلیں۔ وہ پتھر کا ہو کر رہ گیا۔

اس کا دل بیٹھنے لگا تھا۔ وہ آوازیں اس آخری جہاز شدہ جہاز سے ہی آرہی تھیں۔

”نہیں“ وہ اسے پچالے گا، وہ اسے مرنے نہیں دے گا، وہ اسے کارلس سے پچالے گا۔“ وہ یہی سوچتا، دیوانہ وار بھاگتا گیا۔

جہاز کی سیڑھیاں خستہ حال اور ٹوٹی پھوٹی تھیں۔ وہ تیزی سے دو سیڑھیاں پھلانگتا بھاگتا ہوا راہ میں آئی رکاوٹیں عبور کرتا جس وقت عرشے پہ پہنچا اسی وقت ”ترتر تر“ کی آواز کے ساتھ بہت سے موتی اس کے قدموں سے ٹکراتے ادھر ادھر بکھر گئے۔

اس نے جھک کر دیکھا۔ وہ سفید موتی خون میں لتھڑے سرخ پڑ گئے تھے اور ادھر ادھر بکھرتے سرخ لکیریں بناتے جا رہے تھے۔ اسی پل کسی ورنی شے کے پانی میں گرنے کی آواز آئی۔

وہ بے اختیار آگے بڑھا۔

سامنے خون کا ایک تالاب پڑا تھا، اور خون کے نشانات تھے جیسے کسی لاش کو ٹھیسٹ کر ابھی پانی میں پھینکا گیا ہو۔

”لاش؟ مایا۔۔۔“ اس کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجی۔

وہ دوڑ کر عرشے کی دوسری طرف آیا اور اسی پل اسے لگا، کسی نے سمندر میں چھلانگ لگائی ہے۔ سبز

برساتی اور بڑے سے ہیٹ کی ایک ہلکی سی جھلک دیکھ سکا تھا، اور اس سے پہلے کہ وہ آگے بڑھ کر جھک کر پانی کو دیکھ پاتا، پانی میں ڈبکی لینے کی آواز آئی اور سکوت چھا گیا۔

وہ دھیرے دھیرے شکست خوردہ قدموں سے چن واپس خون کے تالاب اور موتیوں تک آیا۔ موتی ابھی تک ادھر ادھر بکھر رہے تھے۔

وہ تھکا ماندہ ادھر گر سا گیا۔ خون اس کے ہاتھوں اور کپڑوں پہ لگ گیا مگر وہ ادھر ادھر دوڑتے موتیوں کو پکڑنے کی سعی کرنے لگا۔ پھر تھک کر سر گھٹنوں پر رکھ دیا۔

”کبھی جو تم اس لڑی کو ٹوٹ کر بکھرتے دیکھو تو جان لیتا کہ یا تو مایا نے ولی بار دیا۔ یا جان ہار دی۔“ وہ ٹھیک کہتی تھی۔

نبلی راجپوتوں کی ملکہ نے جان ہار دی تھی۔ اس نے جیب سے سرخ پونلی نکالی اور کھولے بغیر اسے پوری قوت سے دو پانی میں پھینک دیا۔

پونلی نے غوطہ کھایا اور پھر سمندر کے تاریک پانی میں گم ہو گئی۔ فساد کی وہ جڑ ہمیشہ کے لیے ڈوب چکی تھی۔

وہ ہمیشہ اسے کچھ دے کر جاتی تھی، اب کی بار وہ جاتے جاتے اسے زندگی بھر کا ایک نہ ختم ہونے والا غم دے گئی تھی۔

ایک ایسا پچھتاوا جس سے وہ کبھی جان نہ چھڑ پائے گا۔ کہ وہ ساری زندگی سوچتا رہے گا کاش کہ وہ اسے بچا پاتا۔



بحری جہاز گھنٹہ بھر ہوئے ٹرک چکا تھا۔ مسافر اپنا سامان اٹھائے اپنے بچوں کو سنبھالتے شور کے باعث ایک دوسرے سے بلند آواز میں بات کرتے سمندر کی حدود سے باہر آ رہے تھے۔

بہت سے مسافروں کے درمیان ایک مسافر نے

بہت جھٹکے انداز میں اپنا بیگ زمین پر رکھا تھا۔
اس نے سبز برساتی پہن رکھی تھی اور سر پہ بڑا سا ہیٹ
تھا۔

وہیں سمندر کے کنارے اپنے بیگ کے ساتھ ہی
بیٹھ کر اس نے سر نیچے جھکا لیا اور تھکاوٹ سے کپٹیوں
کو انگلیوں سے دبایا۔ ہندوستان سے انگلستان تک کا
جہاز سفر خاصا تھکا دینے والا تھا۔

لوگوں کی چل چل جاری تھی، گہما گہمی اپنے عروج
تھی۔ اس نے چند لمبے خاموشی سے گردن اڑھ اڑھ
گھما کر دیکھا، پھر اپنے سر پہ رکھا وہ بڑا سا پلاس کے
بگوں سے کاہنا ہیٹ اتارا، اسے زور سے سمندر کے
پانی پہ اچھال دیا اور لمبے سنہری بال برساتی کے اندر سے
نکل کر اور ان میں ہاتھ پھیرتے ہوئے خود کو پُر سکون
کرنے لگی۔

دفعۃً اس کی انگلیوں کو بال بال خالی لگے، تو اس
نے بالوں کی اس لٹ کو چھوا جو بھی موتیوں سے بہت
دلی ہوئی تھی۔

اب وہ لٹ خالی تھی۔

ایک اواس مسکراہٹ اس کے لبوں پہ بکھر گئی۔

اسے یاد تھا اس نے ایک دفعہ بدر سے کہا تھا۔

”اگر جو کبھی تم اس لڑی کو ٹوٹ کر بکھرتے دیکھو تو
جان لیتا کہ یا تو مایا نے دل بار دیا، یا جان بار دی اور اگر
مجھے بھی کچھ ایسا مل گیا جو خوش قسمتی کے ہمارے ہمیشہ
میرے سر پہ سایہ کیے رکھ سکے تو میں اسے خود ہی توڑ
دوں گی۔“

اور جب اس رات اس نے اپنے سوتیلے باپ کو
لے کر دفاع میں مارا تھا، جو نہ صرف اس کی ماں پر ظلم کا
مرتب اور اس کی محرومیوں کا ذمہ دار تھا بلکہ شیکھو
کا قاتل بھی تھا، تو اس کی لاش کو اس برساتی اور ہیٹ
سے ہلکی کر کے سمندر میں دھکیلنے کے بعد اس نے خود
یہ وہ لڑی توڑ دی تھی کہ اس کے پاس خوش قسمتی کے
ہمارے سر پہ برقرار رکھنے کے لیے کچھ اور بہت قیمتی
اور خاص موجود تھا۔

سے ہیٹ کی ایک ہلکی سی جھلک وہ
سے پہلے کہ وہ آگے بڑھ کر جھک کر
اڑھکی لینے کی آواز آئی اور سکوت

جھلست خورہ قدموں سے چلتا
رموتیوں تک آیا۔
پھر بکھر رہے تھے۔

بال خون اس کے ہاتھوں اور
پھر اڑھوڑوڑتے موتیوں کو
مر جھک کر سر گھٹنوں پہ رکھ

ٹ کر بکھرتے دیکھو تو جان
ان بار دی۔“

نا بار دی تھی۔

بال نکلی اور کھولے بغیر
بھیٹ نک دیا۔

ندر کے تاریک پانی
کے لیے ڈوب چکی

تھی، اب کی بار وہ
ختم ہونے والا غم

ان نہ چھڑا پائے
ش کہ وہ اسے

مسافر اپنا
کے باعث
ت کرتے

سافر نے

مایا نے برساتی کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا اور وہ
ٹاٹ کی پوٹلی نکالی جسے ریوڑ کا کپاڑا تھا کیا تھا۔
اس نے ریوڑ اتارا اور پوٹلی کھولی۔

اندر وہ بڑا سا ہیرا جگمگا رہا تھا، مگر اس کی جگمگاہٹ
اس کے ان پوٹلی Replicas کی طرح شمع اور
بے حد تیز نہیں تھی، جو اس نے بدر اور کارلس کو دیے تھے
جو بہت پہلے سے اس نے تیار کر کے رکھے تھے۔ بلکہ
”ماہ ملکہ“ کی چمک بہت ٹھنڈی بہت بلاو قار تھی۔

اس نے مسکرا کر ہیرے کو دیکھا، اس ہیرے کے
لیے اس نے بہت سے ٹھیل کھیلے تھے، مگر جس کے
ساتھ ٹھیل نہیں کھیلنا تھا، جب اس نے دھکارا تو اس
رات اپنی بالکونی میں روئے ہوئے اس نے غم کیا تھا
کہ بھلے وہ جس سے اس نے واقفیت، محبت کی تھی،
اسے نہ اپنائے، مگر وہ اسے زندگی بھر کا وہ دکھ ضرور دے
کر جائے گی، جو اس نے اسے دیا تھا اور اسے علم تھا کہ
اس نے عرصے پہ بیٹھ کر وہ موتی ضرور پتے ہوں گے۔

”اے بلی کے نیزہ باز لڑکے!“ اس نے کرب سے
مسکرا کر ہیرے کو دیکھا اور واپس احتیاط سے جیب میں
رکھ لیا۔ ”اسے اپنی ساری کہانی سنائی تھی اور وہ سرخ
پوٹلی اس تک بھیجنے سے پہلے بھی بہت دفعہ اسے بتایا
تھا، بار بار بتایا تھا، مگر پھر بھی وہ سمجھ نہ سکا اور وہ پتھر دیکھتے
ہی بھول گیا کہ میں لندن کے تھپڑ کی سب سے
کامیاب اداکار ہوں۔“

وہ آہستہ سے اٹھی اور اپنا بیگ اٹھائے ایک طرف
کو چل دی۔

اس دن کے بعد سے کسی نے اسے لندن کے تھپڑ میں
نہیں دیکھا۔



